ہمارے کنور صاحب

مرتبہ: کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی

ہمارے کنور صاحب

مرتبہ: کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی

ایشیا کے مایہ ناز ادیب اور طنز و مزاح
کے بادشاہ محترم فکر تونسوی صاحب
کی خدمت میں احترام کے ساتھ

نیازمند

کرشن لال نارنگ ساقی
10 جنوری سنہ 1987
نئی دہلی

ھمارے کنور صاحب

مرتّبہ:

کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی

سنہ اشاعت: ۱۹۸۶ء

قیمت: ۵۰/= روپے

مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی

ناشر: جشن کنور مہندر سنگھ بیدی کمیٹی۔ ایل۔۴۰ کناٹ سرکس نئی دہلی

تعداد: بار اول ۱۰۰۰

کتابت: ساجد

تقسیم کار

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

دفتر شانِ ہند، انصاری مارکیٹ، نئی دہلی

فہرست

تعارف

شاعر نے کہا تھا:

وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہے

یہ قول کنور مہندر سنگھ بیدی سے زیادہ کسی اور پر صادق نہیں آتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی بدولت صرف دِلّی ہی میں نہیں، بلکہ ملک کے کئی دوسرے حصّوں میں بھی متعدّد علمی اور ادبی اور ثقافتی تنظیموں کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ کنور صاحب سرکاری ملازم تھے۔ ان کی ملازمت کا زمانہ، مختلف حیثیتوں میں، پنجاب، ہریانہ اور دِلّی میں گزرا۔ وہ جہاں بھی رہے، ان کے زمانۂ قیام میں اس علاقے کے علم دوست حضرات اور ثقافتی گروہ ان کے گرد جمع ہو گئے، اور مشاعروں اور میلوں اور دنگلوں اور دوسری عوامی دلچسپیوں کا دَور شروع ہو گیا۔ انسان کا جسم اپنی نشوونما کے لیے خوراک اور اچھی آب و ہوا کا طلبگار ہے۔ لیکن اس کی معنوی اور روحانی ضروریات محض اکل و شرب تک محدود نہیں اُن کی تسکین کے لیے ان وسائل کے مہیّا کرنے کی ضرورت ہے جن سے وہ اپنا خالی وقت اطمینان سے بسر کر سکے۔ یہ دوسری ضرورت کنور صاحب موصوف کی مساعی سے پوری ہوئی۔

ظاہر ہے کہ گذشتہ پچاس ساٹھ برس کے طویل عرصے میں موصوف کا ہزارہا آدمیوں سے تعلّق رہا۔ ان کے مداحوں اور دوستوں کی کثیر تعداد نے فیصلہ کیا کہ ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کی ڈائمنڈ جوبلی شایانِ شان طریقے پر منائی جائے۔ یہ مجموعۂ مضامین اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں ان کے چند احباب کے تاثّرات جمع کیے جا رہے ہیں۔ ان کے مرتّب جناب کرشن لال نارنگ ساقی ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ کام بطریقۂ احسن انجام دیا ہے۔ کنور صاحب کی شخصیت ہشت پہلو ہے، اور انھوں نے ہر پہلو سے ہماری ثقافت میں اضافہ کیا ہے۔ لہٰذا کسی ایک کتاب میں ان کی خدمات کا احاطہ کر لینا بہت مشکل ہے۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

اگر یہ صحیح ہے کہ "قسامِ ازل" نے ہر ایک شخص کو اس کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق کام تفویض کیا، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کنور صاحب موصوف کو دنیا میں خوشیاں بکھیرنے اور تقسیم کرنے کا کام تفویض ہوا تھا۔ جس انشراحِ صدر اور مستعدی سے وہ اپنے دوست احباب اور ضرورت مندوں کے کام کرتے رہتے ہیں، اس پر رشک آتا ہے کہ ان کے چشمۂ فیض سے کوئی محروم نہیں جاتا۔ ہر ایک اس سے اپنے ظرف کے مطابق فیضیاب ہو کر لوٹتا ہے۔

ان کے احباب اور نیازمندوں کی یہ دلی دعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر انھیں تادیر زندہ و سلامت رکھے کہ وہ اسی طرح بنی نوعِ انسان کی خدمت کرتے رہیں۔

آمین ثمّ آمین!

مالک رام

نئی دِلّی

۸ر دسمبر ۱۹۸۶ء

عرضِ حال

کچھ لوگ بڑے گھر میں پیدا ہوتے ہیں کچھ اپنی کوشش اور کاوش سے بڑے بنتے ہیں اور کچھ کو لوگ بہ وجوہ بڑا بنا دیتے ہیں ۔ کنور صاحب بڑے گھر میں پیدا ہوئے مگر اپنی ذاتی صلاحیتوں سے بڑے آدمی بنے ۔ لوگوں نے انھیں بڑا آدمی نہیں بنایا بلکہ ان کے بڑا ہونے کا ہمیشہ اعتراف کیا یہ اعتراف ان مضامین اور نظموں میں آپ کو صاف نظر آئے گا ۔ جو اس کتاب میں پیش کئے جا رہے ہیں ۔

کسی ایسے شخص کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا جسے آپ بخوبی جانتے ہیں بہت مشکل ہوتا ہے ۔ ایک اس لئے کہ آپ اس سے واقف ہیں اور وہ آپ سے ان کی خوشنودیٔ مزاج کی وجہ سے آپ کوئی ایسی بات نہیں لکھنا یا کہنا چاہیں گے جو ان کے ذہن پر بار گزرے اور دوسرے اس لئے بھی آپ کو یہ احساس بنا رہے گا کہ اس تحریر کے بعد آپ کو ان سے بار بار ملنا بھی ہوگا اور اس وقت آپ کو کچھ ندامت کا احساس ہو سکتا ہے ۔ ایسے موقع پر ایک سخت مسئلہ یہ بھی ہے کہ آپ جذبات میں بہہ کر متعلقہ شخص میں خوبیاں ہی خوبیاں تلاش کرنے لگتے ہیں اور اس کی کمزوری کو قطعاً مدنظر نہیں رکھتے ۔ لیکن ہمیشہ کوئی شخص کسی کی مدلل مدح سرائی نہیں کرتا ۔ آج کے جمہوریت کے دور میں

ہر شخص حق گوئی کا دم بھرتا ہے لیکن ایسی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں جب کہ جان و مال کا خوف کئے بغیر بادشاہت کے دور میں لوگوں نے صاف گوئی سے کام لیا ہے ان مضامین میں اگر آپ کو جگہ جگہ پر یہ احساس پیدا ہو کہ مضامین میں کنور صاحب کی مدح سرائی کی گئی ہے تو اسے تنقید کی اس گہری نظر سے دیکھیں جس سے آپ کو یہ اندازہ ہو سکے گا کہ محض حقیقت بیان کی گئی ہے یا محض ان کی مدح سرائی کی گئی ہے۔

"ہمارے کنور صاحب" میں کنور مہندر سنگھ بیدی کی ایک قلبی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے مختلف حضرات نے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کسی نے محض سوانحی خاکہ پیش کیا ہے تو کسی نے ان کی انتظامی صلاحیت کو پیش کیا ہے کسی نے ان کی شعر و شاعری پر تبصرہ کیا ہے تو کسی نے محاورات کے برمحل استعمال پر روشنی ڈالی ہے کسی نے ان کی نثر نگاری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے تو کسی نے ان کے مشاغل بیان کئے ہیں کسی نے کنور صاحب کو مشاعروں میں دیکھنا چاہا ہے تو کسی نے سیر و شکار میں۔

کنور صاحب کی ڈائمنڈ جوبلی جشن کے موقع پر ہم یہ حقیر تحفہ ان کی خدمت میں ان کے بے شمار چاہنے والوں کی طرف سے پیش کر رہے ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں بلکہ برصغیر میں ہر جگہ ان کے دوست اور مدح موجود ہیں۔ ہمارے لئے بہت سخت مسئلہ تھا کہ ہم کس کا مضمون شامل کریں اور کس سے معذرت کریں۔ دراصل ہر مضمون اپنی جگہ نہایت اہم اور ضروری تھا۔ مگر ہماری مجبوریاں مانع رہیں اور ہم کچھ مضامین اپنی خواہش کے باوجود اس میں شامل نہ کر سکے۔ کتاب کی ضخامت غیر معمولی طور پر زیادہ ہو رہی تھی۔ ہم ایسے چاہنے والوں سے معذرت خواہ ہیں۔ اور ہم ان کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہمیں ان کے جذبات اور احساسات کا پورا احترام ہے جن حضرات کے مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں ہم ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیں گے۔

کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی

کرنل بشیر حسین زیدی

کنور مہندر سنگھ بیدی
ایک تاثر

کچھ لوگ اپنی ذات سے ایک انجمن ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں ہمارے دوست کنور مہندر سنگھ بیدی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ خوش پوش، خوش بیان، خوش انداز اور خوش فکر۔ سحرؔ صاحب جس محفل میں ہوتے ہیں اپنی انھیں خصوصیات کی بنا پر سب کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ دہلی کی تہذیبی زندگی کی جان ہیں، وہ شاعر بھی ہیں اور شاعر گر بھی۔ وہ اپنی شاعر نوازی اور ادب نوازی کے لئے مشہور ہیں۔ ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان ہونے والے مشاعروں میں سحر صاحب شاعر کی حیثیت سے تو شریک ہوتے ہی ہیں مگر آپ مشاعروں کی نظامت کے لئے بھی مشہور رہیں۔ اپنے دلچسپ چٹکلوں، اور مزے دار فقروں اور شعروں سے مشاعروں کا لطف دوبالا کر دیتے ہیں۔

بیدی صاحب کا کلام ان کی طرح بے بناوٹ، اور تصنع سے پاک ہے۔ اس پر یہ بات صادق آتی ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے دل پر اثر کرتی ہے۔ اس میں زلف و رخسار کے بیان کے ساتھ ساتھ دوسرے حقائق زندگی پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے، خاص طور سے قومی یکجہتی کو کنور صاحب نے اکثر

اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ آپ کو اردو زبان سے گہرا لگاؤ ہے۔ وہ اس کی بقاء اور ترویج کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔

ہندوستانی سیکولر روایات کو قائم رکھنے کے لئے اب کم ہی لوگ رہ گئے ہیں لیکن جو لوگ ہیں ان میں کنور صاحب کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان کے ان خیالات کا عکس ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے اور ان کی شخصیت میں بھی۔

کنور صاحب کو دیکھ کر اور ان سے مل کر ان کے بارے میں یہ مصرعہ زبان پر آتا ہے کہ

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی، پریذیڈنٹ جناب گیانی ذیل سنگھ، کرنل بشیر حسین زیدی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور محترمہ تبسم گرور کے ساتھ

کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی، حاجی انیس دہلوی، مالک رام اور ساحر ہوشیار پوری کے ساتھ
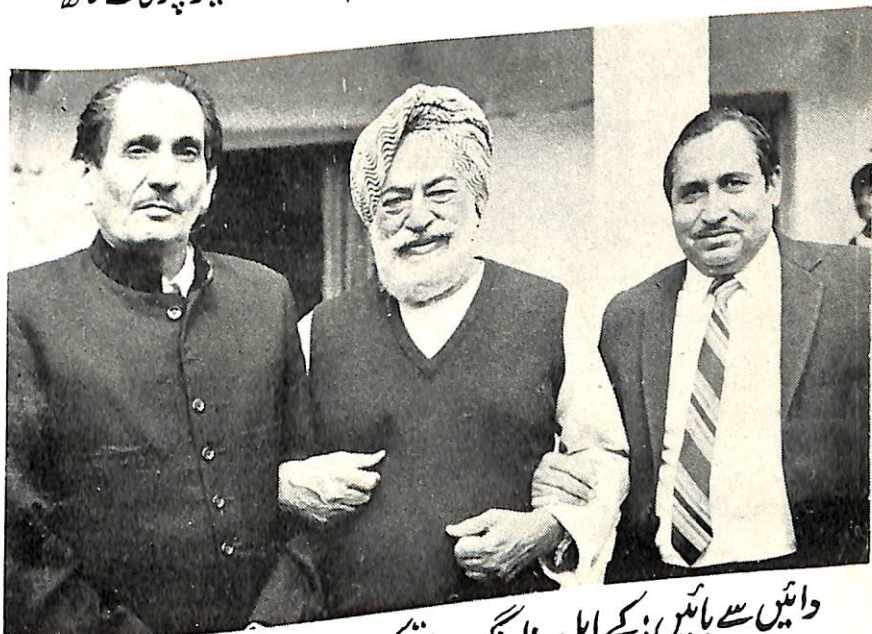
دائیں سے بائیں: کے ایل۔ نارنگ ساقی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور سید شریف الحسن نقوی۔

مالک رام

توقیت

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

۱۴۶۹ — ۱۵۳۹ء حضرت باباگورو نانک دیو رح بانیِ سکھ دھرم

[کنور مہندر سنگھ بیدی کا سلسلۂ نسب براہ راست حضرت باباصاحب رح سے ملتا ہے۔ دونوں کے درمیان سولہ پشتیں ہیں۔]

۱۸-ویں — ۱۹-ویں صدی "راجا جوگی" باباصاحب سنگھ بیدی

باباصاحب سنگھ بیدی، حضرت باباگورو نانک دیو سے دسویں پشت میں ہوئے۔ ان کا تاریخی کارنامہ یہ ہے، جس سے ان کے اثر و رسوخ کا پتا چلتا ہے کہ جب انیسویں صدی کے آغاز میں سکھوں کی بارہ مِسلوں میں اختلافات اس حد کو پہنچ گئے کہ آئے دن آپس میں لڑائی جھگڑا رہنے لگا، تو تمام مِسلوں کے سرداروں نے "راجہ جوگی" کو متفقہ طور پر اپنا ثالث تسلیم کر لیا کہ وہ جو فیصلہ کر دیں، انھیں منظور ہوگا۔ یہ اپریل ۱۸۰۱ء کا واقعہ ہے۔ "راجہ جوگی" نے سب کے بیان سن کر فیصلہ کیا کہ "سکرچکیہ" مِسل کے ۲۲ سالہ نوجوان رنجیت سنگھ سب سے قابل اور ہونہار ہیں۔ میں انھیں تمام مِسلوں پر حکمران منتخب کرتا ہوں۔

چنانچہ سب نے اس فیصلے پر سرِ تسلیم خم کیا اور یوں ۱۲ اپریل ۱۸۰۱ء کو مہاراجا رنجیت سنگھ کو تمام سکھ پنتھ کے واحد لیڈر کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے ۱۸۳۹ء میں وفات پائی۔

ف ۱۹۰۵ء — سر باباکھیم سنگھ بیدی

"راجہ جوگی" بابا صاحب سنگھ بیدی کی تیسری پشت میں سر باباکھیم سنگھ بیدی ہوئے۔ یہ ہمارے کنور مہندر سنگھ بیدی کے دادا تھے۔ یہ انگریز کا زمانہ تھا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کی وفات (۱۸۳۹ء) کے بعد انگریز پنجاب پر قابض ہوگئے (۱۸۴۹ء)۔

باباکھیم سنگھ دینی اور دنیوی ——— دونوں لحاظ سے اپنے عہد کی بہت نمایاں شخصیت تھے۔ پنجاب اور سرحدی علاقے کے ہندو اور مسلمان یکساں ان کے ارادتمند اور حلقہ بگوش تھے۔ وہ اپنے تمام اہم اختلافات میں انھیں ثالث مقرر کرتے اور ان کے فیصلے کو بطیبِ خاطر تسلیم کر لیتے۔

۱۸۸۲ء - ۱۹۸۵ء — بابا ہردت سنگھ بیدی

سر باباکھیم سنگھ بیدی کے چھ بیٹے تھے۔ ان میں بابا ہردت سنگھ بیدی سب سے چھوٹے تھے۔ یہی ہمارے کنور مہندر سنگھ بیدی کے والدِ بزرگوار تھے۔ ان کا ابھی پچھلے دنوں چندی گڑھ میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو انتقال ہوا

۹ مارچ ۱۹۰۹ء — کنور مہندر سنگھ بیدی کی ولادت "منٹگمری" میں

بابا ہردت سنگھ بیدی مرحوم کے چار بیٹے ہوئے:

۱۔ ٹِکا جگجیت سنگھ بیدی۔ بار ایٹ لا سابق جج پنجاب ہائی کورٹ۔ آج کل دلّی میں مقیم ہیں۔

۲۔ کنور مہندر سنگھ بیدی۔ ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس

۳۔ کنور راجندر سنگھ بیدی، سابق ممبر لیجسلیٹو اسمبلی پنجاب۔ آج کل فاضلکا میں مقیم ہیں، جہاں وہ خاندان کی زرعی جائداد کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

۴ کنور سریندر سنگھ بیدی۔ آئی، اے، ایس (ریٹائرڈ) آج کل دلّی میں مقیم ہیں؛ اور کنور مہندر سنگھ بیدی کے فلم سازی کے کاروبار میں ان کے شریک۔

۱۹۱۴ - ۱۹۱۹ء گورنمنٹ ہائی اسکول، منٹگمری میں، پرائمری کے درجوں تک تعلیم (اب منٹگمری پاکستان میں ہے اور اس کا نام بدل کر ساہیوال رکھ دیا گیا ہے۔)

یہ علاقہ پہلے بھی ساہیوال کہلاتا تھا۔ یہاں بیدی صاحب کے خاندان کی وسیع جاگیر تھی۔ اسی لیۓ ان کے والد (باباہردت سنگھ بیدی مرحوم) وہاں مقیم تھے (اسی باعث ان کی ابتدائی تعلیم منٹگمری میں ہوئی)

۱۹۱۹ - ۱۹۲۵ء چیفس کالج، لاہور۔ ۱۹۲۵ء میں یہاں سے سینئر کیمبرج کا ڈپلوما حاصل کیا۔

۱۹۱۹ء میں ان کے بڑے بھائی اپنی ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد چیفس کالج، لاہور میں داخلے کے لیے گئے۔ والد ساتھ تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی بھی تفریحاً ساتھ چلے گئے۔ ٹکا جگجیت سنگھ بیدی کا داخلہ ہو گیا۔ جب یہ لوگ واپس آنے لگے، تو ٹکا صاحب نے کہا کہ یہاں اکیلے میں میرا دل نہیں لگے گا، ہو سکے تو کنور مہندر سنگھ کو بھی یہاں داخلہ دلوا دیجیۓ، اس طرح دونوں بھائی ایک ساتھ رہ سکیں گے۔ چنانچہ پرنسپل صاحب سے یہ غلط بیانی کی گئی کہ کنور مہندر سنگھ کی عمر دس برس کی ہے کیونکہ اس سے کم عمر کے لڑکے کو

چیفس کالج میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں ڈپلوما لے کر یہ چیفس کالج سے نکلے۔ یہ ڈپلوما دسویں کے برابر تصور ہوتا تھا۔ اس سال کامیاب ہونے والے طلبہ میں یہ اول نمبر پر آئے تھے۔

۱۹۲۵ - ۱۹۲۹ء گورنمنٹ کالج لاہور۔

یہاں سے بی۔ اے کی سند لی۔ ان کے مضمون تاریخ اور فارسی تھے۔

جنوری ۱۹۳۳ء شریمتی سوہندر کور سے شادی

شریمتی سوہندر کور سردار بہادر بلونت سنگھ نلوہ کی صاحبزادی ہیں جو مہاراجا رنجیت سنگھ کے مشہور جرنیل ہری سنگھ نلوہ کے نام لیوا ہیں۔ وہ اس زمانے میں موگا (ضلع فیروز پور) میں ایس۔ ڈی۔ ایم تھے۔

جولائی ۱۹۳۴ء حکومت کی ملازمت میں داخلہ۔ E.A.C کے عہدے پر لائل پور (حال فیصل آباد۔ پاکستان) میں تعیناتی۔

(وہ دو برس آئی سی ایس کے امتحانِ مقابلہ میں شامل ہوئے لیکن ناکام رہے)

(اس کے بعد ان کے والد بابا ہردت سنگھ بیدی مرحوم نے پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ سر سکندر حیات خاں سے درخواست کی کہ کنور مہندر سنگھ کو حکومت میں لے لیا جائے۔ انھوں نے اسے بخوشی قبول کر لیا اور صوبجاتی ملازم (P.C.S) میں نامزد کر کے لائل پور کا E.A.C. مقرر کر دیا)

۲۷ جنوری ۱۹۳۵ء بیٹی بھوپندر کور کی پیدائش

۱۹۳۵ء مجسٹریٹ درجہ اول، روہتک

(لائل پور میں یہ صرف جولائی ۱۹۳۴ء سے دسمبر ۱۹۳۵ء تک رہے تھے)

۱۵ جنوری ۱۹۳۷ء بڑے بیٹے کرم جیت سنگھ بیدی کی پیدائش

مارچ ۱۹۳۷ء	تبادلہ اور بحیثیت چھاؤنی مجسٹریٹ جالندھر میں تقرری
مئی ۱۹۳۸ء	مجسٹریٹ، ملتان
آخر ۱۹۳۸ء	افسرِ مال، کانگڑہ
۷ اپریل ۱۹۳۹ء	دوسرے بیٹے ویرندر سنگھ بیدی کی پیدائش
جولائی ۱۹۴۰ء	افسرِ مال، جہلم
جون ۱۹۴۱ء	افسرِ مال، روہتک
۱۸ جون ۱۹۴۲ء	انچارج، نیشنل وار فرنٹ، دِلّی

(یہ دوسری جنگ (۱۹۳۹ - ۱۹۴۵ء) کا زمانہ تھا۔ ابتدا کے تین برسوں میں جرمنی کا پلّہ بھاری رہا اور انگلستان اور ان کے حلیفوں کو ہر لحاظ پر شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ بیدی صاحب کے محکمہ کا فرض تھا کہ لوگوں کے دل میں انگریزوں کے حق میں ہمدردانہ خیالات پیدا کرے جس سے وہ بڑی تعداد میں فوج میں بھرتی ہوں، اور بڑھ چڑھ کر جنگی چندہ دیں)

۱۹۴۷ء	ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، (A.D.M) کانگڑہ
۱۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء	سٹی مجسٹریٹ، دِلّی

(ہندوستان کا پہلا جشن جمہوریہ کا مشاعرہ انہیں کے زمانہ ملازمت میں منایا گیا۔ یہ تقریب لال قلعہ میں منعقد ہوئی۔ مشاعرہ میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو خود بنفس نفیس آخر تک رونق افروز ہوئے۔ اس پیمانے اور اس شان و شوکت سے یہ تقریب پھر نہیں منائی گئی۔)

جولائی ۱۹۵۲ء	سب ڈویژنل مجسٹریٹ، سونی پت۔
	میلہ ایڈمنسٹریٹر، کوروکیشتر
۱۹۵۵ء	ڈپٹی کمشنر، گوڑ گانوں
۱۹۵۷ء	ڈپٹی ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ و سیاحت، پنجاب، چندی گڑھ

جنوری	۱۹۵۹ء	ڈپٹی کمشنر، سنگرور
جون	۱۹۶۳ء	ڈپٹی کمشنر، کرنال
	۱۹۶۴ء	ڈائرکٹر پنچایت پنجاب، چنڈی گڑھ
	۱۹۶۷ء	سرکاری ملازمت سے سبکدوش

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے دلی میں مستقل رہائش اختیار کرلی ہے آج کل گریٹر کیلاش I کی کوٹھی ۷-۷۵ میں قیام ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب صحیح معنوں میں اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ وہ جہاں بھی رہے، ان کے گرد مختلف علمی، ادبی، ثقافتی امور میں دلچسپی رکھنے والے اشخاص جمع ہوگئے اور یوں ایک ادارہ قائم ہوگیا۔ وہ اب بھی کشتی، مُکّا زنی (باکسنگ) شطرنج، پتنگ بازی، انسان برادری وغیرہ کئی انجمنوں کے روح و رواں اور صدر رہیں۔ دلی کے متعدد ادبی اور علمی اداروں سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ٹرسٹی اور نائب صدر ہیں۔ غالب اکادمی کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن ہیں۔ حکومتِ ہند کے قائم کردہ ترقی اردو بورڈ کے نائب صدر رہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی اور محبت کے رشتے قائم کرنے کے لیے جو انجمن "پریم سبھا" بنائی گئی ہے، وہ اس کے بانی ہیں۔ غرض، ان کی شخصیت ہشت پہلو ہے۔ ان کی عمر ۸۰ برس کی ہے لیکن اب بھی وہ جوانوں، بلکہ نوجوانوں کی طرح چاق و چوبند اور چست ہیں، اور ہر ایک تقریب میں جوش اور جذبے سے حصہ لینے پر ہمیشہ تیار۔

ان کا خاندانی پسِ منظر جیسا شاندار ہے، اس کی طرف کچھ مختصر

سا اشارہ اوپر کر چکا ہوں۔ ملازمت کے دوران میں وہ معزز عہدوں پر سرفراز رہے اور یوں اُن کے ملک کے عمائد اور اکابر سے تعلقات استوار ہو گئے۔ اس سے ان کی تعلقاتِ عامہ میں فعّال اور کامیاب بننے کی اہلیت اور صلاحیت المضاعف ہو گئی۔ ان کے پاس کوئی شخص مدد یا سفارش کے لیے پہنچ جائے۔ اگر انہیں یقین ہو جائے کہ وہ حق پر ہے یا مظلوم ہے، تو جھٹ اس کی مدد کو تیار ہو جائیں گے۔ پھر دامے، درمے، قدمے، جو کچھ بھی ان سے بن آئے گا، اس سے دریغ نہیں کریں گے۔ جن اصحاب کو ان سے واسطہ پڑا ہے، وہ میری تائید کریں گے۔ اس کل یگ میں کہاں ہیں ایسے لوگ! اللّٰھمّ کثّر امثالہٗ فینا۔

رام لعل

ایک بلا عنوان شخص

کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں کنور صاحب سے ملنے کے لئے اُن کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں چاہتا تو اُنہیں فون کر کے بھی وہ کام کرا سکتا تھا اتنا تو مجھے کنور صاحب کے خلوص پر اور اس سے کہیں زیادہ اپنے اُوپر بھی اعتماد تھا۔ یہ وہی اعتماد ہے جو ایک ادیب کو دوسرے ادیب پر عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ ادیب کا رشتہ ایسا ہی بے تکلّف واقع ہوا ہے۔ ادبی دنیا میں ایک دوسرے کو غائبانہ طور پر ہی جاننا کافی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ ہر ادیب ہمیشہ دوسرے ادیب کے کام نہیں آپاتا۔ کبھی کسی مجبوری کی بنا پر اور کبھی کبھی اپنی روائتی کاہلی یا لاپروائی کی وجہ سے پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا ادب انسان دوستی کے ہی رشتے کو اوّلیت دیتا ہے۔

کنور صاحب سے میں ذاتی طور پر اس لئے مل لینا چاہتا تھا کہ اس سے پہلے ان سے کبھی ملا نہیں تھا اور سن رکھا تھا کہ وہ کسی کی بھی مدد کرنے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔ اگر کسی کے لئے پھانسی کا حکم بھی صادر ہو چکا ہو اور اس کا کوئی وارث رحم کی درخواست لے کر بجائے راشٹرپتی کے پاس جانے کے کنور صاحب کے پاس پہنچ جائے تو وہ خود ہی اس درخواست کو ری ڈرافٹ کر کے راشٹرپتی کے پاس پھانسی کے تختے پر لٹکے ہوئے شخص کی زندگی کی بھیک مانگنے کے لئے چلے جائیں

گے ۔! میرے پاس اس سلسلے کے پورے پورے اعداد و شمار تو نہیں تھے کہ اس وقت تک وہ واقعی کتنے ایسے لوگوں کی جان بخشییاں کرا چکے تھے یا مخالف پارٹی کی ہی درخواست پر کتنوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا چکے تھے لیکن پھر بھی اپنے عہد کے ایک فرشتہ صفت انسان کو یہ دنیا چھوڑنے سے پہلے ایک نظر دیکھ لینا ضروری سمجھتا تھا۔ کیا پتہ، دوسری دنیا میں بھی اُسی کی سفارش کی ضرورت پڑ جائے !

چنانچہ دلّی جیسے بڑے شہر میں جگہ جگہ اُن کا پتہ پوچھتا ہوا اُن کے آفس میں بالآخر پہنچ گیا تو وہاں شیشے کے گیٹ کے پاس ہی سب سے پہلے ایک انتہائی طور پر خوبصورت اور پُر وقار خاتونِ استقبالیہ (سواگتی) کے درشن ہو گئے اور مجھے آنِ واحد میں یہ احساس ہو گیا جیسے دھوپ اور لُو سے جُھلسے ہوئے مسافر کو اچانک گھنی چھاؤں اور ٹھنڈی ٹھنڈی حیات بخش ہوا کا جھونکا میّسر آ گیا ہو! کنور صاحب نے بھی یقیناً میرے ایسے مسافروں کو راحت کا احساس کرانے کے لئے ہی اُس بتِ ہزار شیوہ کو رِی سپشینسٹ کے طور پر ملازم رکھا ہو گا۔

میں اُس کے سامنے جا کر رُک گیا تو اس نے میری طرف یوں ابرو اٹھا کر دیکھا جیسے بغیر زبان ہلائے ہی وہ پوچھ لینا چاہتی ہو، "کہئے، کس سے ملنا ہے؟"

میں نے غرورِ حسن کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے یہ فوراً بتا دینے میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔ "لکھنؤ سے حاضر ہوا ہوں۔ کنور صاحب سے ہی ملنا ہے"۔

یہ سُن کر اُس نے کالے گھنے بالوں کا جنگل جیسا اپنا سر گھما کر اس سمت میں دیکھا جہاں کئی نئی و خوبصورت ایمبیسڈر کاریں قطار باندھے کھڑی تھیں۔ بطور ماڈل!۔ وہ بھی تو ایک خوبصورت ماڈل ہی تھی جس نے بڑی شیریں آواز میں مجھے بتایا: "تشریف لے جائیے۔ کنور صاحب کا کیبن وہ سامنے ہے جہاں بہت سے آدمی کیوٗ میں کھڑے ہیں!"

اُس کی بات سُن کر میں کنور صاحب کے آفس میں بھی کیوٗ کا آدمی بن گیا۔ آناً فاناً اگرچہ اس بھیڑ بھاڑ سے چھلکتی ہوئی دنیا میں ہر چھوٹے بڑے کام کے لئے کیوٗ لگانے کے

اصول کا ہی حامی ہوں کیونکہ اس میں نہ کپڑے پھٹتے ہیں نہ ہی کندھے چھلتے ہیں۔ لیکن میں نے ایک صدمہ یقیناً محسوس کیا۔ جس ادیب کے غریب خانے پر کرشن چندر، بیدی، عباس، سجاد ظہیر، فراق، احتشام، ساحر، مخدوم جیسے کئی جید اور اردو ادب کے مینار تشریف لے آچکے ہوں اور جس نے خود اپنے گھر پر کبھی کیو بندھوانے کا تصور تک نہ کیا ہو اُسے آج کنور صاحب سے ملنے کے لئے کیو میں کھڑا ہونا پڑے گا! ۔ تیس چالیس لوگوں کے بالکل آخر میں جاکر جن میں بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، برقعہ پوش اور بے برقعہ، کوئی کوئی بے حد خوش پوش اور کوئی کوئی انتہائی معمولی کپڑوں میں اور میں نے گھبرا کر بے اختیار اس صوفے کی طرف اپنی نظریں گھمائیں جو اُس خاتون کے قریب خالی پڑا تھا۔ وہ بھی میری نیت فوراً بھانپ گئی کہیں میں کیو میں جاکر اپنی باری کا انتظار کرنے کی بجائے اسی کے پاس نہ بیٹھ جاؤں! ۔ وہاں بیٹھ جاؤں گا تو اُسے میری دز دیدہ حریص نظروں کا بھی شکار ہونا پڑ جائے گا۔ شاید یہی سوچ کر اس نے مجھ سے کہا — آپ اس چٹ پر اپنا نام لکھ دیجئے۔ اسے میں اندر بھجوا دیتی ہوں۔ شاید کنور صاحب آپ کو فوراً بلوالیں "!

میں نے ویسا ہی کیا اور اُس نے بھی میری چٹ فوراً چپڑاسی کے ذریعے اندر بھجوادی۔ اور کنور صاحب نے بھی اسی وقت مجھے اندر بلوالیا۔ اور اس طرح میرے اندر میرے اندر کے ادیب کا ٹوٹتا ہوا اعتماد پھر سے جڑ گیا اور میں بڑے فاتحانہ انداز سے کیو میں لگے ہوئے سارے غیرت مند اور بے غیرت لوگوں کو جیسے پسپا کر کے کیبن کے اندر داخل ہو گیا۔ لیکن وہاں بھی پندرہ بیس کے قریب لوگ موجود تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ بالکل سٹے ہوئے سے، کرسیوں اور صوفوں پر فروکش۔ مجھے دیکھ کر کنور صاحب اپنی تصویروں والی پوشاک یعنی نیلی پگڑی، سفید کھدر کا کرتہ اور چوڑی دار پاجامہ میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ خوش ہو کر مجھے گلے سے لگایا۔ لیکن کچھ پریشان بھی نظر آئے کیونکہ میرے بیٹھنے کے لئے کوئی کرسی خالی نہیں تھی۔ وہاں اتنی جگہ بھی نہیں تھی کہ میرے لئے ایک اور کرسی منگوا کر ڈلوا دیتے۔ لیکن اُس مشکل گھڑی میں محض میری آمد کی وجہ سے ایک آدمی کا یہ فائدہ ضرور ہو گیا کہ اُسے محض اٹھا دینے کی خاطر کنور صاحب نے اس سے کہہ دیا — "اچھا"

آپ اب تشریف لے جائیں اور کل سے ورکشاپ میں کام پر آنا شروع کر دیجئے ۔"

وہ آدمی میری طرف نہیں بلکہ کنور صاحب کی ہی طرف بڑی احسان مند نظروں سے دیکھتا اور بار بار "شکریہ، شکریہ، آپ کے بال بچے جئیں"، کہتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا اور اس طرح مجھے اس کی خالی کی ہوئی جگہ پر اطمینان سے بیٹھ جانے کے لئے کہہ دیا گیا۔ اسی ہمدردی، انسان دوستی اور شفقت کے جذبات سے بھرپور آواز میں جسے ایک مرتبہ سُن لینے کے بعد مر جانے سے خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

کنور صاحب نے خود بھی پھر سے بیٹھتے ہوئے مجھ سے کہا ــــ "اگر آپ کو جلدی نہ ہو تو میں کچھ لوگوں کو نمٹا لوں؟ ــــ اس کے بعد اُوپر آفس میں جا کر اطمینان سے باتیں کریں گے!"

یعنی ان کا ایک اور آفس اوپر بھی تھا جہاں وہ واقعی میرے جیسے لوگوں کے ساتھ اطمینان سے بات کر سکتے تھے! مجھے کوئی جلدی نہیں تھی ہوتی بھی تو میں کم سے کم ان لمحوں میں تو اسے صرف اس لئے قربان کر سکتا تھا کہ وہاں کچھ دیر بیٹھ کر میں کئی چہروں کا مطالعہ کر سکتا تھا۔ ہر چہرہ ایک الگ سا چہرہ تھا۔ ایک الگ سی کیفیت اور کہانی لئے ہوئے۔ یہ کہانی وہ لوگ خود بیان کر رہے تھے۔ اپنی اپنی ضرورت کی، محرومی کی، ناانصافی کی خود غرضی اور حماقت اور انسان کی ازلی حرص و ہوس کی۔ اتنے دلچسپ لوگوں کو اس قدر قریب سے دیکھنے کا موقعہ ہاتھ سے کیوں گنواؤں۔؟ میں جم کر بیٹھ گیا۔ مسکرا کر کہا۔ "جی نہیں، مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ بڑے شوق سے اپنے کام کو نمٹائیے۔"

یہ سُن کر وہ اور بھی خوش نظر آئے اور بولے ــــ "تب تک آپ کافی پیجئے۔" انہوں نے چپڑاسی کی طرف ایک خاص انداز سے دیکھا اور چپڑاسی سر جھکا کر دوسرے لوگوں کے سامنے سے خالی پیالے سمیٹ کر فوراً باہر نکل گیا۔ معلوم یہ ہوا وہاں انتظار کرنے کے لئے ہر آدمی کو کافی ضرور پلائی جاتی ہے۔ اس طرح اس کی آدھی تکلیف تو یہ سوچ کر رفع ہو جاتی ہے کہ وہ ایک بڑے آدمی کے دفتر میں بیٹھا کافی پی رہا ہے جو اس کی

ضرورت بھی پوری کرے گا۔ نہیں بھی کر پائے گا تو وہ احساس تشکر میں ہی اپنی مایوسی کا کرب بھول جائے گا۔ میں نے یہ سوچا تو کنور صاحب مجھے بہت بڑے ڈپلومیٹ بھی معلوم ہوئے وہ اپنی جنتا سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں بھی کر پائیں گے تب بھی اُن کے جس میں کوئی کمی نہیں آسکے گی۔

چپڑاسی میرے آگے کافی کا پیالا رکھ گیا تو میں نے ایک دو گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک عورت جو ادھیڑ عمر تھی لیکن بہت ہی خوش رو۔ اس کے نقش اب بھی تیکھے تھے یعنی وقت کے حوادث نے اس کی دلکشی میں کوئی خاص کمی نہیں آنے دی تھی۔ ایک چھوٹے سے قد کی بڑی اسمارٹ اور سانولی سلونی سی لڑکی بیل باٹ میں اپنے ترشے ہوئے بالوں کو بار بار جھٹکے دے کر ادھر سے ادھر چھلکا رہی تھی۔ ایک سفید ریش بزرگ گلے سے پیٹ تک بٹن بند شیروانی میں بالکل جگر مراد آبادی کا ہم شکل معلوم ہو رہا تھا۔ ایک نوجوان اپنی شکل، بالوں اور کپڑوں کی وجہ سے پہلی ہی نظر میں کوئی ایکٹر نظر آیا۔۔۔ دو ادھیڑ بے شیو چہرے مچھلی فروشوں کی طرح لگے۔ ان کے کپڑوں میلی جیکٹوں اور رام پوری ٹوپیوں سے کچھ ایسی ہی بو آرہی تھی۔

اچانک کنور صاحب کی گمبھیر آواز نے مجھے اپنی اور متوجہ کر لیا۔ وہ ایک صاحب سے کہہ رہے تھے ـــــ ہاں نو نہالپا صاحب، آپ جلدی سے اپنا پرابلم بتائیں کیونکہ آپ کو تین بجے کی فلائیٹ بھی پکڑنی ہے۔"

اس آدمی نے پہلے تو کنور صاحب کے سامنے ایک بہت بڑا البم کھول کر رکھ دیا جس میں کئی فلمی فوٹو لگے ہوئے تھے۔ اُس نے کہا "کنور صاحب، یہ آپ کی نئی فلم کے اسٹلز ہیں۔ چھ تاریخ کی شوٹنگ کے لئے سارے انتظامات مکمل ہیں۔ دت صاحب نے ایوننگ شفٹ میں ہی آکر کام کرنے کے لئے منظوری دے دی ہے۔ اس دن رادھا سلوچہ ایک اور شوٹنگ کے سلسلے میں مدراس جا رہی تھی لیکن اُسے میں نے بڑی کوشش سے اُسی روز کے لئے روک لیا ہے۔ لیکن اس روز آپ کا بھی بمبئی میں رہنا ضروری ہوگا کیونکہ کم سے کم ساٹھ ہزار کا انتظام بھی تو کرنا ہوگا۔"

کنور صاحب اپنے آگے پھیلے ہوئے البم کی تصاویر دیکھتے دیکھتے اس کی باتیں بھی بڑے غور سے سنتے گئے۔ ان کے چہرے کا ردِّ عمل بتا رہا تھا کہ وہ کچھ سوچتے بھی جا رہے تھے۔ انھوں نے اچانک انٹرکام پر اپنی پی اے سے پوچھا ــــ "میں چھ تاریخ کو کہاں ہوں؟" پھر ادھر سے کوئی جواب سُن کر وہ بولے ــــ "ان لوگوں کو تار دے دو۔ میں کیرانہ نہیں پہنچ سکتا کیونکہ بمبئی میں شوٹنگ ہے۔ وہ اپنا مشاعرہ دس کے لئے ملتوی کر سکیں تو میں پلین سے دلّی آؤں گا اور کار سے شام تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔ ورنہ کسی اور کو صدارت کے لئے تیار کرلیں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد ان کی اسٹینو نے تین چار خطوط ان کے سامنے رکھ دیئے جن پر انھوں نے جلدی جلدی دستخط کئے اور انھیں تھاپا کے آگے سرکا دیا۔ تھاپا خطوط کو جلدی جلدی اپنی فائل میں سمیٹتا ہوا باہر نکل گیا تو ایک اور آدمی آگے آکر بولا۔ "حضور میں سروس سے ریٹائر ہونے والا ہوں۔"

"ذرا اونچا بولیئے ــــ" کنور صاحب نے کہا۔

اس نے پھر سے دہرایا ــــ "حضور میں سروس سے ریٹائر ہونے والا ہوں۔"

"اچھا آپ سروس سے ریٹائر ہونے والے ہیں! تو پھر؟"

"میں نے بیس سال پہلے ایک کالونی میں پلاٹ لینے کے لئے روپیہ جمع کرایا تھا۔ ابھی تک الاٹمنٹ نہیں ہوسکی ہے۔ میں کب مکان بنواؤں گا، کب اس میں جاکر رہ سکوں گا۔ آپ میری درخواست کو آگے بڑھادیں تو کام بن جائے گا۔

کنور صاحب نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی درخواست کو پڑھا اور پھر انٹرکام پر کہا۔ "ذرا پرمیشورم، چیئرمین ہاؤسنگ بورڈ آف سوسائٹیز کا نمبر ملا کر مجھ سے بات کراؤ۔"

کچھ ہی لمحوں میں نمبر مل گیا تو انھوں نے بڑی خوش دلی سے اس آدمی کا مسئلہ بتا کر کہا۔ "یعنی یہ کام تو اب ہو ہی جانا چاہیئے۔ ہاں اس کی درخواست اپنے خط کے ساتھ آپ کے پاس بھجوا رہا ہوں۔ ہاں پلیز! کل صبح دس بجے؟ اچھا۔ اور آج شام کو آپ

کہاں ہیں ؟ اچھا۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے مجھے کلب میں ذرا دیکھ لیجئے گا" "تھینک یو"

اس کے بعد انھوں نے ایک مختصر سا خط اپنی اسٹینو کو ڈکٹیٹ کرایا اور اس آدمی سے کہا ۔" یہ خط لے کر کل صبح بورڈ کے دفتر پہنچ جائیے گا۔"

پھر وہ مچھلی فروشوں کی سی صورت والے دونوں آدمی سامنے آئے ۔

"عالی جاہ، ہمارے مکان کا بٹوارہ ابھی تک نہیں ہوسکا۔ آپ نے موقع پر آکر ہم دونوں بھائیوں میں جو سمجھوتہ کرادیا تھا اس کے مطابق نقشہ نویس نقشہ نہیں بنا پارہا ہے۔ اور رجسٹری کرادینے کے لئے آپ نے جس وکیل سے ملنے کے لئے کہا تھا وہ بھی کچھ روڑے اٹکا رہا ہے۔"

ان کی بات پر کچھ لمحوں تک کنور صاحب نے آنکھیں بند کرکے غور کیا۔ پھر جیسے کچھ یاد کرکے بولے" ہاں، وہ نقشہ نویس میرے پاس بھی آیا تھا۔ وہ کہتا تھا اگر تم دونوں بیچ کی دیوار کو مشترکہ مان لو تو نئی چھتیں ڈلوانے میں آسانی ہوجائے گی اس میں آپ لوگوں کو کیا اعتراض ہے ۔؟"

اب دوسرا آدمی بولا۔" حضور ہمیں کونسا اعتراض ہوسکتا ہے۔ ہم تو آپ کے حکم کے بندے ہیں۔ آپ نے تو ہمارے جھگڑے کو اس خوش اسلوبی سے نپٹا دیا کہ ہم آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھول سکیں گے۔ لیکن ہم ہمیشہ تو نہیں رہیں گے۔ ہمارے بعد ہمارے بچوں کے درمیان کوئی نیا فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو بس اسی بات سے ڈرتے ہیں ۔"

"جی ہاں عالی جاہ ــــ ثروت بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔ اب آپ ہی کوئی دوسرا حل نکالیں تو بڑی نوازش ہوگی۔"

کنور صاحب نے دونوں بھائیوں کی طرف کئی لمحوں تک مسکرا کر دیکھا اور پھر بولے ـــــ" میں بمبئی سے لوٹ آؤں تو ایک روز نقشہ نویس اور وکیل کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔"

"بہت اچھا حضور۔ بہت بہت شکریہ ۔ آداب عرض۔"

دونوں جھک جھک کر آداب کہتے ہوئے باہر چلے گئے ۔ تو ایک چھوٹے سے قد کا بالکل گنجا اور کلین شیو آدمی آگے بڑھ آیا۔ اُسے دیکھتے ہی کنور صاحب نے اسٹینو کو طلب کر لیا۔ اور ڈکٹیشن دی ۔" مائی ڈیر بھٹاچاریہ، میں نے پہلے بھی آپ سے ایک بار ذکر کیا تھا کہ مسٹر آنند پرکاش کئی اخباروں کا رپورٹر رہ چکا ہے ۔ اتفاق سے وہ پچھلے ماہ سے جس اخبار کے ساتھ کام کر رہا تھا وہ کسی وجہ سے بند کر دیا گیا ہے ۔ اگر آپ مسٹر آنند پرکاش کو اپنے اخبار کے لئے اتر پردیش کا نیوز رپورٹر مقرر کر لیں تو میں آپ کا ذاتی طور ممنون ہوں گا۔ آپ کا وغیرہ وغیرہ ۔"

آنند پرکاش نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور اسٹینو کے پیچھے پیچھے اس کے کیبن میں جانے لگا تو کنور صاحب نے اسے روک کر کہا :" لیکن آنند صاحب، آپ کے خلاف میرے پاس بہت ہی سخت شکایت آئی ہے ۔ آپ نے لکھنؤ میں میرے ہوٹل میں ٹھہرنے کے بہت پرانے بل دکھا کر کانفرنس والوں سے روپے وصول کر لئے ہیں ۔ اور میں تو وہاں صرف ایک ہی روز ٹھہرا تھا۔ پانچ روز کا بل کیسے دے دیا آپ نے ؟"

آنند پرکاش شرمندہ ہو کر بولا :" میں اپنی غلطی کی ان سے معافی مانگ چکا ہوں۔ آپ سے بھی مانگتا ہوں۔ آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا !"

اب اس خوش شکل ادھیڑ عمر خاتون کی باری تھی ۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ہی ایک کاغذ آگے بڑھا دیا ۔ جسے کنور صاحب نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا اور پڑھ کر بولے :" میں جانتا تھا سارے کرایہ داروں سے مکان خالی کرا لینا اتنا آسان نہیں ہوگا ۔ آپ نے مکان ہی ایسا لیا ہے جس میں آٹھ آٹھ کرایہ دار بسے ہوئے ہیں ۔ سب کو پگڑی دے کر بھگانا تو ممکن نہیں ہوگا ہاں اگر آپ ان کا پچھلا کرایہ معاف کر دینے کے لئے تیار ہو جائیں تو بات کی جا سکتی ہے ۔ اپنے پی اے کو بھیجوں گا ان لوگوں کے پاس ۔ دیکھئے کیا کہتے ہیں ! لیکن آپ کو یہ شرط منظور ہو تو ۔ !"

جی مجھے تو ہر شرط منظور رہے ۔ اس میں بھی دس ہزار روپے کا نقصان ضرور ہوگا ۔ کسی کا" دو سال کا کرایہ باقی ہے کسی کسی کا ایک ایک سال کا ۔ جس تھانیدار کو آپ نے

فون کیا تھا اس کا تو تبادلہ ہو گیا ہے - نیا تھانیدار کوئی دلچسپی ہی نہیں لے رہا ہے -"

کنور صاحب نے جواب دیا -" یہ تو عدالتی چارہ جوئی سے بچنے کے لئے ہی کیا گیا تھا۔ نہیں ہو سکا - اگر آپ اب بھی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے تیار ہوں تو میں وکیل کر دیتا ہوں -"

" نہیں نہیں کنور صاحب - میں اکیلی اور پھر عورت ذات! عدالت کے چکر لگاتے لگاتے مر نہیں جاؤں گی؟ کیا پتہ کب انصاف ہو، کب تک وہ لوگ نکلیں - تب بھی تو وہ نہیں نکلیں گے میں جانتی ہوں ان میں ایک سے ایک قانونی پڑا ہوا ہے - وہی ٹھیک ہے جو آپ نے ابھی کہا ہے اپنے آدمی کو کسی روز بھیج کر صلح صفائی کرا دیجئے -"

" اچھا آپ جائیے میں بھیج دوں گا کپور کو --- ان کاموں میں وہ بہت ہوشیار ہے -"

اس خاتون کے چلے جانے کے بعد کنور صاحب اس سانولی سلونی لڑکی کی طرف متوجہ ہوئے جس نے اپنے ریشمی بالوں کے آبشار ایک ہاتھ میں سمیٹ کر نظریں جھکا لیں اور کنور صاحب نے پوچھا -" آپ کیا چاہتی ہیں؟"

" آپ سے پہلے بھی عرض کر چکی ہوں - مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کا ایک شاندار جشن منا سکوں - سب انتظامات مکمل ہیں صرف آپ کے ہاں کہہ دینے کی دیر ہے -"

کنور صاحب دیر تک ہاتھ پر ماتھا ٹکائے ہوئے سوچتے رہے پھر سر اٹھایا تو مسکرا کر بولے -" سمجھ میں نہیں آتا لوگ میرا جشن کیوں منانا چاہتے ہیں - بھئی اور بھی تو سینکڑوں ادیب اور شاعر ہیں ان کے بھی جشن منائیے کیا وہ اس قابل نہیں ہیں!"

وہی جگر مراد آبادی کا ہم شکل بوڑھا بولا -" حضور، آپ کے لوگوں پر اس قدر احسانات ہیں کہ انہیں اپنے اظہار تشکر کے لئے کوئی اور ذریعہ نہیں ملتا -"

کنور صاحب نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا -" نہیں میں اس بات سے متفق نہیں ہو سکتا - اور پھر جو کچھ میں کرتا ہوں وہ کسی پر احسان ہرگز نہیں ہوتا ہے - میں تو خود کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ کسی نہ کسی کے کام آسکتا ہوں - آپ کو یاد ہے نا مولانا چند برس پہلے کوتی اور صاحب بھی لکھنؤ سے میرا ہی جشن منانے کی تجویز لے کر آئے تھے -

میں نے انہیں بھی منع کر دیا تھا اور اپنا جشن منوانے کی بجائے ایک اور شخص کو جو اردو کے کاز کے لئے ایک کانفرنس کرنا چاہتے تھے اپنا تعاون پیش کرنا زیادہ ضروری سمجھا تھا۔!"

پھر وہ اس لڑکی کی طرف دیکھ کر بولے ــ" آپ بھی کوئی کانفرنس یا سمینار کیوں نہیں کرتیں جس سے اُردو زبان کے کچھ مسائل سامنے آجائیں اور ان کا حل ڈھونڈنے میں مدد مل سکے۔"

مولانا بول اٹھا ــ" اے حضور، یہ لڑکی کانفرنس کا اتنا بڑا بوجھ کیسے اٹھا سکے گی۔منالینے دیجئے آپ کا ہی جشن! مشاعرہ ہوگا تو کچھ دلچسپی بھی رہے گی!"

"جی ہاں کنور صاحب! میں آپ کی شان کے شایان مشاعرہ ہی کرنا چاہتی ہوں۔"

لیکن کنور صاحب اُسی مولانا کی طرف متوجہ رہے اور بولے ــــ" معلوم ہوتا ہے آپ کو غزل پڑھنے کی ایڈوانس رشوت مل گئی ہے۔ تبھی ان کی پرزور وکالت کر رہے ہیں!"

"جی ہاں جی ہاں۔غزلیں تو میں کہتا ہی رہتا ہوں لیکن اس موقعہ پر ایک خاص نظم لکھ کر آپ کو خدمت میں پیش کروں گا۔"

"جی نہیں۔آپ کو اس مشاعرے میں مدعو تک نہیں کیا جائے گا۔" کنور صاحب ہنس کر بولے۔

"حضور مجھے تو اس میں مدعو کرائیے گا نا! میں تو ایک عرصہ سے منتظر ہوں کہ کوئی آپ کا جشن منائے اور میں اپنی نظم پیش کروں؟" یہ وہی لڑکا تھا جو شکل وصورت اور لباس کی وجہ سے کوئی فلم ایکٹر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ تو شاعر نکلا۔لیکن خیر۔

کنور صاحب نے اُسے بھی ٹوک دیا۔آپ ذرا خاموش رہئیے بلکہ باہر جاکر پان وان کھا آئیے۔" پھر وہ اس لڑکی سے بولے ــ آپ میری درخواست مان لیجئے اور کوئی سمینار کرا لیجئے۔ مباحثے کی تھکن مٹانے کے لئے ذرا دیر کے لئے شعر وسخن کی محفل بھی لگائی جائے گی۔اور مجھ سے جو بھی مدد ہو سکے گی وہ ضرور کروں گا۔آپ اپنے یہاں کے سیشن جج اور ڈسٹرکٹ میجسٹریٹ کے نام مجھ سے خط ضرور نے جائیے گا۔ دو ایک اچھے ادب ذوق کنٹریکٹر بھی مجھے جانتے ہیں وہ بھی آپ کا ہاتھ بٹا دیں گے۔میرے

ٹھہرنے ویرنے کا سارا انتظام بھی وہی لوگ کر دیں گے کسی ڈاک بنگلے میں۔ سمجھیں؟ مجھ پر آپ کا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوگا۔ اپنی کار سے جاؤں گا اور لوٹ بھی آؤں گا۔ یہ مولانا اور دو چار شاعر جو ہر وقت یہاں جمع رہتے ہیں انھیں بھی ساتھ لے آؤں گا۔ تاکہ ان کا شوق بھی پورا ہو جائے۔ اب جائیے۔ پھر کسی روز فرصت سے آئیے۔ ابھی تو میں کوئی تاریخ بھی نہیں بتا سکوں گا کہ کب آسکتا ہوں۔"

جتنے لوگ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے تھے ان کی جگہ پر کرنے کے لئے اتنے ہی لوگ اور باہر سے آکر بیٹھ چکے تھے۔ کنور صاحب گھڑی پر نگاہ ڈال کر اور پھر میری طرف دیکھ کر بولے ۔"بہت دیر ہو گئی۔ معاف کیجئے۔ آئیے اوپر چل کر بیٹھتے ہیں۔ ان لوگوں سے میں بعد میں مل لوں گا۔

پھر وہ ان سب لوگوں سے جو ان کے نچلے کیبن میں بھر گئے تھا اور کیبن کے باہر بھی کیو لگائے کھڑے تھے معذرت چاہتے ہوئے اور ابھی آیا، ابھی آیا، کہتے ہوئے ایک چوبی سیڑھی پر چڑھنے لگے۔ کہتے ہیں آپ دوسروں کو خوش تو کر سکتے ہیں بیک وقت ہر ایک کو نہیں مگر وہ بیک وقت ہر ایک کو خوش کرنے کا بہت بڑا فن جانتے ہیں۔ لیکن اتنے سارے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اُنھوں نے کبھی ایک علاقے کا انتخاب نہیں کیا ہے۔ یہ کام عام طور پر سیاست داں ہی کیا کرتے ہیں جنھیں الیکشن لڑنا ہوتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کنور صاحب نے الیکشن لڑنے کے لئے کبھی نیّت نہیں باندھی۔ اسی لئے انہیں ہر علاقے کے لوگوں سے محبّت ہے۔ چاہے وہ کہیں سے بھی آئیں۔ چاہے ان میں خود غرض، رذیل اور انتہائی طور پر کمینے بھی شامل ہوں۔ وہ ان کے صرف چہرے دیکھتے ہیں۔ ان کی آنکھیں دیکھتے ہیں۔ ان کی زبان پر آئے ہوئے یا درخواستوں میں لکھے ہوئے الفاظ کے پیچھے دلوں کی دھڑکن سن لیتے ہیں۔ کسی سے انکار کرنا جیسے ان کے مذہب کے ہی خلاف ہے!

جب ہم اوپر پہنچے تو اُس کیبن میں ان کی شریمتی موجود تھیں۔ ان کی اہلیہ بھی یقیناً کسی کام سے ہی آئی تھیں اور اپنی باری کا کئی گھنٹوں سے انتظار کر رہی تھیں۔ انہیں بھی وہی یقین تھا جو دوسرے لوگوں کی آنکھوں میں جھلکتا تھا۔ یعنی اُن کا کام بھی ضرور

پورا ہوگا۔

وہاں اپنی میز کے سامنے بیٹھ کر انھوں نے پھر سے کافی منگائی۔ اور مجھ سے پوچھا ــــ" اب آپ فرمائیں۔ کیسے آنا ہوا؟ کب آنا ہوا؟ میں آپ کی کونسی خدمت سرانجام دے سکتا ہوں۔" وغیرہ وغیرہ کئی جملے۔ خلوص، شفقت اور کسی اندورونی خوشی میں ڈوبے ہوئے۔

ابھی میں جواب میں کچھ کہہ ہی نہیں پایا تھا کہ اچانک انٹر کام فون کی بز بز سُنائی دی اور وہ ریسور اٹھا کر سُننے لگے اور ان کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا اور پھر انھوں نے کہنا شروع کیا ــــ مسٹر جھا کو ہوا کیا تھا؟ ارے ہارٹ فیل ہوگیا۔ اُف! اچھا تم یہ معلوم کرو، اس وقت ان کی مٹی کہاں رکھی ہوئی ہے! ارتھی کب اٹھائی جائے گی؟ اور کون سے شمشان گھاٹ پر لے جائی جائے گی؟ سمجھے نا! اور کپور سے کہو، وہ فوراً چاندنی چوک جاکر گلاب کے پھولوں کے دو بڑے بڑے ریتھ تیار کرالے۔ ایک تو ابھی جھا صاحب کے گھر لے جاکر مسٹر جھا کے قدموں میں رکھ دے اور دوسرا ریتھ شمشان گھاٹ پر لئے ہوئے میرا انتظار کرے۔ میں سیدھا شمشان گھاٹ ہی پہنچوں گا۔

پھر ریسور رکھ کر انھوں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو ایک صوفے پر چپ چپ سی بیٹھی تھیں۔ اور اچانک اداس ہوگئی تھیں۔ ان کی زبان سے صرف ایک ہی لفظ نکلا ــــ" بچاری!"

کنور صاحب نے بھی ان کی تائید میں سر ہلایا اور پھر آنکھوں میں آئے ہوا آنسو پونچھنے لگے۔ میں ماحول کو اس قدر افسردہ دیکھ کر اُٹھ پڑا۔ وہ حیران سے ہوکر بولے ــــ" بیٹھئے بیٹھئے۔ چل کیوں دیئے۔"

میں نے جواب دیا" آپ کو وہاں جو جانا ہے۔ اس وقت آپ کے کاموں میں مخل ہونا مناسب نہیں ہوگا۔

" اجی صاحب تشریف تو رکھئے۔" ان کی آواز میں سے اداسی اچانک غائب ہوگئی۔ اس میں وہی پہلی سی نرمی اور گرمی لوٹ آئی۔" میرے پاس ابھی پورا ایک گھنٹہ ہے۔ بلکہ ایک گھنٹہ بیس منٹ ــــ ابھی تو میں کئی لوگوں سے نمٹوں گا۔ جو نیچے میرا انتظار

کر رہے ہیں۔ مرنا جینا تو لگا ہی رہتا ہے۔ کون ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے پٹّہ لکھا کر آیا ہے
یہاں۔ ایک روز ہم بھی اسی طرح چل دیں گے۔ آپ اپنا کام بتائیے۔" اور کافی بھی لیجئے نا۔
اسے کیوں ٹھنڈا کر رہے ہیں۔"

وہ خود بھی کافی پینے لگے اور اسٹینو کو اشارے سے دور ہی روک دیا جو کچھ کاغذات
اٹھائے ان کی طرف لپکی چلی آرہی تھی۔ میں نے خاموش رہ کر چند گھونٹ کافی کے نگلے اور پھر
کہا ـــ "کیا آپ وزیر اعظم کو کوئی سجھاؤ دے سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں!" انھوں نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔ اگر سجھاؤ معقول ہو گا تو میں
ضرور دے دوں گا۔

"ان سے صرف یہ کہنا ہے کہ ہمارے صوبے میں وزیر اعلےٰ کی جگہ خالی پڑی ہے۔ وہاں
وہ کسی ایسے آدمی کو بھیجیں جو ہر ایک فرقے کے لئے قابل قبول ہے اور صوبے کی کسی بھی
زبان سے تعصب نہ برتتا ہو۔ اس وقت ہمیں اردو سے واقعی محبت کرنے والے ایک
وزیر اعلےٰ کی ضرورت ہے کیونکہ لوگ بھی اب اس زبان کو سیاسی کی بجائے ایک تہذیبی
مسئلہ ماننے لگے ہیں۔"

یہ سُن کر انھوں نے کسی قدر مسرور ہو کر میری طرف دیکھا کیونکہ ان کی آنکھیں چمک
چمک اُٹھی تھیں۔ انہوں نے کہا ـــ "آپ نے بہت اچھی بات سوچی ہے لیکن آپ کی نظر
میں وہاں ایسا کوئی آدمی ہے جس کا ذکر بھی کر دیا جائے؟"

"جی ہاں ہے لیکن وہ وہاں نہیں آپ کی راجدھانی میں ہی موجود ہے۔ وہ ہے وہیں
کا رہنے والا۔ آپ اسی کو بھجوا سکیں تو بڑا کام ہو جائے گا۔ ویسے وہ آپ کا دوست
بھی ہے!"

انھوں نے اور بھی خوش ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا ـــ "آپ کا مطلب
ب سے ہے؟"

"جی ہاں!"

"تب تو آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں بھی یہی سوچ رہے ہوئے تھا۔" یہ کہہ کر

انھوں نے اپنی اسٹینو کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ وہ لپکتی جھپکتی پاس آئی تو کنور صاحب نے پوچھا وہ لیٹر کہاں ہے جو میں نے آج صبح آتے ہی پی ایم کے نام لکھوایا تھا۔!"

اسٹینو نے ایک ٹائپ شدہ خط اپنے ہاتھ میں اٹھائی ہوئی فائل میں سے نکال اُن کے سامنے رکھ دیا۔ معہ لفافہ کے۔ کنور صاحب نے وہ خط چند لمحے دیکھنے کے بعد میری طرف بڑھا دیا ــــ "لیجئے دیکھ لیجئے۔ ہم دونوں نے ایک ہی وقت میں ایک ہی بات سوچی ہے۔ کتنا عجیب اتفاق ہے!"

پردھان منتری کے نام لکھے ہوئے خط میں واقعی وہی بات لکھی ہوئی دیکھ کر میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ اُنہیں خط واپس کرتے ہوئے کہا۔ "کنور صاحب" آپ ہر مشکل کو حل کرنا جانتے ہیں۔ اگر "مشکل کشا" لفظ ایک اور قابل تعظیم ہستی کے لئے وقف نہ کیا جاچکا ہوتا تو اس کا اطلاق آپ پر ہی بڑی آسانی سے کر دیا جاتا۔!"

یہ سن کر وہ مسکرا دیئے اور میرے ساتھ ساتھ اٹھ کر نیچے چلے آئے۔ پھر اُسی زمین پر، جہاں کئی ضرورت مند اُن کے منتظر تھے۔ اور وہ اُن کے پاس اپنے اندر کئی طرح کے غم اور خوشیاں اور منصوبے چھپا کر صرف اُنہی کی باتیں سننے کے لئے صرف انہی کی خاطر مسکراتے ہوئے اپنے کیبن کی طرف بڑھ رہے تھے۔

جگن ناتھ آزاد

ہمارے کنور صاحب

آج ۱۹۸۶ء ہے اور یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ چوتالیس سال پہلے کی۔ لائل پور میں ایک مشاعرہ تھا۔ آل انڈیا مشاعرہ جس کے مہتمم تھے لائل پور کاٹن ملز کے مالک سر شنکر لال شنکر اور مُرلی دھر شاد۔ یہ وہی مشاعرہ تھا جو بعد میں انڈو پاک مشاعرہ دہلی اور انڈو پاک مشاعرہ لائل پور کی صورت میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مدّتوں تک ایک جذبۂ سگالی کے طور پر کام کرتا رہا۔

جب میں اس مشاعرے میں شرکت کے لئے لاہور سے لائل پور پہنچا تو اکثر شعرا جن میں علاّمہ کیفی دہلوی، راز دہلوی، بیخود دہلوی، نوح ناروی، جوش ملسیانی، احسان دانش، نخشب جارچوی، شکیل بدایونی، عرش ملسیانی اور صابر دہلوی کے نام قابلِ ذکر ہیں وہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔ ابھی مجھے اپنے خیمے[1] میں فروکش ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ باہر سے

---

[1] سر شنکر لال شنکر اور مرلی دھر شاد شعراء کے قیام اور طعام کے انتظام میں بذاتِ خود دلچسپی لیتے تھے اور ہم لوگوں کے قیام کا انتظام بہت عمدہ ہوتا تھا۔ وسیع و عریض قطعۂ زمین پر پھیلی ہوئی مل کے احاطے میں ہم لوگوں کے لئے خیمے نصب کر دیے جاتے تھے۔ یہ خیمے کمروں سے کہیں زیادہ (بقیہ صفحہ پر)

احسان دانش کی آواز سنائی دی۔ وہ جگن، جگن کہہ کے مجھے پکار رہے تھے میں باہر نکلا تو بولے چلو تمہیں خواجہ محمد شفیع سے ملوا لائیں۔ میرے لئے یہ نام نیا تھا۔ بعد میں تو خواجہ محمد شفیع میرے جگری دوست بن گئے لیکن اس وقت تک میں نہ اس نام سے آشنا تھا نہ اِس نام کے کمالات سے۔

ہم دونوں خواجہ محمد شفیع کے خیمے میں گئے۔ وہاں دہلی سے آئے ہوئے شعرا کا ہجوم تھا۔ پلنگ پر، کرسیوں پر، فرش پر شاعروں کا جمگھٹا تھا۔ ہم دونوں بھی بقول احسان دانش اس ہجوم میں "گھسڑ مسڑ" ہو گئے علیک سلیک کے بعد احسان دانش نے خواجہ محمد شفیع سے پہلا سوال جو کیا وہ یہ تھا کہ کیا "کنور صاحب ابھی تک نہیں آئے؟" میرے لئے یہ نام بھی نیا تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ تمام شعرا نے بیک وقت جواب دیا ـــــ وہ تو آ رہے تھے لیکن عین وقت پر کوئی سرکاری کام ایسا آ پڑا کہ انہیں یہ سفر ملتوی کرنا پڑا۔ حیرت اس بات سے ہوئی کہ جس کے نام سے میں قطعاً آشنا نہیں تھا۔ اس سے تمام شعرا کو اس قدر دلچسپی تھی کہ سب اُس کے پروگرام سے واقف تھے اور اُس کے لائل پور نہ پہنچنے پر سب اظہار تاسف کر رہے تھے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پوچھا "احسان بھائی! یہ کنور صاحب کون ہیں؟ اس کا جواب بھی تمام شعرا نے بہ یک وقت دیا ـــــ "تم کنور صاحب کو نہیں جانتے؟ بھئی کنور مہندر سنگھ بیدی" نخشب نے کہا کیا تم کنور صاحب سے ابھی تک نہیں ملے؟ شکیل بدایونی بولے "تم نے ان کا کلام ریڈیو پر بھی نہیں سنا؟ عرش نے کہا آج وہ آ جاتے تو تم ان سے مل کر بہت خوش ہوتے اور ان کا کلام سن لیتے۔ اب احسان نے میری وکالت کی۔ اور بولے کہ جگن کی ابھی مشاعروں میں شرکت کی ابتدا ہے۔ اس نے آپ میں سے بھی اکثر کو ابھی پہلی بار دیکھا ہے۔ اس پر خواجہ محمد شفیع کے منہ سے نکلا ع رفتہ رفتہ عشق در کار آورد بیگانہ را اس ایک مصرعے

(بقیہ صفحہ سے آگے) آرام دہ اور خوبصورت ہوتے تھے۔ فرش پر قالین، دروازوں پر پردے، ملحقہ غسل خانے غرض ہر طرح کا آرام میسر ہوتا تھا۔

ہی سے میں خواجہ شفیع کی مزاجی کیفیت سے آشنا ہو گیا اور سمجھ گیا کہ یہ ہماری کلاسیکی برادری کا فرد ہے۔

یہ کنور مہندر سنگھ بیدی سے میرا پہلا تعارف تھا۔ غائبانہ تعارف۔ لیکن اس تعارف نے میرے دل میں کنور صاحب سے ملاقات کا اشتیاق پیدا کر دیا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ پانچ برس بعد ملک تقسیم ہو گیا اور ہم لوگ بے گھر اور بے خانماں ہو کر دہلی آ پہنچے۔ پہلے میرے عزیز دوست جمنا داس اختر کی عنایت سے اور روزآنہ "تیج" کے مالک لالہ دیش بندھو گپتا کے کرم سے سر چھپانے کو جگہ مل گئی۔ ہمیں اس طرح خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتے چند روز ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک دن بسمل شاہجہان پوری نام کے ایک شاعر ایک دعوت نامہ لئے ہوئے ہمارے گھر پر آئے۔ یہ دعوت نامہ کنور مہندر سنگھ بیدی کی طرف سے والد محترم کے اور میرے نام تھا۔ دو تین روز بعد دہلی میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا اور کنور صاحب نے ہمیں اس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔

میری دیرینہ آرزو بر آئی تھی۔ چار پانچ سال پہلے جس شاعر کا نام بڑے ذوق و شوق سے سُنا تھا اب اس سے ملاقات ہو رہی تھی۔ میں سراپا اشتیاق بن کے مشاعرہ میں پہنچا۔ کنور صاحب وہاں پہلے ہی سے موجود تھے بڑے تپاک سے ملے۔ والد محترم کے ساتھ ملاقات میں انھوں نے خاص جذبۂ احترام کا اظہار کیا۔ مجھ سے پہلی ہی ملاقات میں بڑی بے تکلفی سے بات کی۔ بولے تمہارے کلام اور شعر خوانی دونوں کی میں نے بہت تعریف سنی ہے۔ آج جی بھر کے تمہیں سنیں گے۔ مجھے ان کی یہ بے تکلّفی کی ادا بہت بھلی لگی۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ کنور صاحب ایک مخصوص انداز سے شعرا کا تعارف کرا رہے تھے جس میں ادبیات کے ساتھ ساتھ مزاح کی چاشنی بھی موجود تھی۔ بسمل شاہجہان پوری اپنی لمبی چوڑی داڑھی سمیت جب مائیکروفون پر آئے تو کنور صاحب نے ان کے تعارف میں اپنی یہ رُباعی پڑھی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا۔

یہ شیخ تو مصروف عبادت ہوں گے

اس پر مشاعرہ ایک قہقہہ زار بن گیا۔

میرے تعارف میں انھوں نے وہی بات کہی جو تھوڑی دیر قبل کہہ چکے تھے یعنی یہ کہ میں نے انہیں آج تک نہیں سُنا لیکن ان کے کلام اور پڑھنے کی تعریف سُنی ہے۔ اب سامعین ان دونوں باتوں کے بارے میں خود اپنی رائے قائم کریں گے۔ میں اس وقت نیا نیا لاہور سے آیا تھا۔ اپنا گھر اور اپنا شہر چھوڑنے کے بعد ابھی تک ایک ہی نظم کہی تھی ——— نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری ——— یہی اس وقت سُنائی۔ چند متفرق اشعار بھی ——— اب کہہ نہیں سکتا کہ سامعین نے میرے کلام اور میری شعر خوانی کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہوگی۔

والد محترم کا تعارف کنور صاحب نے بڑی محبت اور بڑے احترام سے کرایا۔ یہ بھی کہا کہ آپ ایک شرنارتھی یا مہاجر بن کے دہلی میں آئے ہیں۔ اب ہم دہلی والوں کا فرض ہے کہ ان کی آرام و آسائش کا خیال رکھیں اور انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دیں۔ واضح رہے کہ کنور صاحب اس وقت خود بھی دہلی میں ایک مہاجر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ ایک مدّت سے دہلی ہی میں سٹی مجسٹریٹ تھے لیکن ان کی لاکھوں یا کروڑوں کی جائیداد اور گھر بار منٹگمری میں تھا جو ان کی عدم موجودگی میں لٹ گیا تھا اس طرح سے کہ غم ورق ورق ہر سوئے برد باد ——— لیکن اس کے باوجود وہ انتہائی صبر و تحمل اور بردباری کے ساتھ ان تمام نقصانات کو فراموش کئے ہوئے اپنے آپ کو دہلی والا کہہ رہے تھے اور دہلی کے اہلِ قلم اور سخن شناسوں کو اس امر کی تلقین کر رہے تھے کہ محروم صاحب کو غریب الوطنی کا احساس نہ ہونے پائے۔

میں کنور مہندر سنگھ بیدی کے ساتھ اپنی اس پہلی ملاقات سے بے حد متاثر ہوا۔

والد صاحب نے اس مشاعرے میں اپنی نظم "پاکستان کو الوداع" پڑھی اور اہلِ دلّی آج بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس نظم نے سامعین پر کیا اثر کیا ہوگا۔

(۲)

اس مشاعرے میں میں نے پہلی بار کنور صاحب کا کلام سُنا اور پہلی بار مجھے معلوم

ہوا کہ ان کا تخلص سحرؔ ہے۔ کنور صاحب کو اس مشاعرے میں بے اندازہ داد ملی۔ مجھے اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی اور داد کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کا ثبوت بعد کے ان تمام مشاعروں میں ملا جن میں مجھے کنور صاحب کو سننے کا اتفاق ہوا اور ان مشاعروں کی تعداد خدا جانے کہاں تک پہنچتی ہے؟۔ آپ نے اس مشاعرے میں غزلیں بھی سنائیں، قطعات بھی اور رباعیات بھی۔ آپ کی غزلیں کلاسیکی انداز لئے ہوئے تھیں۔ رعایت لفظی و معنوی کا پورا خیال رکھا تھا۔ مضمون آفرینی تھی۔ معاملہ بندی بھی۔ گویا وہ تمام خاصیتیں موجود تھیں جو "شعرالعجم" میں علامہ شبلی نعمانی نے غزل کے لئے ضروری قرار دی ہیں۔ میں اس زمانے میں ترقی پسند سے نیا نیا متاثر ہو رہا تھا اور اپنی شاعری میں اُن شعری قواعد کی ضوابط کی پابندی بھی کر رہا تھا جو قدما نے شعر کے لئے ضروری قرار دیئے ہیں اور ان سے انحراف کی طرف بھی مائل تھا۔ گویا میں ایک طرح سے تخلیق شعر کے معاملے میں دوراہے پر تھا۔ کنور صاحب کے کلام میں مجھے زبان و بیان کا پورا احترام نظر آیا اور میں نے دیکھا کہ زبان و بیان کا احترام شعر میں کس طرح سے ایک حُسن پیدا کر دیتا ہے۔

اس مشاعرے کو آج چوتھائی صدی سے زیادہ مدت ہونے کو آئی ہے اور مجھے اتنا کہاں یاد کہ کس شاعر نے اس وقت کیا کلام پڑھا تھا لیکن ایک شعر جو سحرؔ صاحب نے اس وقت پڑھا مجھے آج بھی یاد ہے اور صرف یاد ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے (TRAIND) بھی کر رہا ہے ـــــ اور وہ شعر یہ ہے

ایک اور عمر دے کہ تجھے یاد کر سکیں
یہ زندگی تو نذرِ خرابات ہوگئی

اس مشاعرے میں جوشؔ ملیح آبادی بھی شریک تھے، بسملؔ سعیدی بھی، عرشؔ ملسیانی بھی، ساحرؔ ہوشیار پوری بھی اور وہ شعراء بھی جو ایک ایک کر کے ہم سے بچھڑتے چلے گئے مثلاً علامہ کیفیؔ دہلوی، ہری چند اخترؔ، روشؔ صدیقی، روشنؔ دہلوی طالبؔ دہلوی اور مخمورؔ دہلوی ـــ ۵

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

(۳)

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ انسان کی صحیح پرکھ اس وقت ہوتی ہے جب اس کے امتحان کا وقت آتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد یا سیکولرزم اور سوشلزم کے موضوع پر نظمیں کہنا اور مشاعروں میں جا کے یہ نظمیں سُنانا اور بات ہے اور امتحان سامنے ہو تو ان نظریات پر ثابت قدم رہنا دوسری بات۔ ہم شعراء کو اکثر اس تعلیم کے امتحان میں پڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ہم نے یہ امتحان قربانی دینے والے قومی رہنماؤں کے سپرد کر رکھا ہے خواہ وہ مہاتما گاندھی ہوں یا ابوالکلام آزاد اور خواہ جواہر لعل نہرو ہوں یا شیخ محمد عبداللہ۔ ہم نے اپنا کام یہی سمجھ رکھا ہے کہ ہمیں ان موضوعات پر صرف نظمیں ہی کہنا ہیں۔ لیکن کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ ہم شاعروں کی برادری ہی کے ایک فرد اور اس امتحان سے دوچار بھی ہو چکے ہیں ــــ اور اس امتحان میں پڑنے کے بعد اس طرح کامیاب ہوئے ہیں کہ ہندوستان کے تمام شاعر اور ادیب اس بات پر انتہائی فخر کے ساتھ سر اونچا کر سکتے ہیں کہ ہماری برادری کے ایک فرد نے اپنا وہ فرض انتہائی کامیابی کے ساتھ پورا کیا ہے جسے فرضِ انسانیت کہا جاتا ہے۔

۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم کی حدِ فاصل کھنچ چکی تھی اور پاکستان، مشرقی پنجاب اور دہلی میں انسان گاجر مولی کی طرح کٹ رہا تھا۔ میں نے یہ نقشہ راولپنڈی سے لے کر دہلی تک اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سڑکوں پر پلیٹ فارموں پر کھیتوں میں، ہر جگہ لاشوں کے انبار دیکھے تھے لیکن مشرقی پنجاب میں ایک ضلع ایسا بھی تھا ــــ کانگڑہ ــــ جہاں کا ڈپٹی کمشنر ہمارا یہی محترم شاعر دوست تھا ــــ گورو نانک دیو کے خاندان کا چشم و چراغ ــــ جس نے خدا جانے وہاں کے ہندوؤں اور سکھوں پر کیا جادو کر دیا تھا کہ بتانے والے بتلاتے ہیں سارے ضلع میں کسی مسلمان کی نکسیر بھی تو نہیں پھوٹی۔

کنور مہندر سنگھ بیدی کا یہی کردار اُس زمانے میں بھی پوری شدت کے ساتھ نمایاں رہا جب آپ دہلی میں سٹی مجسٹریٹ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپ کا گھر اور دفتر دونوں ستم رسیدوں اور مظلوموں کی پناہ گاہیں تھیں بالخصوص مسلمانوں کے دلوں میں تو آپ نے اس طرح گھر کر لیا تھا کہ ایک بار جب حکومتِ پنجاب نے اُن کو پنجاب واپس بلانا چاہا تو دہلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک وفد وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کے پاس یہ مطالبہ لے کر پہنچا کہ انہیں دہلی سے تبدیل نہ کیا جائے کیونکہ یہ شہر میں بسنے والے ستم رسیدوں کی حفاظت کے لئے ایک ضمانت ہیں خواہ وہ ستم رسیدگان ہندو ہیں سکھ ہیں یا مسلمان۔

میں سمجھتا ہوں جوش ملیح آبادی نے اپنے اس شعر میں کسی قسم کے مبالغے سے کام نہیں لیا جب انھوں نے کہا ؎

اگر نظارۂ خیر مجسّم کی تمنّا ہے
مہندر سنگھ بیدی کو تم اے اہلِ نظر دیکھو

(۴)

کنور مہندر سنگھ بیدی کے کمالِ فن اور حسنِ کردار کا ذکر اگر میں تفصیل سے کرتا چلا جاؤں تو یہ مقالہ پھیل کے ایک ضخیم کتاب بن جائے گا اور پھر اُس مقالوں کی کتاب میں نہ سما سکے گا جس کے لئے میں یہ سطور سپردِ قلم کر رہا ہوں اس لئے سوچتا ہوں کہ ذرا قلم کو تھام کے چلوں تاکہ ایسا نہ ہو یہ اپنی طوالت ہی کی بنا پر شائع ہونے سے رہ جائے ورنہ جہاں تک اس محبوب شخصیت کی ذات و صفات کے ذکر کا تعلق ہے ع

ایں نہ بحرے است کہ پایان و کنارے دارد

(۵)

تقسیم ہند کے فوراً بعد جناب و دیا شنکر آئی سی ایس کی کوششوں سے ماہنامہ "آج کل" نے دوبارہ جنم لیا اور اس شان سے کہ اپنے ساتھ "بساط عالم" اور "نونہال" کو بھی معرضِ وجود میں لے آیا۔ نہ ہوا اس وقت فیملی پلاننگ کا زور و شور ورنہ شنکر صاحب

اسی جرم میں دھر لئے جاتے کہ انھوں نے اردو کے بہ یک وقت ایک نہیں، دو نہیں تین رسالوں کا وجود ہندوستان میں مسلّط کر دیا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ آج جس شخص کو اردو یا مسلمانوں کا دشمن قرار دیا جاتا ہے —— سردار پٹیل۔ اسی کی سرپرستی میں ودیا شنکر نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔

آج جب اتنی مدّت بعد میں ۴۸ء پر ایک نگاہِ پس انداز ڈالتا ہوں تو ایسا نظر آتا ہے کہ "آج کل" ایک ماہنامہ نہیں تھا بلکہ ایک ادارہ تھا۔ ایک انجمن تھی۔ ایک دور تھا جو گزر گیا۔ ایک محفل تھی جو برہم ہو گئی۔ اس محفل میں کئی شخصیتیں اپنی اپنی جگہ پر جانِ محفل کی حیثیتیں رکھتی تھیں —— جوش ملیح آبادی جن کی یاد آتی ہے تو آج بھی اقبال کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

اے کہ نزدیک تر از جانی و پنہاں زنگہ
ہجر تو خوشتہ آمد نہ وصالِ دیگراں

ودیا شنکر آئی سی ایس جن کی دلکش زبان و بیان اور نکتہ آفرینی کی بدولت بات میں بات پیدا ہوتی چلی جاتی تھی۔ شنکر پرشاد آئی سی ایس جن کی گفتگو بیک وقت شمیم گل اور نوکِ نشتر کا انداز رکھتی تھی۔ ودیا شنکر کی طرح شنکر پرشاد کے اکثر جملے آج بھی "باقیات الصالحات" کی زبانوں پر ہیں۔ کبھی کبھی جب میں اور بسمل سعیدی ملتے تھے تو ان جملوں کو یاد کر کے ایک دوسرے کو ہنساتے بھی تھے اور رُلاتے بھی تھے —— ع

کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی

—— اور ان تمام شخصیتوں کے ساتھ ہی ساتھ جو شخصیت شمعِ محفل بھی تھی اور پروانۂ محفل بھی وہ مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت تھی۔ آپ اس محفل کو برقرار رکھنے کے لئے وقت، روپیہ اور رسوخ میں سے کسی کو استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے —— مجھے اس زمانے میں اکثر ڈر رہتا تھا کہ کہیں اس محفل کو نظر نہ لگ جائے —— لیکن نظر کا کیا سوال —— گردشِ ایّام اپنی جگہ پر ایک اٹل حقیقت ہے۔ اُسی زمانے میں

میں نے ایک شعر کہا تھا۔

محفل جمی ہوئی ہے تری راہ میں کہیں
اے گردشِ زمانہ بس اتنا خیال کر

اور حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ سب سے پہلا حادثہ تو یہ ہوا کہ جوشؔ پاکستان چلے گئے۔ گویا اس قصرِ نشاط کے بنیادی پتھروں میں سے ایک پتھر ہل گیا۔ اس کے باوجود یہ محفل دہلی میں جمی رہی اور غالباً آج بھی اسی طرح سے شاد و آباد ہے لیکن چونکہ میں آج دہلی سے اور اس انجمن سے دور ہوں اس لئے مجھ پر ایک طرح سے "من مُرد۔ جہاں مُرد" کی سی کیفیت طاری ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس محفل کی کشش نے مجھے کتنی بار سری نگر سے دہلی کھینچا اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں جاتے ہوئے یا واپس آتے ہوئے کتنی ہی بار یہ محفل میرے لئے زنجیرِ پا بنی۔ خدا کرے یہ محفل ہمیشہ شاد و آباد رہے اور اس محفل کو شاد و آباد رکھنے والے جن میں مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے ہمیشہ زندہ و پائندہ رہیں ــــ ع

این دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

تو میں ۱۹۴۸ء کا ذکر کر رہا تھا۔ "آج کل" کا دفتر جوشؔ صاحب کی وجہ سے مرقعِ خاص و عام تھا۔ سردار جعفری جب کبھی جیل سے باہر ہوتے تھے اکثر دہلی کا اور اس کے ساتھ ہی "آج کل" کے دفتر کا طواف کیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ جاں نثار اختر، ظ۔ انصاری، معین احسن جذبی آل احمد سرور، احتشام حسین، جعفر علی خان اثر، مخمور لکھنوی، ڈاکٹر عبد العلیم، ڈاکٹر اعجاز حسین یہ سب احباب اگر دہلی آتے تھے تو "آج کل" کے دفتر میں حاضری ضروری سمجھتے تھے۔ ساحر لدھیانوی ابھی دہلی ہی میں تھے "شاہراہ" کی ادارت کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے سردار، جذبی، ساحر، جاں نثار اختر۔ "آج کل" کے دفتر میں جمع تھے۔ مجاز مرحوم بھی موجود تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی بھی۔ شعر و شاعری اور خوش گپیوں کا دور چل رہا تھا کہ عرش ملسیانی نے جو "آج کل" کو مرتب کرتے تھے یہ تجویز پیش کی کہ آج جو شعراء یہاں جمع ہیں اُن کا ایک گروپ فوٹو لیا جائے جو "آج کل" اور "شاہراہ" دونوں میں چھپے۔ یوں اس تجویز میں کوئی

خرابی نہیں تھی لیکن دراصل یہ دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا اور شعراء اور ادیب فکری اعتبار سے دو حصّوں میں منقسم تھے۔ ایک وہ جو ترقی پسند تحریک میں شامل تھے اور دوسرے وہ جو شامل نہیں تھے۔ چونکہ اردو کے اکثر ادیب اور شاعر مثلاً سردار جعفری، غلام ربانی تاباں، وامق جونپوری، خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ قید وبند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے اس لئے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے دلوں میں حکومت اور اہلِ حکومت کے خلاف ایک جذبہ موجود تھا اور اس جذبے کا اظہار کئی طریقوں سے ہوتا رہتا تھا۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ ترقی پسند رسالوں اور جریدوں میں ان شاعروں اور ادیبوں کے مضامین نظم ونثر نہیں چھاپے جاتے تھے جو تحریک کے نقطۂ نگاہ سے حکومت کے ساتھ تھے۔ اس زُمرے میں آنند نرائن ملاّ بھی آتے تھے (جو الہ آباد ہائی کورٹ کے جج تھے) صدیق حسن آئی سی ایس بھی (جو آگرے میں کمشنر تھے) حبیب احمد آئی سی ایس بھی (جو غالباً اتر پردیش میں پبلک سروس کمیشن کے چیرمین تھے) ذوالفقار آئی اے ایس بھی (جو لکھنؤ میں کین کمشنر تھے) سیّد حامد آئی۔اے۔ایس بھی (جو اس زمانے میں میرٹھ کے ڈپٹی کمشنر تھے) اور مہندر سنگھ بیدی آئی۔اے۔ایس بھی (جو دہلی کے سٹی مجسٹریٹ تھے)۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی، سکندر علی وجد، سلام مچھلی شہری اور راقم التحریر کس زمرے میں تھے۔ جوشؔ صاحب کی تو خیر بات ہی الگ تھی۔ انھوں نے تو "معصومیت" کا ایسا لبادہ اوڑھ رکھا تھا کہ جواہر لعل نہرو ہوں یا سردار پٹیل ہوں یا ڈانگے ہوں سب انہیں "شاعر" ہی سمجھتے تھے (۔۔۔ ویسے انہیں "شاعر انقلاب" کا لقب غالباً ترقی پسند تحریک ہی نے دیا تھا۔۔۔) لیکن تین شعراء کے بارے میں صحیح یا غلط خیال یہ تھا کہ FELLOWTRAVELLERS ہیں چنانچہ ہم تینوں کے کو اگرچہ ترقی پسندوں نے اپنا کبھی نہ سمجھا لیکن ہمارے ساتھ وہ سلوک بھی نہ کیا جو ہماری ہی برادری کے بعض دوسرے شعرا کے ساتھ کیا۔

تو عرش صاحب نے جب گروپ فوٹو کی تجویز پیش کی تو یہ تجویز سردار جعفری اور جذبی کو پسند نہ آئی۔ انہیں جوش کی، عرش کی اور میری شرکت پر اعتراض نہ تھا۔ بلونت سنگھ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اُن پر بھی انہیں اعتراض نہ تھا بلکہ بلونت سنگھ کو وہ مجھ سے بھی

اپنے زیادہ قریب سمجھتے تھے لیکن ایک سٹی مجسٹریٹ کی تصویر میں موجودگی انہیں گوارہ نہ تھی۔ اور سٹی مجسٹریٹ بھی ایسا جو خاصی حد تک براہ راست سردار پٹیل کی نگرانی میں کام کر رہا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ سردار پٹیل چونکہ ہوم منسٹر تھے اور شاعروں اور ادیبوں کا خیال میں تمام گرفتاریاں ہوم منسٹری یا ریاستوں کے ہوم ڈیپارٹمنٹوں کے حکم سے ہوتی تھیں۔ اس لئے ترقی پسند تحریک کے تمام حامی سردار پٹیل کو بالخصوص ناپسند کرتے تھے۔ سنجیدہ بات ہو رہی ہو یا ہنسی مذاق کی سردار پٹیل کو ہدفِ ملامت بنانا ترقی پسند ادیبوں کا شیوہ تھا[1]۔

بہر طور جذبی اور سردار نے اس خیال کا اظہار دبی زبان سے کیا۔ کنور صاحب تک یہ بات نہ پہنچی ــــ اور اس وقت تک جذبی یا سردار یا ساحر کنور مہندر سنگھ بیدی کے محاسن سے غالباً پوری طرح آشنا بھی نہ تھے ــــ نتیجتہً سردار تو عین فوٹو کے وقت اِدھر اُدھر ہو گئے۔ معلوم نہیں کہاں چلے گئے۔ جذبی شریک ہوئے لیکن انتہائی کیفیتِ انقباض میں۔ بعد میں انھوں نے ساحر کو یہ مشورہ دیا کہ یہ فوٹو "آج کل" میں چھپے تو چھپے اسے "شاہراہ" میں نہ چھاپنا۔ غالباً ساحر نے حامی بھی بھر لی لیکن دوسرے دن ایک محفل میں جس میں باہر کے یہ تمام شعراء موجود تھے کنور صاحب کی غیر حاضری میں جب ان کا تذکرہ چھڑا اور جوش ملیح آبادی اور دوسرے احباب نے کنور صاحب کے متعدد کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالی تو شعراء حضرات یہ تمام باتیں سن کے ہکّا بکّا رہ گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ جو تصویر محض ایک سٹی مجسٹریٹ کی موجودگی کی وجہ سے رد ہو چکی تھی اور اس قابل نہ تھی کہ اسے "شاہراہ" میں چھاپا جائے وہ کنور مہندر سنگھ بیدی کی

---

[1] ایک دفعہ کا ذکر ہے ساحر لدھیانوی بمبئی سے دہلی آئے اور دہلی کیشنرز ڈویژن میں مجھ سے ملنے کے لئے بھی آئے۔ میرے ہی کمرے کی بات ہے۔ وہ بیٹھے تو میں نے چائے منگوائی۔ ساتھ ہی کھانے کے لئے کوئی نمکین چیز بھی آ گئی۔ ساحر نے چائے پیتے ہوئے کہا کہ یہ نمکین تم کھاؤ تم سردار پٹیل کی منسٹری میں کام کرتے ہو اور میں سردار پٹیل کا نمک خوار نہیں بننا چاہتا۔

ذات کی بدولت "مردود" سے "مقبول" ہو گئی اور ساحر نے اسے بڑے اہتمام سے "شاہراہ" میں چھاپا۔

(۶)

اس وقت میں یہ مقالہ سری نگر سے دور ایک تنہا اور پُر فضا مقام پر بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں۔ کنور صاحب کا مجموعۂ کلام یا کوئی ایسا ماہنامہ میرے سامنے نہیں ہے جس کی مدد سے میں اس مقالے کو اُن کے اشعار سے مزین کر سکوں چنانچہ میں دو ایک واقعات کا ذکر کے اسے ختم کروں گا۔ لیکن ان واقعات سے پہلے یہ بتا دینا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو فی البدیہہ شعر کہنے میں جو مہارت حاصل ہے وہ بہت کم شاعروں کو حاصل ہو گی۔ ایک زمانہ تھا کہ بدیہہ گوئی کو فنِ شعر گوئی کا ایک کمال سمجھا جاتا تھا۔ آج اقدار بدل گئی ہیں لیکن اقدار کے بدل جانے سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی۔ شعر و ادب میں گہری نگاہ رکھنے والوں کے نزدیک بدیہہ گوئی آج بھی ایک کمالِ فن کی حیثیت رکھتی ہے۔

مجھے یاد ہے ایک بار کنور مہندر سنگھ بیدی کے ساتھ ان کی گاڑی میں جوش ملیح آبادی، بسمل سعیدی، بسمل شاہجہان پوری اور میں انڈیا گیٹ کی سیر کو نکلے۔ گاڑی میں شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک شاعر مصرع دیتا تھا باقی اس پر گرہ لگاتے تھے۔ اور یہ صورتِ حال اس شدّت سے جاری رہی کہ واپسی تک دو تین غزلیں اور کئی قطعات مکمل ہو چکے تھے۔ ان شاملاتی غزلوں اور قطعات میں کنور صاحب کا بھرپور حصّہ تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے ساری رودادِ سفر کو سمیٹتے ہوئے ایک مقالہ لکھا تھا جس میں ہر مصرعے اور ہر شعر کے ساتھ شاعر کا نام درج کیا تھا۔ یہ مقالہ دہلی کے ایک ہفتہ وار اخبار میں چھپا تھا۔ یہ مخصوص شمارہ بھی ان پانچ ہزار سے زائد کتب اور جرائد میں شامل تھا جو سری نگر آنے سے قبل میں دہلی میں چھوڑ کے آیا تھا۔ دیمک نے ان کتابوں کو صفحۂ ہستی ہی سے نابود کر دیا۔ اب کہاں کا مقالہ اور کہاں کا شمارہ ؎

دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم!

(۷)

چیمسفورڈ کلب میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے ایک نامور شاعر نے جو شراب کے نشے میں دھت تھے بوتل کا زیادہ تر حصّہ ختم کرنے کے بعد مائکروفون پر آکر اناپ شناپ شروع کردی۔ اس اناپ شناپ کی تان کنور مہندر سنگھ بیدی ہی پر آکر ٹوٹتی تھی۔ کنور صاحب ہی اس مشاعرے کو کنڈکٹ کر رہے تھے۔ اس نامور شاعر کی "عالمانہ بات چیت" مشاعرے میں موجود ہر شاعر اور ہر سامع کو ناگوار گذر رہی تھی اور یہ بھی بعید نہیں تھا کہ اس شاعر کو مائکروفون سے ہٹا دیا جاتا لیکن کنور صاحب نے اپنی روائتی بردباری سے کام لیتے ہوئے اُسے اجازت دے دی کہ جو جی میں آئے کہے چلے جاؤ۔ آخر وہ شاعر صاحب جب اپنی تقریر بازی سے خود ہی تھک گئے تو مائک چھوڑ کر ڈائس سے نیچے آگئے۔

یہ شاعر میرے ہی مہمان تھے۔ صبح کو جب بیدار ہوئے تو اُنہیں رات کی بات یاد آئی۔ مجھ سے پوچھنے لگے "رات کو میں نے کیا کہا تھا؟" میں نے بتایا کلب میں جب یہ واقعہ ہوا میں اس وقت موجود نہیں تھا۔ ہم چند شعراء اس وقت پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر سجاد حیدر کے گھر میں تھے۔ وہاں سے مشاعرہ گاہ میں پہنچے تو پتہ چلا کہ قیامت گزر چکی ہے۔

میں نے دیکھا کہ میرے مہمان شاعر بہت عالمِ تاسف میں ہیں اور تاسف انہیں اس بات کا نہیں تھا کہ شراب پی کے بھری بزم میں اُنھوں نے ناشائستہ باتیں کی ہیں۔ انہیں اندیشہ یہ تھا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی ان سے خفا ہو جائیں گے اور انہیں آئندہ مشاعرے میں نہیں بلائیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اس ضمن میں بالکل مشوش نہ ہوں۔ اس واقعے کا چاہے کنور صاحب نے کوئی بھی اثر لیا ہو اس کا یہ نتیجہ کبھی نہیں نکلے گا کہ آپ سے اس طرح انتقام لینے کی کوشش کریں۔

چنانچہ چند ماہ بعد جب چیمسفورڈ کلب میں ایک اور مشاعرے کی داغ بیل پڑنے لگی تو کنور صاحب نے ساری مینجنگ کمیٹی کی مخالفت کے باوجود سرفہرست اسی شاعر

کا نام لکھا اور پورے احترام کے ساتھ اُسے دعوت دی۔

یہ تحمّل اور بردباری کنور مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت اور شاعری دونوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔ ہند و پاک جنگ کے موضوع پر ان کی نظموں کا مرکزی خیال یہی ہوتا ہے اور اس ضمن میں وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زندگی کا وہ واقعہ جس میں ایک پہلوان حیدر کرّار سے شکست کھانے کے بعد ان کے روئے مبارک پر تھوکنے کی گستاخی کرتا ہے اکثر سناتے ہیں اور فخر سے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ اس معاملے میں حضرت علیؓ کا تتبع عروجِ آدمیت ہے۔

اس موضوع پر کہی ہوئی ان کی نظموں کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان میں کہیں بھی پاکستان یا اہل پاکستان کے خلاف غصّے یا نفرت کے جذبے کا شائبہ تک نظر نہیں آتا بلکہ جہاں تک پاکستانی عوام کا تعلق ہے یہ نظمیں خلوص ومحبّت کے چھلکتے ہوئے پیمانے نظر آتے ہیں۔ ہاں ان نظموں کا خالق اس استبدادی نظامِ حکومت پر ضرب کاری لگانے سے نہیں چوکتا جس نے دنیا کے طول وعرض میں جنگ وجدل کو عام کر رکھا ہے۔

میں نے مہندر سنگھ بیدی کی صدارت میں سینکڑوں مشاعرے پڑھے ہوں گے اور سینکڑوں محفلوں میں ان کے ساتھ خوش گپیاں کی ہوں گی۔ ہر مشاعرے اور ہر محفل میں انہیں جانِ مشاعرہ اور جانِ محفل ہی پایا ہے۔ اردو کے ساتھ ان کی محبّت عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے۔ اردو کا مقدّمہ وہ آج بھری محفلوں میں جس خلوص اور جوش وخروش کے ساتھ پیش کرتے ہیں اُسی خلوص اور جوش وخروش کے ساتھ اس وقت بھی پیش کرتے تھے جب وہ سٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کمشنر کے عہدوں پر فائز تھے۔ اعلائے کلمۃ الحق آپ کے لئے محض ایک اصول ہی نہیں بلکہ وقیعِ زندگی اور طرزِ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں نے کنور صاحب کو ہندوستان کے مشاعروں میں بھی دیکھا ہے اور

پاکستان کے مشاعروں میں بھی اور دونوں جگہ ان کی مقبولیت پورے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس مقبولیت میں شاعری اور شخصیت کے اُن تمام اجزاء کو دخل ہے جو کنور مہندر سنگھ بیدی نام کے انسان کی تشکیل میں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ اور تحلیل ہو چکے ہیں کہ ان تمام کا الگ الگ تجزیہ کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اور اس تجزیئے کی کاوش میں ایک ایسی جامع الصّفات شخصیت نظر کے سامنے اُبھرتی ہے جو ہندوستان اور پاکستان کے طول و عرض میں ایک منفرد اور محبوب نام سے جانی اور پہچانی جاتی ہے اور وہ نام ہے ——— "کنور صاحب"۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

محبتوں کا پیامبر۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

کچھ لوگ بڑے ہوتے ہیں، لیکن شاعر بُرے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ شاعر بڑے ہوتے ہیں لیکن انسان بُرے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، اور جو شاذ ہوتے ہیں کہ شاعر بھی اچھے ہوتے ہیں اور انسان بھی اچھے ہوتے ہیں۔ ایسے 'شاعر انسان'، جنھیں دیکھ کر محبّت کی مہک آنے لگتی ہے اور خُلوص کی کلی نسیمِ سحر سے کِھل اٹھتی ہے اور ساری فضا موتیا، چنبیلی اور رات کی رانی کی خوشبو سے مہکنے لگتی ہے۔ برِ صغیر کے حوالے سے اگر ایسے لوگوں کی فہرست بنائی جائے تو میرا خیال ہے کہ فہرست بنانے والے کو خاصی دشواری پیش آئے گی، لیکن مجھے یقین ہے کہ اس فہرست میں بلکہ سرِ فہرست جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کا نامِ نامی ضرور شامل ہوگا اور نہ صرف شامل ہوگا بلکہ ہر کس و ناکس اس نام پر صدقِ دل سے اتفاق بھی کرے گا۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی شخصیت میں یقیناً ایک ایسا سحر ہے کہ جو ان سے ملتا ہے وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور ساری عمر کے لیے ان کو گلے لگا کر ان کے گلے لگ جاتا ہے۔ بیدی صاحب نے ان کو بھی ساری عمر نبھایا ہے جو ایک بار گلے لگ کر ان کے گلے پڑ گئے اور ان کو بھی جو نہ کبھی گلے لگے اور نہ گلے پڑے بلکہ صرف انسانی محبّت کے

تعلق سے انھوں نے ان کی دل سے مدد کی۔ بیدی صاحب کی شخصیت کا نمایاں پہلو محبت ہے اور یہی ان کا پیغام ہے۔ محبت ان کی زندگی کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اور اسی لیے، خواجہ میر درد کی زبان ہیں، محبت گلشن دل را بہار است "ان کی زندگی کا راہنما اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی صاحب مجھے عزیز ہیں۔ ایسے عزیز کہ جن کی شخصیت کا جادو پہلی ہی ملاقات میں دل کو موہ لیتا ہے۔ "یادوں کا جشن" پڑھ کر ان کی شخصیت کے وہ چھپے ہوئے گوشے بھی سامنے آ گئے جن سے میں اب تک ناواقف تھا اور میری محبت کے جذبے میں مزید گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی۔ خدا سحر صاحب کو خوش رکھے اور صحت کے ساتھ بہت لمبی عمر دے تاکہ یہ اپنے جدِ اعلیٰ بابا گرونانک کے پیغامِ محبت کو برسوں اسی طرح پھیلاتے اور آگے بڑھاتے رہیں۔

"یادوں کا جشن" ایک اچھے ناول کی طرح ایک ایسی دلچسپ کتاب ہے کہ جسے آپ شروع کرتے ہیں تو ختم کیے بغیر بند نہیں کرتے۔ میں نے سفرِ لاہور کے دوران اس کا مطالعہ شروع کیا اور فرصت کے وقت میں سفرِ واپسی تک ۴۲۹ صفحات کی یہ کتاب ختم ہو گئی۔ میں تیز ضرور پڑھتا ہوں لیکن اگر کوئی کتاب میں کچھ نہ ہو تو اسے پڑھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک سطر دوسری سطر سے مختلف ہے۔ اس میں اختصار بھی ہے اور بیان کی روانی بھی۔ زندگی کی رنگا رنگی کی طرح ایک ایسا تنوع ہے کہ اسے آپ ایک دلچسپ داستان کی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کی داستانِ حیات ہے جس نے کھُل کر سچ بولا ہے اور جس نے اپنے آپ کو فرشتہ بنانے کے بجائے پوری طرح انسان رہنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شکاری بھی ہیں شاعر بھی۔ سرکاری افسر بھی اور بڑے زمیندار بھی۔ وہ گھوڑ سوار بھی ہیں اور باز اور شکروں کے رسیا بھی۔ غریبوں کے ہمدرد بھی ہیں اور امیروں کے دوست بھی۔ دوسروں کے دکھ درد میں شریک بھی ہوتے ہیں اور دوسروں کو اپنے دکھ درد میں شریک بھی کرتے ہیں۔ وضع داری اور شرافت ان کی زندگی ہے اور دلِ دردمند کی دھڑکن روحِ حیات ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندو مسلم فسادات نے سارے

براعظم کو پاگل کر دیا تھا ان کا دل تعصب و نفرت کے جہنم سے پاک تھا۔ دہلی میں رہ کر بیدی صاحب نے جو اس شہر کی خدمت کی اور جس طرح مسلمانوں کو اس نفرت کی آگ سے نکالا وہ مجھ تک قصہ کہانی بن کر پہنچا ہے۔ شاہد احمد دہلوی بھی اس کے گواہ تھے اور خواجہ حسن نظامی بھی۔ مُلّا واحدی بھی اور مولانا رازق الخیری بھی۔ اب کوئی بھی نہیں ہے لیکن بیدی صاحب کی انسان دوستی آج بھی مینارۂ نور بنی ہوئی ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے "یادوں کا جشن" میں لکھا ہے جس سے اس دور کی بربریت کی ایک تصویر سامنے آجاتی ہے۔ میں یہاں ان سب واقعات کا اعادہ تو نہیں کر سکتا لیکن ایک آدھ واقعے کی طرف آپ کی توجہ ضرور دلاؤں گا۔ بیدی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے "ہری پور گلیر کانگڑہ ضلع میں ایک جاگیردار کا ٹھکانہ ہے۔ وہاں کے ہسپتال میں ایک مسلمان کمپونڈر رہتا تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو اس کے سارے کنبے کو پکڑ لیا گیا۔ اس کی لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اس لڑکی پر ان لوگوں کے درمیان تکرار ہو گئی ــــ لڑکی نے کہا کہ جس سے آپ کہیں میں شادی کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ میرے والدین اور دوسرے کنبے کو حفاظت سے رفیوجی کیمپ میں پہنچا دیں۔ یہ شرط منظور کر لی گئی۔ اور اس کمپونڈر کو اس کے باقی ماندہ کنبے سمیت رفیوجی کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ مگر لڑکی کے بارے میں یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ اس سے کون شادی کرے۔ جب یہ تکرار ایک خطرناک جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی تو ایک شخص اٹھا اور تلوار سے لڑکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کہا کہ لو اب سب ایک ایک ٹکڑا بانٹ لو" (ص ۱۲۱)

کنور مہندر سنگھ بیدی ساری عمر اسی بربریت، حیوانیت اور ظلم کے خلاف صف آرا رہے اور یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو انسانیت پر یقین رکھتا ہو اور تعصب سے اس کا دل پاک ہو۔ اس کتاب میں بے شمار ایسے واقعات ہیں جن سے انسان اپنی زندگی پر نظرِ ثانی کر سکتا ہے اور بہتر زندگی گذارنے کا سلیقہ سیکھ سکتا ہے۔ ایک بات جس کا ذکر میں ضرور کرنا چاہوں گا وہ جوشؔ ملیح آبادی مرحوم کے سلسلے میں ہے۔ جوشؔ نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ جوشؔ کو یہاں جو کچھ بھی نقصان

پہنچا وہ ان کے ان دوستوں سے پہنچا جن کے بارے میں غالب نے کہا تھا "ہوئے تم دوست جس کے اُس کا دشمن آسماں کیوں ہو۔" جوشؔ صاحب جب آخری بار ہندوستان گئے تو ان کے خلاف یہاں طرح طرح کی خبریں اخباروں میں چھپیں۔ بیدی صاحب ان سب باتوں کے عینی شاہد ہیں۔ انھوں نے اس واقعہ پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ "آخری بار جب جوشؔ ہندوستان آئے تو ان کے ایک شاعر دوست بھی ہمراہ تھے۔ وہ سائے کی طرح جوشؔ صاحب کے ساتھ رہتے اور جہاں بھی مشاعروں میں جوشؔ صاحب جاتے وہاں انہیں بھی مدعو کیا جاتا۔ دہلی میں بھی وہ آگرہ ہوٹل میں جوشؔ صاحب کے ساتھ مقیم رہے۔ میری جانب سے ہر روز جوشؔ صاحب کے لیے ایک بوتل شراب اور موتی محل سے کھانا پہنچ جاتا تھا۔ لیکن جب جوشؔ صاحب ملیح آباد وغیرہ اپنے احباب سے ملنے گئے تو ان کے شاعر دوست دہلی میں ہی رہے اور ہر روز شراب کی دوکان سے جوشؔ صاحب کے نام پر ایک بوتل شراب کی لاکر بازار میں فروخت کرتے رہے۔ جب دوکان دار نے بل پیش کیا تو اس بات کا پتہ چلا مگر میں نے دیدہ و دانستہ جوشؔ صاحب سے اس کا ذکر نہیں کیا تاکہ دوستوں میں کدورت نہ پیدا ہو جائے۔ اسی دوست نے موقع پا کر بمبئی میں جوشؔ صاحب کی جیب سے چار ہزار روپے نکال لیے۔ اس پر جوشؔ صاحب نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی لیکن جب دہلی واپس آئے تو بسمل سعیدی ٹونکی کی منت سماجت کرنے پر اسے معاف کر دیا۔ مگر ستم ظریفی دیکھئے کہ اس دوست نے جوشؔ صاحب کے احسانات کا بدلہ یہ دیا کہ بارڈر عبور کرنے کے فوراً ہی بعد ان سے الگ ہو گیا اور ان کے خلاف حکومتِ پاکستان سے بے بنیاد اور غلط شکایتیں کیں جن کی بنا پر جوشؔ صاحب کو ملازمت سے الگ کر دیا گیا۔"

"جہاں تک مجھے علم ہے جوشؔ صاحب کے خلاف جو شکایتیں کی گئی تھیں ان میں سے ایک تو یہ تھی کہ انھوں نے بمبئی میں ایک اخباری انٹرویو میں پاکستان کے خلاف زہر اگلا۔ اتفاق سے میں بھی اس وقت موجود تھا۔ اور یہ انٹرویو ط۔ انصاری

نے سید وبھائی کے گھر لیا تھا۔ اس سارے انٹرویو کے دوران میں جوؔش صاحب نے ہندوستان سے محبّت کا ضرور اظہار کیا لیکن پاکستان اور پاکستان کی حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔" (ص ۲۳۶)

اس سے ساری صورتِ حال صاف ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

ایک اور واقعہ انھوں نے لکھا ہے کہ جب وہ سنگرور کے ڈپٹی کمشنر تھے تو "تھمایا کمانڈر انِ چیف وہاں تشریف لائے۔ ضلع والوں نے ان کا شاہانہ استقبال کیا۔ رات کو میرے یہاں کھانا تھا جس میں شمالی ہندوستان کے تمام بڑے بڑے فوجی اور سول افسران موجود تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتے ہوتے سیاست پر تبصرہ شروع ہو گیا۔ جنرل تھمایا موڈ میں تھے فرمانے لگے کہ ان سیاست والوں نے اتنے عظیم ملک کا بیڑہ غرق کر دیا ہے جی چاہتا ہے کہ یہاں فوجی حکومت قائم کر کے مارشل لا لگا دیا جائے تاکہ ملک کو سیاستدانوں کی پیدا کی ہوئی گندگی سے پاک کیا جا سکے اور اگر میں ایسا کرنا چاہوں تو دو گھنٹے میں کر سکتا ہوں لیکن میں نے آئین کی وفاداری کا حلف لیا ہوا ہے۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔ سب ان کی اس صاف گوئی پر حیران ہوئے۔" (ص ۱۶۸)

اسی طرح بسمؔل شاہجہان پوری کے بارے میں بھی بعض دلچسپ واقعات درج کئے ہیں جو آپ سب کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ بیدی صاحب نے لکھا ہے کہ

"ساحر ہوشیار پوری، مجھے اور بسمل صاحب کو علی گڑھ مشاعرہ میں شریک ہونا تھا۔ میں ان دنوں سٹی مجسٹریٹ تھا اور بسمل میرے باڈی گارڈ یعنی گن مین لگے ہوئے تھے لیکن اس مشاعرے میں وہ ایک شاعر کی حیثیت سے شریک ہونے جا رہے تھے۔ یہ طے ہوا کہ سب لوگ میری کوٹھی واقع نیس ہزاری پر چار بجے شام تک پہنچ جائیں۔ وہاں سے بھگوان سنگھ ٹیکسی ڈرائیور کی اسٹیشن ویگن میں ہم سب علی گڑھ کے لیے روانہ ہوں گے۔ بسمل کے علاوہ سب وقت مقررہ پر میرے ہاں پہنچ گئے۔ چونکہ ہم لیٹ ہوتے جا رہے تھے اس لئے بسمل صاحب کے گھر پہنچے جو بارہ ہندو راؤ میں تھا۔ جب ہم ان کی گلی کے سامنے پہنچے تو وہ اپنے مکان کے سامنے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ ہم نے فوراً آنے

کے لیے کہا تو ہاتھ سے اشارہ کر کے گھر میں داخل ہو گئے اور دس بارہ منٹ کے بعد آمد ہوئے۔ ہم سب نے لعن طعن کی اور کہا کہ ہم تو پہلے ہی لیٹ ہو چکے تھے آپ نے اور لیٹ کر دیا تو نہایت سنجیدگی سے فرمانے لگے کہ دراصل معاملہ یہ تھا کہ ہر مسلمان شوہر کا فرض ہے کہ اگر شہر سے کہیں باہر سفر پر جائے تو جانے سے پہلے اپنی بیوی کا "حق زوجیت" ادا کر کے جائے۔ ہمیں ہنسی تو بہت آئی مگر ضبط کر کے کہا کہ اگر ایسا ہی تھا تو آپ یہ حق زوجیت پہلے ہی ادا کر دیتے۔ خواہ مخواہ ہمیں لیٹ کر دیا۔ تو فرمانے لگے کہ میری بیوی دوسرے محلے میں گئی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں خاص طور پر اسی لیے بلوایا کہ وہ حق زوجیت وصول کر لیں۔ لیکن انھوں نے آنے میں دیر کر دی۔ حقِ زوجیت ادا کرنے میں تو صرف آدھا منٹ لگا باقی وقت غسل کرنے میں لگ گیا۔ تمام راستہ بسمل صاحب سے حق زوجیت کے مسئلے پر مذاق ہوتا رہا۔ وہ مختلف دلائل سے اپنے اس عمل کو جائز بتاتے رہے۔ علی گڑھ تک کا سفر بڑی آسانی سے کٹ گیا۔" (ص ۳۲۸ تا ۳۲۹)

غرض کہ یہ ایک ایسی دلچسپ کتاب ہے جس سے نہ صرف ہمارے ماضی قریب کے حالات پر گہری روشنی پڑتی ہے بلکہ بعض اہم شخصیات سے بھی ہم اس طرح متعارف ہوتے ہیں جس طرح ہم اس سے پہلے نہیں تھے۔ اس کتاب کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن چونکہ مضمون پہلے ہی بہت طویل ہو گیا ہے اس لیے مناسب ہے کہ میں بیدی صاحب کو ایک ایسی کتاب لکھنے پر دلی مبارک باد پیش کروں اس سے قبل کہ میں سلامِ رخصت کر کے اجازت چاہوں میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ بیدی صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اور حضرت رئیس امروہوی نے پاکستان میں اور جسٹس کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کمیٹی نے ہندوستان میں یہ کتاب چھاپ کر اُردو زبان کی خود نوشت سوانح عمریوں میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

عابد علی خاں

دوستوں کے دوست بیدی صاحب

جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب ہمارے ایک ممتاز شاعر اور اردو تحریک کی ایک ایسی قد آور شخصیت ہیں جن کا ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں مساوی احترام ہوتا ہے۔ لیکن پاکستان نے کنور صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ہم پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ کنور صاحب کی سوانح عُمری "یادوں کا جشن" پاک اورینٹل پبلیکیشنز کراچی نے شائع کی ہے۔ اور اب اس کا ہندوستانی ایڈیشن اضافہ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ کتاب بہت خوبصورت ہے اور کنور صاحب کی سوانح صرف ان کی اپنی یادیں ہی نہیں ہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ عصری ادبی تاریخ ہے۔ کنور صاحب کشمیر سے دکن تک حد درجہ قابلِ احترام ہیں اور ادیبوں شاعروں و فنکاروں کے دوست اور عوام کے محبوب ہیں۔ ان کی تصنیف میں کئی ادیبوں اور شاعروں کے تذکرے ہماری موجودہ ادبی سرگرمیوں اور اردو تحریک کا ایک اہم جز ہے - "یادوں کا جشن" ایک اعلیٰ عہدہ دار ایک ادیب ایک باغ و بہار شخصیت کے ایسے تاثرات ہیں جس سے مشترکہ تہذیب کی جھلک ملتی ہے۔ اگرچہ یہ تہذیب اب کمزور ہو رہی ہے۔ مگر کتاب بتلاتی ہے کہ اس تہذیب کی بقا کے لئے کنور صاحب نے اپنا تن من دھن سب کچھ لگا دیا ہے اور اردو کے کاز کو بڑی تقویت بخشی ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی

سحر صاحب سے حیدر آباد تین دھون سے واقف ہے۔لسانی ریاستوں کے قیام سے قبل ڈاکٹر زور نے انہیں زحمتیں دی تھیں۔آندھرا پردیش کی تشکیل کے بعد وہ کئی مرتبہ ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں تشریف لائے۔زندہ دِلان کی محفل میں شرکت کی۔حیدر آباد ان کا بڑا احترام کرتا ہے وہ مشاعروں میں بہت شوق سے سُنے جاتے ہیں اور داد و تحسین لُوٹتے ہیں۔

اپریل کی بات ہے اقبال عالمی مشاعرہ میں پاکستان اور برطانیہ کے کئی ممتاز شعراء بھی شریک تھے سب تحت اللفظ پڑھنے والے تھے۔ناظم مشاعرہ ملک زادہ منظور احمد نے کہا اس مرتبہ مشاعرہ میں ترنم کے شاعر نہیں ہیں۔حیدر آباد میں ترنم کو پسند کیا جاتا ہے مگر حیدر آباد میں اقبال کی یاد میں منعقدہ اس مشاعرہ میں پہلی مرتبہ تحت اللفظ مشاعرہ ہو رہا ہے جن شعراء نے خوب داد حاصل کی اور مشاعرہ کو کامیاب بنایا ان میں حضرت کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا نام سرِ فہرست تھا۔بیدی صاحب کو کلام سنانے پر اتنا مجبور کیا گیا تھا کہ کنور صاحب نے اس پر ایک بوڑھی عورت کا لطیفہ سنایا۔ایک کانسٹیبل نے سڑک پار کرتی ہوتی بوڑھی عورت سے کہا عجیب ہو میں بار بار سیٹی بجا رہا ہوں اور تم سنتی نہیں ہو اس پر بوڑھی نے جواب دیا جوانی میں تو پہلی سیٹی سمجھ میں آجاتی تھی مگر اب اس عمر کے باعث اونچا سن رہی ہوں۔ اس مشاعرہ میں عوام کے اصرار پر کنور صاحب نے بار بار کلام سنایا۔حیدر آباد میں ان کی ادبی مصروفیات اردو کی خدمت بن جاتی ہے۔کنور صاحب اردو کے لئے ایک سایہ ہیں ان کی کتاب "یادوں کا جشن" ہند و پاک میں اردو ادب کی مشترکہ تاریخ ہے۔اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہ کتاب ہند و پاک دوستی کے نام معنون ہے۔اردو ادب ایک ایسی قوت ہے جو دونوں ممالک میں دوستی کی گرہ کو مستحکم بنا سکتی ہے۔"یادوں کا جشن" کا بھی یہی پیام ہے۔
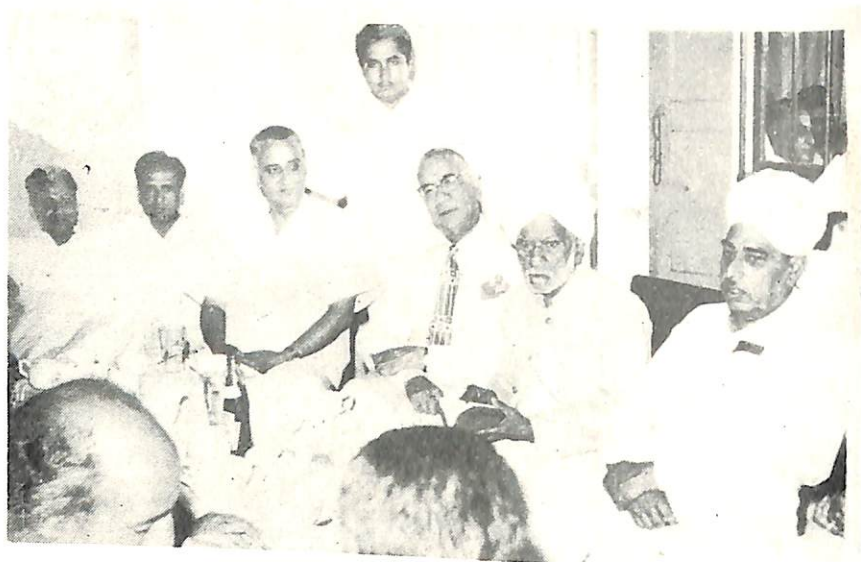
کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی، حضرت جوش ملسیانی، پنّا لال رند اور اختر رضوانی کے ہمراہ

کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی، فیروز اختر، محمد احمد، صادقین، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، رئیس امروہی، جگن ناتھ آزاد
انیس اجلانی اور پرویز کاکوروی کے ساتھ

کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی، ساحر ہوشیار پوری اور خواجہ محمد شفیع کے ساتھ

کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی، کنور مہندر سنگھ بیدی اور احمد فراز کے ہمراہ

خواجہ محمد شفیع

دہلی کی ادبی محفلیں اور کنور صاحب

ہاں تو بندہ نواز دُوسری جنگِ عظیم کا دور ہے۔ صبح تقریباً دس بجے کا عمل ہے ملازم نے ایک وزٹنگ کارڈ لاکر دیا۔ یہ کنور صاحب کا تھا اور یہ ناچیز کی صاحب موصوف سے پہلی مُلاقات تھی ـــــ کاش نہ ہوتی تو جُدائی کے کرب سے بچ جاتا۔ یقین جانئے دلّی چھوڑتے ہوئے بہت کچھ چھوڑا۔ کیا کیا بیان کرُوں لیکن جو تین یادیں آج بھی تڑپا دیتی ہیں اور شاید تا دمِ واپسیں تڑپاتی رہیں ان میں ایک دِلّی کی جامع مسجد، دوسری ماں کی قبر اور تیسری یادِ کنور بھائی۔ بہرحال دُنیا اِسی کا نام ہے۔ رہے نام سائیں کا

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ کنور صاحب سے مِلنا ہوا۔ جب بندہ ڈرائنگ رُوم میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک سجیلا جوان نشِست کی دائیں جانب ایک صوفہ چیئر پر بیٹھا ہے۔ سلام دعا کے ساتھ خادم نے چاہا کہ جناب والا صدر نشین ہوں۔ لیکن قبول نہ فرمایا۔ اب کنور بھائی کو غلام نے آنکھ بھر کر دیکھا۔ غلافی آنکھیں پردہ پوشی کی دلیل۔ کشادہ چشم وسعتِ نگاہ کی جانب کنایہ کناں۔ کشادہ پیشانی رفعت و عظمت کی نشانی۔ بینی قابلِ دید۔ ع۔ گُل چمپک ولیکن ناکشودہ ستواں و استوار۔ راست روی اور عالی خاندانی کا پرچم۔ گندمی رنگ مکمل ابنِ آدم ہونے پر دال۔ غرضیکہ شرافت نجابت اور اعلیٰ کردار کا مجسمہ ـــــ

راقم کو چُھٹتے ہی صاحب موصوف کی یہ ادا بھاگئی تھی کہ صدر صوفہ پر فروکش نہیں ہوئے
ورنہ یہ سرکاری حکام نعوذ باللہ ہمارے سروں پر پاپوش رکھنے پر کمر بستہ رہتے تھے ــــــ
کنور بھائی نے آغاز گفتگو فرماتے ہوئے نیاز مند کو اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی میں STRONG
LIKINGS & DISLIKINGS والا ہوں۔ پہلے ہی والا و شیدا ہو چکا تھا طوق غلامی گلے میں ڈال لیا جو
آج بھی زینت گلو ہے اور انشاء اللہ رہے گی۔

راقم کے اور کنور بھائی کے تعلقات 'ہاں' کے تھے نہیں ہنوز زندگی میں نہیں آئی۔ نہ
خدا کرے آئندہ آئے۔ع۔ این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

غرض کہ کنور صاحب نے نیشنل وار فرنٹ بورڈ تشکیل دیا۔ دلّی کے رودار افراد ممبر بنے لیکن
بیشتر کا منہ کم و کم تر دیکھنے میں آیا۔ صاحب زادہ جمیل الدین مرحوم خزانچی۔ کنور صاحب سب
کچھ۔ خادم سٹیج سیکریٹری تھا۔

بورڈ کا پہلا جلسہ ہوا۔ اراکین کو سٹیج نشین ہونا تھا۔ راقم ان رسُومات سے قطعًا ناآشنا۔
نیچے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ناتھو رام جی جوسٹی مجسٹریٹ تھے۔ اُنھوں نے کچھ راقم سے فرمایا۔
میری اوندھی کھوپڑی میں یہ آیا کہ میرے یہاں بیٹھنے پر ان کو اعتراض ہے ناریل چٹخ گیا اور یہ
بگڑ کر اٹھ آیا ــــــ صبح ہی کنور صاحب تشریف لائے۔ ناکردہ گناہ ہوتے ہوئے معذرت فرمائی
اور کہا کہ ناتھو رام جی تشریف لا رہے تھے لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے خود بات کر لُوں میں
اپنی تنک مزاجی پر پسینہ پسینہ ہو گیا۔ عرض کی غلام کو ابھی اپنے ہم راہ ناتھو رام جی کی خدمت میں
لے چلئے۔

اس کے بعد جلسوں مشاعروں اور دیگر تقریبات کے طُوفان بپا ہوتے رہے۔ راقم
اور کنور صاحب ہزاروں بار دوش بدوش ساری ساری رات سٹیج پر گزارتے۔ع۔ مجھے یاد
ہے وہ سب ذرا ذرا اُنھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو اور کیوں نہ یاد ہوگا۔ اہلِ وفا بھولا نہیں کرتے۔
کنور بھائی کی وفا پر دو واقعہ یاد آگئے ــــــ کنور بھائی اپنے کسی ماتحت سے اپنی
عادت اور فطرت کے قطعاً خلاف ناراض ہو گئے وہ میرے پاس سفارش کا طالب آیا۔ میں
نے کہا میاں جب میں دفتر میں کنور بھائی کے پاس ہوں آجانا۔ اللہ مالک ہے۔ ایسا ہی ہُوا۔ میں

نے کہا کنور بھائی اِسے مُعاف کر دو ناں۔ کنور بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھا سر جُھکایا اور فرمایا جاؤ مُعاف کیا۔ لیکن اُن کے انداز اور آواز سے میں نے محسُوس کیا کہ مُجھ سے کُچھ غلطی ہو گئی ہے۔ میں فوراً بولا۔ اگر مُعاف فرمانا نہ چاہیں تو کوئی ضرُوری نہیں اب اِس دوست نواز کا جواب ملاحظہ ہو۔ فرمایا۔ "آپ فرمائیں اور معاف نہ کروں یہ کیسے ہو سکتا ہے" بعد میں معلوم ہوا کہ اس شخص کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے اِس خود دار شخص کو شرمندہ ہونا پڑا تھا۔

غصّہ کنور بھائی کے قریب نہیں آتا طویل ساتھ میں صرف ایک بار ان حسین مسکراتی آنکھوں میں غیظ و غضب دیکھا اور وہ بھی غضب کا تھا۔

آپ کی فرمائش ہے کہ دلّی کی ادبی محفلیں اور کنور صاحب پر لِکھوں۔ بندہ پرور اس موضوع پر راقم کی ناقص رائے میں بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ محافل اُن کی جان تھیں اور یہ محافل کے روح رواں۔ چھوٹی بڑی سینکڑوں نشستیں دیکھیں بلکہ بزم دن رات یہی ہوتا تھا اور یہی کرتے تھے۔ کنور بھائی ہر محفل میں آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے اور اُن کا یہی مقام تھا اولاً تو بڑے بڑے مشاعرہ اور جلسہ نیشنل وار فرنٹ کے ہوتے تھے۔ ثانیاً سترویں کے موقع پر حضرت محبوب الٰہیؒ اور امیر خسرؒو کے مزارات پر خواجہ حسن نظامی مرحُوم مشاعروں کا اہتمام فرماتے۔ دہلی کوٹن ملز کا سالانہ مشاعِرہ بڑی دُھوم دھام کا ہوتا تھا۔ چھوٹی موٹی محافل تو روزانہ تھیں۔ پنڈت امرناتھ ساحر بھی احباب کو جمع فرماتے طالب دہلوی یوم برق مناتے۔ کالجوں میں مشاعرہ ہوتے۔ بیخود دہلوی کے دولت کدہ پر نشستیں ہوتیں۔ ہارڈنگ پبلک لائبریری میں مشاعرہ مُنعقد کیا جاتا۔ نواب سراج الدین سائل کے شاگرد محافل کرتے۔ دِلّی کے پنجابی سوداگران مشاعرہ کراتے پُر تکلف دعوت ہوتی انواع و اقسام کے طعام ہوتے جن میں بالخصوص دنبہ کا قورمہ اور چھینٹے اور بغیر چھینٹے کی باقر خوانیاں۔ دنبہ کی چکنی کی بڑی بڑی بوٹیاں۔ کُچھ نہ پُوچھئے اب بھی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ ہندُو کالج کے مشاعرہ میں گلزار زُتشی اپنے پورے جوبن پر ہوتے۔ قابل عطار کے کوچہ میں جناح کیپ ہاوس والے محفل کا اہتمام کرتے۔ سر شنکر لال جی کی شاندار کوٹھی پر دعوتیں ہوتیں چاندی کی تھالی اور کٹوریوں میں بھوجن پروسا جاتا۔ سبزی منڈی میں زریں خوری دعوت کرتے مشاعرہ لازم و ملزُوم تھا۔ اس دعوت میں میووں کی خاص طور پر بھرمار ہوتی سبزی منڈی

کے ملکہ باغوں میں دعوت کرتے ٹھیکری کی روٹی بیگن کا بھرتہ خاص طور پر ہوتا اور قیمہ اور ہری مرچیں سیخ کباب اور ہزاروں قسم کے چٹنیاں اور اچار وغیرہ وغیرہ اور اُس کے بعد مشاعرہ۔ برسات میں جھرنے پر نشستیں ہوتی۔ ایک دو قسم کے سالن ہوتے خصوصیت سے روپے میدے کے گرم گرم پراٹھے اور ربڑی۔ آموں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ناندیں بھر کر ہوتے۔ کنور بھائی خوش خوراک تھے لیکن بسیار خور نہیں فیض جھنجھانوی۔ ماہر دہلوی اور نخشب جارچوسی بلا نوش تھے اگر کوئی دعوت ہوئی اور اس میں شعرا بُلائے جاتے تو اُن میں سے ایک کو دس دس شمار کیا جاتا یعنی چالیس کے خورد نوش کا اہتمام کیا جاتا۔ کہاں تک سُناؤں کہاں تک سُنوگے دن عید رات شب برات تھی اور کنور بھائی عید کا چاند اور شب برات کا انار تھے۔ ان کی کیفیت یک انار وصد بیمار کی کی تھی اللہ کا بندہ انکار جانتا ہی نہ تھا۔ سب سے بڑا مشاعرہ گاندھی جینتی کا کمپنی باغ میں ہوتا۔ اس کا اہتمام دلیش بندھو گپتا اور گوپی ناتھ امن جی کرتے۔ رات کے آٹھ نو بجے سے صبح کی اذانوں تک چلتا۔ دوسری بڑی نشستوں کی طوالت بھی عام طور سے اتنی ہی ہوتی تھی۔ پھر کیا مجال جو مجمع میں کمی ہو جائے۔ یومِ داغ بھی منایا گیا تھا اس وقت داغ مرحوم کے شاگرد بقید حیات تھے۔ تقریباً سب کو تکلیف دی گئی اور سب ہی نے کرم فرمایا۔ داغ نمبر بھی چھاپا گیا۔ یہ کہنے کو یوم تھا لیکن تین شب و روز چلا دِل چاہتا ہے ایک اور مشاعرہ کا ذکر کروں یہ دِلّی میں نہیں ہوتا تھا لیکن دِلّی والا کرتا تھا۔ میری مُراد لائل پُور کوٹن مِلز کے مشاعرہ سے ہے۔ لائل پُور کوٹن ملز کے مالک لالہ مُرلی دھر کرتے تھے۔ تکلّف کی انتہا ہوتی تھی۔ تمام ہندوستان سے شاعر جمع کیے جاتے۔ ایک بڑی عام نشست ہوتی دوسری مرلی دھر جی کی کوٹھی پر چھوٹی۔

ابھی ایک مشاعرہ تو رہ ہی گیا۔ خار زتشی اور گلزار زُتشی کے آنجہانی والد پنڈت نزار منعقد کراتے۔ صاحب موصوف اندر پرستھ گرلز کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ نہایت بلند پایہ شاعر اردو اور فارسی پر انتہائی عبور۔ کالج کی لڑکیاں محترم کو مولوی صاحب کہتی تھیں۔ سال میں ایک بار یہ سبھا بھی جمتی۔

کنور بھائی کا حلقہ مشاعرہ جات دِلّی تک محدود نہ تھا تقریباً سو سو میل کے دائرہ تک ہماری مار تھی۔ کنور بھائی کے پاس پبلسٹی وین تھی اُس میں قالین بچھا لیتے اور چل پڑتے۔

کوئی مصرعہ لے لیتے اور فی البدیہ شاعری شروع ہو جاتی - اُس میں کچھ عقدہ بھی کھل جاتے - نظروں کے سامنے فانوسِ خیال گھوم رہا ہے - ایک محفل ہو تو بتاؤں - یہاں ساری حیات ہی محفل تھی اور کنور بھائی آبِ حیات -

کنور بھائی شاعری کی اُس منزل پر ہیں کہ شعر و سخن پر کچھ کہنا مجھ جیسے نااہل کو زیب نہیں دیتا یہ دیکھ رہا ہوں کہ کنور بھائی کی شاعری ایک دن سے ایک دن نکھرتی جاتی مہ و سال کے ساتھ اس پر شباب آ رہا ہے - ظالم کو زبان پر اس درجہ عبور ہے کہ اہل زبان کو پنجابیوں نے لوٹ لیا - اس وقت جہانِ علمِ اردو کے ایم - اے - وغیرہ نہیں ہوتے تھے - اب تو ڈگری چلتی ہے - زباں دانی نہیں - بہر حال چلن ہر دور کا - ہم کچھ کہنے والے کون ــــ بہر کیف اس ڈگری کے دور سے پہلے - زبان کی مہارت اور اس پر عبور کا اندازہ ضلع - جگت سے کیا جاتا تھا - اکثر اوقات ضلع جگت کی بساط بچھ گئی لیکن اس شاہ سخن نے کسی شاعر سے مات نہیں کھائی اکثر ہر شے پڑی اور بیشتر اعراب میں آئے -

اچھا حضور اب بوڑھا تھک گیا - مزید نہیں لکھا جاتا - کنور بھائی کا حق - حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا - کنور بھائی ہر بزمِ ادب میں گلِ سر سبز تھے اور درِ شہوار - شعر میں جتنی خوبیاں ہو سکتی ہیں کنور بھائی کے کلام میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں - ایسا قادر الکلام پر متواضع - ہم درد ہر دکھ درد میں شریک شعرا اور اُدبا کی ہر طرح میری مراد - دامے - درمے - قدمے سب سے ہے - پھر بھی وہ محفل کا سنگار نہ ہو گا تو کیا کوئی مجھ جیسا نااہل ہو گا -

آخر میں عرض ہے کہ شاہ کار مقالات آئیں گے اور مجموعہ کو زینت بخشیں گے - اس نااہل کی تحریر کم خواب ٹاٹ کا پیوند ہو گی اس کے حسن کو خراب نہ کریں - راقم کے تاثرات کنور بھائی کے قدموں میں رکھ دیں اور بس حاصل عمر نثار رہ یارے کردم + شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

خدا حافظ و ناصر - اللہ پھر خیر سے ملائے -

رئیس امروہی

کنور مہندر سنگھ بیدی۔ باغ و بہار شخصیت

یہ مشینی گردش اور سرعتِ رفتار کا عہد ہے۔ اس عہد کے انسان مشینوں سے وابستہ ہو کر خود اک بے اختیار پُرزے کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ سرعت رفتار کے خبط نے افراد انسانی سے ٹھہراؤ۔ سنجیدگی اور سکون قلب کی دولت سلب کر لی ہے ایسی پُرشور اور پر آشوب دنیا میں باغ و بہار شخصیتوں کی نشو و نما تقریباً ناممکن ہے۔ پرانی تہذیب اور پرانا سماجی نظام رفتہ رفتہ ختم ہوتا چلا جا رہا ہے اور اِس نظام حیات کے خاتمے کے ساتھ ہی وہ افراد بھی نایاب ہوتے چلے جاتے ہیں جن کی مجلس آرائیوں سے تہذیب کا بھرم قائم اور جن کی انجمن طرازیوں سے معاشرے کا وقار برقرار تھا۔ انہی نایاب افراد میں ہمارے محبوب اور محترم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا نام نامی اور ذاتِ گرامی قابلِ قدر اور قابل ذکر ہے۔ غالب نے آدمی کو محشرِ خیال قرار دیا تھا (ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال) محشرِ خیال قسم کے افراد اس برق رفتار سماج کی پیداوار ہو سکتے ہیں کیونکہ حشر ہے یہ زندگی ہم عالم محشر میں ہیں! کنور صاحب محشرِ خیال کے بجائے شبستان جذبات واقع ہوئے ہیں وہ بجائے خود اک انجمن ہیں۔ اور جس انجمن میں قدم رکھتے ہیں۔ وہاں اک نئی انجمن آراستہ کر دیتے ہیں۔ ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند۔ کنور صاحب سے مجھے ۱۹۴۲ء میں شرفِ نیاز

حاصل ہوا تھا۔ وہ اُس وقت دِلّی انتظامیہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز اور دارالحکومت دِلّی کے اہلِ ذوق کے لئے شمعِ انجمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ بہت جلد یہ بساط الٹ گئی اور ایک نئی دِلّی اپنی نئی تمدنی سرگرمیوں کے ساتھ وجود میں آئی۔ پچھلے چالیس سال میں ہر چیز بدل چکی ہے۔ بلکہ تقریباً ہر فرد بہت حد تک تغیر و انقلاب کے سانچے میں ڈھل چکا ہے مگر کنور صاحب آج بھی وہی ہیں جو چالیس بیتالیس سال قبل تھے۔

کیوں بہاروں میں تغیر ہو خزاں کیوں بدلے
میری خاطر یہ جہانِ گُذراں کیوں بدلے
انقلابِ روشِ دہر مُسلّم لیکن
روشِ مستیِ رندانِ جہاں کیوں بدلے
منظرِ حسن و تجلّی ہے سراسر نیرنگ
کائناتِ نگہِ دیدہ وراں کیوں بدلے
اس بدلتی ہوئی دنیا کی ہر اک شے بدلی
وہ میرا شاہدِ خلوت گہِ جاں کیوں بدلے
ہر تماشے میں بدلتے رہیں نظر کے انداز
مگر اِک بندۂ صاحب نظراں کیوں بدلے
لفظ و معنی میں بہر حال تغیر ہو گا
شیوۂ بنیشِ معنی نگراں کیوں بدلے

سالہاسال کے بعد جب کراچی میں کنور صاحب کا دیدار فرحت بار نصیب ہوا تو بٹوارے سے قبل کی یادوں اور یادداشتوں کے تمام چراغ روح میں روشن ہو گئے۔ کنور صاحب آج بھی ایسے ہی شاداب و شگفتہ ہیں جیسے نصف صدی قبل خرّم و خنداں تھے بلکہ ان کی گفتار کی لطافت کردار کی شرافت نفس کی طہارت اور قلب کے سوز و گداز میں اب کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا ہے اور ان کے افکار و خیالات کی شراب ماہ و سال

کی بھٹی میں کشید ہو کر اب کچھ اور بھی لذیذ و پر خمار ہو گئی ہے۔

ہم نے سال گذشتہ کراچی میں کنور صاحب کی دلچسپ اور دل پذیر خود نوشت (یادوں کا جشن) کی تقریب کا اہتمام اپنی بساط کے مطابق اور حیثیت کے موافق کیا تھا۔ اب دلّی میں جشن کنور مہندر سنگھ بیدی کمیٹی کے اراکین اس کتاب کے ہندوستانی ایڈیشن کی تقریب افتتاح منعقد کر رہے ہیں اِس مبارک موقع پر بجز اس کے کیا عرض کروں کہ

بہ آں گروہ کہ از ساغر وفاست اند
زما سلام رسانید ہر کجا ہستند

مجتبیٰ حسین

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

میری نظر میں بزرگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے بزرگ وہ جن کی بزرگی پر ترس آتا ہے اور دوسری قسم کے بزرگ وہ جن کی زندگی پر پیار آتا ہے۔ اگرچہ پیار اور ترحم دونوں ایک ہی وسیع جذبے کے ذیلی جذبے ہیں لیکن پیار چاہے بزرگ پر آئے یا دوشیزہ پر پیار ہی ہوتا ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب سحرؔ کا شمار موخرالذکر بزرگوں میں ہوتا ہے جن کے بڑھاپے پر ان دنوں شباب آیا ہوا ہے۔ ایک ایسا شباب جس کا تھوڑا سا حصّہ بھی ہمیں پندرہ بیس برس پہلے مل جاتا تو ہم بھی وہ سب کچھ کر گزرتے جو آدمی کو کرنا چاہیئے۔ بزرگوں کی اکثریت ایسی ہوتی ہے جنھیں دیکھ کر آدمی عبرت پکڑتا ہے۔ لیکن بعض خوش نصیب بزرگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کر آدمی عبرت کے ساتھ ہر چیز کو پکڑ لیتا ہے جیسے تین سال پہلے ایک دن میں نے کنور صاحب کو دیکھ کر اپنا کلیجہ پکڑ لیا تھا۔ یہ اس دن کی بات ہے جب دہلی میں ہر دن کی طرح بجلی فیل ہو گئی تھی۔ مجھے اور کنور صاحب کو دہلی کی ایک پچیس منزلہ عمارت کی ساتویں منزل پر پہنچنا تھا اور لفٹ بند تھی۔ کام چونکہ میرا تھا اسی لیے میں نے کنور صاحب سے کہا "میرا کام اتنا ضروری نہیں ہے کہ آپ ساتویں منزل تک چڑھ کر جائیں اور پھر آپ کی عمر بھی تو ۷۴ برس کی ہو چکی ہے"۔

میرے اس جملے کو سنتے ہی ان کے بڑھاپے پر شباب آگیا اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگے - میں انھیں منع کرتا رہا - سمجھاتا رہا کہ میں نے یہ جملہ اس لیے نہیں کہا کہ وہ ۷۴ برس کے ہوگئے ہیں بلکہ اس لئے کہا کہ میں ۴۸ برس کا ہوچکا ہوں - مسئلہ میرے ضعف کا ہے ان کے ضعف کا نہیں مگر وہ نہ مانے اور سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے بلکہ اکثر موقعوں پر تو دو دو سیڑھیاں ایک ہی قدم میں پھلانگ ڈالیں - میں ان کے پیچھے ہانپتا کانپتا سیڑھیاں چڑھنے لگا - میرے روکنے کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوا - بالآخر اس سفر میں ایک نوبت وہ بھی آئی جب وہ مجھ سے دو منزل آگے ہوگئے - ان کے قدموں کی چاپ تو سُنائی دے رہی تھی مگر وہ خود دکھائی نہیں دے رہے تھے - میں گرتا پڑتا ساتویں منزل پر پہنچا جہاں ہمیں ایک آدمی سے ملنا تھا - میں نے اپنی اُکھڑی اُکھڑی سانسوں کو بڑی مشکل سے یکجا کر کے ان صاحب سے پوچھا کہ کہیں کنور صاحب آتو نہیں گئے -

وہ بولے "کنور صاحب تو نہیں آئے - البتہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے سیڑھیوں پر ایک سردارجی کی جھلک دیکھی ہے جو بڑی تیزی سے اوپر جارہے تھے -"

میں نے کہا "وُہی تو کنور صاحب تھے جو آپ سے ملنے کے لیے اس عمارت میں آئے ہیں"

"تو پھر وہ اوپر کیوں چلے گئے ؟" اُن صاحب نے حیرت سے پوچھا

میں نے کہا "کچھ نہیں ذرا جوشِ جوانی میں اوپر تک چلے گئے ہیں - ابھی آجائیں گے -"

کچھ دیر بعد کنور صاحب نیچے آگئے - پتہ چلا کہ میرے جملے نے اُنھیں اتنا مشتعل کیا کہ تیرہ منزلوں تک چڑھتے چلے گئے - تیرہویں منزل پر اشتعال کچھ کم ہوا تو انہیں احساس ہوا کہ انھیں تو ساتویں منزل پر ہی رکنا تھا -

مجھ سے کہا "تم کیسے نوجوان ہو - سات منزلیں تک نہیں چڑھ سکے - کیا ابھی سے تم پر بڑھاپا آگیا ہے - مجھے دیکھو کہ ۷۴ برس کا ہوچکا ہوں مگر آج بھی یہ حال ہے کہ ساتویں منزل پر کوئی کام ہو تو تیرہ منزل تک چڑھ جاتا ہوں -"

میں نے اپنی ہار مانتے ہوئے معذرت کی اور اپنی صفائی میں ایک دانا کا قول انھیں سنایا کہ "بیس برس کی عمر کا گدھا ، ساٹھ برس کے آدمی سے کہیں زیادہ بوڑھا ہوتا ہے -"

کیونکہ بڑھاپے کا تعلق کسی مخلوق کی عمر سے نہیں اس کے قویٰ سے ہوتا ہے"۔ کنور صاحب اس قول سے ایسے ہی محظوظ ہوئے جیسے کہ ایک سچے" سکھ کو ہونا چاہیئے۔ یہ واقعہ تین برس پہلے کا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ اگر آج بھی انھیں کسی عمارت کی ساتویں منزل پر جانا ہو اور لفٹ بند ہو اور کوئی ان کے بڑھاپے کو للکارے تو وہ کم از کم بارہویں منزل تک ضرور چڑھ جائیں گے اور ہم جیسے نچلی منزل پر ہی کھڑے رہ جائیں گے۔

ان کی اس اعلیٰ وارفع صحت کا راز نہ جانے کیا ہے۔ سُنا ہے کہ نوجوانی میں بہت کسرت کرتے تھے۔ خالص چیزیں کھاتے تھے۔ ہر قسم کی کشتیاں لڑتے تھے اور ہر قسم کا شکار کھیلتے تھے۔ میں نے کبھی ان کی صحت کا راز جاننے کی کوشش نہیں کی کیونکہ کچھ ایسے راز ہوتے ہیں جنھیں اگر آپ جان بھی لیں تو ان سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ آپ نے وہ لطیفہ تو سُنا ہو گا کہ ایک شخص کی عمر سو برس کی ہو گئی تو کسی نے پوچھا "قبلہ! آپ نے یہ جو طویل عمر پائی ہے اس کا راز کیا ہے؟"

بزرگ بولے "میری طویل عمر کا راز صرف اتنا ہے کہ جب تک میں تیرہ برس کا نہیں ہو گیا تب تک میں نے عورت اور شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اب آپ ہی بتائیے اس طرح کے راز کا آپ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

اِدھر دس بارہ برسوں سے کنور صاحب نے اپنی داڑھی کو خضاب سے پاک کیا ہے ورنہ آج بھی یہ خضاب لگانا شروع کر دیں تو ہم جیسوں سے نوجوان نظر آنے لگیں البتہ آواز ایسی پُر شباب، باٹ دار اور رعب و دبدبہ والی پائی ہے کہ لگتا ہے گلے میں خضاب لگا رکھا ہے۔

یاد بخیر کنور صاحب کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۶۸ء میں حیدرآباد میں دیکھا تھا حیدرآباد میں ہم لوگوں نے مزاح نگاروں کی ایک کانفرنس منعقد کی تھی اور میں اس کانفرنس کا جنرل سکریٹری تھا۔ کانفرنس کے تین اجلاس تھے۔ پہلا اجلاس لطیفہ گوئی کا تھا جس کی صدارت کنور صاحب کو کرنی تھی۔ دوسرا اجلاس مزاحیہ مضامین کا تھا جس کی صدارت آنجہانی راجندر سنگھ بیدی کو کرنی تھی اور تیسرا اجلاس مزاحیہ مشاعرہ سے متعلق

تھا جس کی صدارت آنجہانی وی شنکر نے کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دنوں کنور صاحب کسی بڑے عہدے پر فائز تھے یا نہیں۔ کچھ عہدیدار ایسے ہوتے ہیں جو بڑے عہدے پر فائز نہیں رہتے بلکہ عہدہ ان پر فائز رہتا ہے۔ ہر دم اپنی عہدیداری کو حاضر و ناظر جانتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کنور صاحب بھی اسی طرح کے عہدیدار ہوں گے مگر جب حیدرآباد آئے تو یوں لگا جیسے ہم میں سے ہی ایک ہیں۔ مزاح نگاروں کی اس کانفرنس کی کامیابی کی لوگوں نے پہلے ہی سے پیشن گوئی کر دی تھی کیونکہ اس میں دو سکھ ادیب حصّہ لے رہے تھے بلکہ راجندر سنگھ بیدی نے تو حیدرآباد ایرپورٹ پر اترتے ہی مجھ سے کہہ دیا تھا "میاں! مزاح نگاروں کی کانفرنس کی کامیابی کے لیے ایک ہی سردار کافی تھا۔ تم نے دو دو سردار اور وہ بھی بیدی سردار بلائے۔ سونے پر سہاگہ اسی کو کہتے ہیں"۔ سچ تو یہ ہے کہ حیدرآباد میں مزاح نگاروں کا یہ سب سے کامیاب اجتماع تھا۔ لطیفہ گوئی کی محفل کی صدارت چونکہ کنور صاحب کر رہے تھے اسی لیے میں نے تمام لطیفہ گو حضرات سے کہہ دیا تھا کہ وہ سرداروں والے لطیفے ہرگز نہ سنائیں۔ اس پر بعض لطیفہ گو حضرات نے محفل لطیفہ گوئی میں شرکت سے معذرت کر لی کہ واہ صاحب یہ کیا بات ہوئی کہ محفل لطیفہ گوئی کی ہو اور اس میں سرداروں کا ذکر نہ ہو۔ خیر صاحب لطیفہ گوئی کی محفل ہوئی مگر میرے منع کرنے کے باوجود اس میں سرداروں کے لطیفے خوب سنائے گئے۔ تاہم اس صورت حال کے لیے میں ہی ذمہ دار تھا کیونکہ غیر سرداروں کو تو میں نے سرداروں کے لطیفے سنانے سے منع کیا تھا۔ لیکن خود سرداروں سے یہ التجا نہ کی تھی کہ وہ اپنے بارے میں لطیفے سنانے سے گریز کریں۔ مجھے اب تک وہ محفل یاد ہے اور اس کے قہقہے اب تک میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ کنور صاحب سے میرے مراسم کا یہ نقطۂ آغاز تھا۔ اس دن سے آج تک زندہ دلانِ حیدرآباد کو اُن کی سرپرستی اور شخصی طور پر مجھے ان کی شفقت حاصل رہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ١٩٦٩ء میں ایک ملازمت کے انٹرویو کے سلسلے میں، میں دہلی آیا اگرچہ میں اس ملازمت کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھا لیکن کنور صاحب سے ملا تو وہ اس ملازمت کے بارے میں مجھ سے زیادہ سنجیدہ ہو گئے۔ میرے منع کرنے کے باوجود کئی لوگوں سے میرے بارے میں سفارش کی۔ کئی لوگوں کو بلاوجہ یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ میں ذہین

آدمی ہوں، قابل ہوں، اہل بھی ہوں اور نہ جانے کیا کیا ہوں مگر بیں نے انٹرویو میں ان کے سارے دعوؤں کی تردید کردی اور حیدرآباد واپس چلا گیا۔ ایک سال بعد وہ زندہ دلان حیدرآباد کے ایک جلسہ میں شرکت کے لیئے حیدرآباد آئے تو خفا تھے کہ میں نے جان بوجھ کر انٹرویو میں اپنے آپ کو نا اہل ثابت کیا تھا۔ میں اپنی صفائی میں صرف اتنا کہا کہ کنور صاحب مجھے آپ سے ہی یہ شکایت ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر میری قابلیت، اہلیت اور صلاحیت کے بارے میں اس محکمہ کے ڈائریکٹر جنرل کو اتنا بڑھا چڑھا کر بتادیا تھا کہ وہ اپنی کرسی کے لیے مجھے ایک خطرہ سمجھنے لگا۔ یوں بھی ایک محکمہ میں دو قابل لوگوں کی گنجائش کہاں ہوتی ہے اسی لیے واپس چلا آیا۔

کنور صاحب کی یہی ادا تو مجھے پسند ہے کہ جس پر مہربان ہوتے ہیں اس کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ اسے آپ ان کی شفقت اور محبّت نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ جسے عزیز رکھتے ہیں اگر وہ نا اہل بھی ہے تو اس میں اہلیت ڈھونڈتے ہیں، نالائق بھی ہے تو اس میں لیاقت تلاش کرتے ہیں، جاہل ہے تو اس میں علم کی کھوج کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کنور صاحب کے اطراف مجھ جیسوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

۱۹۷۲ء میں جب میں دہلی آیا تو کنور صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ سچ مچ مجلسی آدمی ہیں۔ وہ محفل میں ہوں تو کیا مجال کہ کوئی اور جانِ محفل بن جائے۔ ان کی باتیں حاضر جوابی، بذلہ سنجی، شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی سے عبارت ہوتی ہیں۔ محفل کی نبض ان کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جس طرح کے لوگ ہوں اور جس طرح کا موقع ہو اس کے مطابق ایسی نپی تلی بات کرتے ہیں کہ سب کو بھا جائے۔ محفل میں دس بارہ آدمی ہوں یا تیس پینتیس ہزار آدمی کنور صاحب سب کا مزاج جانتے ہیں۔

ابھی دو تین مہینے پہلے کی بات ہے۔ حیدرآباد میں عالمی اقبال سیمینار کے سلسلہ میں ایک مشاعرہ برپا تھا۔ تیس پینتیس ہزار سامعین موجود تھے۔ سامعین نے ایک شاعر کا کلام سننے سے انکار کیا تو بدمزگی سی پیدا ہو گئی۔ نعرے لگنے لگے۔ افراتفری پھیل گئی۔ ایسے میں کنوینر مشاعرہ نے اچانک اعلان کیا کہ اب جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

آپ کو اپنا کلام سنائیں گے۔ میں نے حیرت سے کنور صاحب کو دیکھا۔ کنور صاحب بڑے اعتماد کے ساتھ مائیکروفون پر آئے۔ مائیکروفون تک آتے آتے وہ مجمع کے مزاج کو بھانپ چکے تھے۔ مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور ماحول کی مناسبت سے ایک ایسا شعر سنایا کہ جو مجمع نعرے لگا رہا تھا وہ تالیاں بجانے پر مجبور ہو گیا۔ پورے آدھے گھنٹے تک کنور صاحب نے مجمع کو اپنے قابو میں رکھا۔ ایک نوبت وہ بھی آئی کہ یہ کمبل کو چھوڑنا چاہتے تھے لیکن کمبل انھیں نہیں چھوڑ نا تھا۔ جب مشاعرہ پوری طرح جم گیا تو پھر اسے کنوینر مشاعرہ کے حوالے کیا کہ میاں اب چلاؤ مشاعرہ اپنے حساب سے۔ میں نے اسے اپنے حساب سے ٹھیک کر دیا ہے۔ کنور صاحب مجمع کی نفسیات کو جتنا جانتے ہیں اتنا شاید ہی کوئی جانتا ہو۔ اسی لیے وہ بعض اوقات مجمع کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو بلّی اپنے شکار کیے ہوئے چوہے کے ساتھ کرتی ہے۔

کنور صاحب اردو شاعروں کے عالی جاہ ہیں۔ شاعر اور ادیب انھیں احتراماً "عالی جاہ" کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کنور صاحب گھر پر نہ ہوں اور کوئی انھیں فون کرے اور ایسے میں مسز کنور مہندر سنگھ بیدی فون کا ریسیور اٹھائیں تو وہ کہتی ہیں "میں مسز عالی جاہ بول رہی ہوں۔" اپنے شاعر دوستوں کو وہ خوب نوازتے بھی ہیں اردو شاعروں کے مسائل اگرچہ بہت بڑے نہیں ہوتے لیکن ان کا حل تلاش کرنا ضرور دشوار ہوتا ہے۔ کنور صاحب ان کے مسائل نہ صرف حل کرتے ہیں بلکہ انھیں پیدا بھی کرتے ہیں۔ (مراد مسائل سے ہے)۔ بھانت بھانت کے شاعر اُن کے اطراف جمع رہتے ہیں۔ جس پر مہربان ہو جائیں اُسے ہندوستان کے کونے کونے میں گھما دیتے ہیں بلکہ بیس بائیس برس پہلے وہ اردو شاعروں کی ایک ٹیم کو لے کر برطانیہ گئے تھے۔ اس ٹیم میں انھوں نے اکثریت ایسے شاعروں کی شامل رکھی تھی جو برطانیہ کی قومی زبان انگریزی سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ برطانیہ نے ان شاعروں کو اور ان کے کلام کو خوب سمجھا اور لطف اندوز ہوئے۔ ان شاعروں کے لیے بھی یہ ایک انوکھا تجربہ تھا کیونکہ پیلی بھیت یا پانی پت کے مشاعروں سے اچانک لندن کے مشاعرہ میں کلام سنانا کوئی یار سے نکل کر سوئے دار

چلے جانے کے مترادف تھا۔ اس کا فائدہ اردو زبان و ادب کے حق میں یہ ہوا کہ بہت سے شاعر یورپ کی ترقی اور چکا چوند سے اتنے مبہوت ہوتے کہ وطن واپس آکر ایک لمبے عرصہ تک کوئی شعر نہ کہہ سکے۔

کنور صاحب کے اطراف نہ صرف شاعر اور ادیب جمع رہتے ہیں بلکہ پہلوان اور فنِ پہلوانی سے تعلق رکھنے والے افراد بھی جمع رہتے ہیں اسی لیے میں ان کی محفل میں بہت محتاط رہتا ہوں کیونکہ برابر بیٹھے ہوئے شخص کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مطلع عرض کرے گا یا گھونسہ رسید کرے گا۔ کسی اچھی بات پر مصافحہ کرے گا یا پنجہ لڑائے گا گویا کنور صاحب کی ذات ایک ایسا گھاٹ ہے جس پر پہلوان اور شاعر دونوں ہی ایک ساتھ پانی پینے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں۔ میں نے راتوں کی محفلوں میں بھی کنور صاحب کو دیکھا ہے۔ وہی سلیقہ، وہی رکھ رکھاؤ اور وہی آن بان۔ کیا مجال ہے کہ شائستگی کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹے۔ کوئی شاعر یا ادیب بہک جائے تو اسے ٹوکنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس ادیب یا شاعر کی ویڈیو فلم ریکارڈنگ شروع ہو جاتی ہے جو دوسرے دن اسے بلا ٹکٹ دکھادی جاتی ہے۔ وہ راہ راست پر آجائے تو ٹھیک ہے ورنہ معاملہ اگلی فلم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایک محفل میں ایک ادیب نے اپنے ہوش کچھ اس طرح گنوائے کہ خود کنور صاحب سے لڑنے لگا۔ اس کے جی میں جو آیا وہ بکتا گیا مگر کنور صاحب خاموش رہے کنور صاحب کے پہلوان دوستوں کو طیش آگیا۔ وہ اس ادیب کو سبق سکھانا ہی چاہتے تھے کہ کنور صاحب بڑی خاموشی کے ساتھ اس ادیب کو الگ لے گئے اور اپنی گاڑی میں اسے بٹھا کر بیس کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے اسے گھر چھوڑ آئے۔ ایسی حرکت وہی آدمی کر سکتا ہے جو یا تو بہت کمزور ہو یا پھر ایک باظرف سکھ ہو۔

کنور صاحب کو میں نے کبھی غصّہ کی حالت میں نہیں دیکھا سوائے ایک دفعہ کے اور اتفاق سے ان کا یہ غصّہ مجھ سے ہی متعلق تھا۔ ۱۹۸۵ء کی عالمی مزاح کانفرنس میں شرکت کے لیے کنور صاحب کو حیدرآباد آنا تھا۔ انھوں نے اپنی آمد کی تاریخ اور وقت سے مجھے

مطلع کر دیا تھا اور تاکید کی تھی کہ میں انہیں لینے حیدر آباد ایئرپورٹ پر آجاؤں۔ میں کانفرنس کی تیاریوں کے سلسلہ میں بہت پہلے حیدر آباد چلا گیا تھا۔ بارہ ممالک کے مندوبین اس کانفرنس میں شرکت کر رہے تھے۔ کانفرنس کے کام اتنے پھیلے ہوئے تھے کہ ہم لوگوں نے کاموں کی تقسیم کر دی تھی۔ ایک کمیٹی صرف مہمانوں کے استقبال اور دیکھ بھال کے لیے بنائی گئی تھی۔ میں نے اس کمیٹی کے کنوینر کو بلا کر تاکید کر دی تھی کہ وہ فلاں تاریخ کو فلاں فلائٹ پر کنور صاحب کے استقبال کے لیے چلا جائے جس دن وہ آ رہے تھے اُس دن صبح بھی میں نے کنوینر کو کنور صاحب کی آمد کے بارے میں یاد دہانی کرا دی تھی۔ میں مطمئن ہو کر دوسرے کاموں میں جُٹ گیا۔ دن میں تین بجے کے قریب اخبار "سیاست" کے دفتر سے میرے لیے فون آیا کہ کنور صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے کنور صاحب کی پاٹ دار آواز سُنائی دی۔ بولے "میاں! میں اسی وقت دہلی واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں کانفرنس میں شرکت نہیں کروں گا۔ میں نے تم سے خاص طور پر کہا تھا کہ ایئرپورٹ پر آجانا مگر مجھے لینے کے لیے ایئرپورٹ پر کوئی نہیں آیا۔ بڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ وہ اچھا ہوا کہ ایک صاحب نے مجھے پہچان لیا اور "سیاست" کے دفتر پر چھوڑ گئے۔ اب میں فوراً دہلی واپس جانا چاہتا ہوں"۔ کنور صاحب کی یہ بات سن کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سخت کوفت اور ندامت ہوئی۔ میں نے بہت معذرت کی۔ ساری صورتِ حال سے انھیں آگاہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ میری ہر وضاحت کے جواب میں دہلی واپس جانے پر مصر نظر آئے۔ میں نے سوچا کہ اس وقت میرا ان کے پاس جانا مناسب نہیں ہوگا لہٰذا میں نے زندہ دلانِ حیدر آباد کے سارے اچھے مزاحیہ فنکاروں کو موٹروں میں بھر کر ان کے پاس روانہ کیا اور تاکید کی کہ پہلے تو اپنے لطیفوں اور اپنی پُر مزاح حرکتوں کے ذریعہ اُن کا موڈ ٹھیک کریں اور انھیں لیک ویو گیسٹ ہاؤس لے جائیں جہاں ان کے قیام کا انتظام تھا۔ میں جان گیا تھا کہ یہ دیو ایسا ہے جس پر لطیفوں اور مزاح کے ذریعہ ہی قابو پایا جا سکتا ہے۔ میں دو گھنٹوں بعد لیک ویو گیسٹ ہاؤس پہنچا تو کنور صاحب کے کمرہ سے زوردار قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں کمرہ میں داخل ہوا تو

وہ قہقہہ لگانے کے لیئے اپنا منہ کھول چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے قہقہہ بار منہ کو مصنوعی طور پر بند کرنے کی کوشش کی مگر قہقہہ ان کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ قہقہہ ختم ہوا تو انھوں نے پھر اپنے چہرے پر سنجیدگی کو طاری کرنے کی کوشش کی۔ میں اس انتظار میں خاموش بیٹھا رہا کہ یہ اپنی خفگی مجھ پر ظاہر کر دیں۔ خود ہی بولے "یہ تم نے یتیموں کی شکل کیوں بنا رکھی ہے؟" میں نے کہا "آج آپ دہلی واپس ہونا چاہتے ہیں مگر آج کی فلائیٹ میں کوئی نشست آپ کے لیئے نہیں مل رہی ہے۔" بولے "میاں! میں تمہیں تمہاری ذمہ داری سے واقف کرانا چاہتا تھا۔ میں جب اپنے سے چھوٹوں میں غیر ذمہ داری کو پاتا ہوں تو بھڑک اٹھتا ہوں۔ میں تم سے بہت ناراض تھا مگر تمہارے ساتھیوں نے اب میرا موڈ بدل دیا ہے۔ جاؤ تمہیں معاف کیا مگر آئندہ ہرگز ایسا نہ کرنا۔" اُس دن پتہ چلا کہ ان کا غصہ جھاگ کی طرح ہے کہ ادھر ابل پڑا اور ادھر دیکھتے دیکھتے دب گیا۔

واضح رہے کہ کنور صاحب مشاعروں اور ادبی جلسوں میں جانے کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ صرف کرایہ آمد و رفت لیتے ہیں بلکہ دوسرے شہر میں قیام و طعام کے اخراجات بھی اکثر صورتوں میں خود ہی برداشت کرتے ہیں۔ کنور صاحب کی کتاب "یادوں کا جشن" کے مطالعہ سے میری معلومات میں نہ صرف ایک خوشگوار اضافہ ہوا ہے بلکہ یک گونہ اطمینان بھی حاصل ہوا۔ انھوں نے اپنی کتاب میں بھوپال کے ایک ہفتہ وار ایڈیٹر کا ذکر کیا ہے جس نے انھیں ایک مشاعرہ میں بھوپال بلایا تھا۔ مشاعرہ کے بعد یہ ایڈیٹر غائب ہو گیا اور کنور صاحب کو آمد و رفت کا کرایہ نہیں ادا کیا۔ کنور صاحب نے ایک باظرف آدمی کی طرح اس رسالہ کا یا اس کے ایڈیٹر کا نام ظاہر نہیں کیا ہے۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ اگر وہ یہ کتاب پڑھے تو ان کے اخراجات آمد و رفت ادا کر دے۔

اس واقعے کو پڑھ کر مجھے بھی بھوپال کے ایک ہفتہ وار ایڈیٹر کی یاد آگئی جس نے مجھے اور فکر تونسوی کو طنز و مزاح کے ایک جلسہ میں بلایا تھا۔ وعدہ کیا تھا کہ وہ ہم دونوں کو آنے جانے کا فرسٹ کلاس کا کرایہ ادا کرے گا اور اگر جلسہ

کامیاب رہا تو دو سو روپیہ فی کس معاوضہ بھی ادا کرے گا۔ میں اور فکر تونسوی فرسٹ کلاس سے بھوپال گئے۔ اس نے پہلے تو ہمیں دہلی سے بھوپال جانے کا سیکنڈ کلاس کا کرایہ ادا کیا پھر کہا کہ وہ جلسہ کے بعد واپسی کا کرایہ اور باقی رقم ادا کر دے گا۔ جلسہ بے حد کامیاب رہا لیکن جلسہ کے فوراً بعد وہ ایڈیٹر ایسا غائب ہوا کہ تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ اس کی تلاش میں، میں نے اور فکر تونسوی نے تقریباً سارا بھوپال دیکھ لیا مگر وہ نہیں ملا۔ بالآخر ہم دونوں ادب کی بے لوث خدمت انجام دینے کے بعد دہلی واپس آ گئے۔

فکر تونسوی نے اس ایڈیٹر کے خلاف ایک عدد کالم اور میں نے ایک عدد مضمون لکھا۔ مجھے یقین ہے کہ جس ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر نے کنور صاحب کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا وہ وہی تھا جس نے ہمیں بھی اردو کی بے لوث خدمت انجام دینے پر مجبور کیا تھا۔ میں چاہوں تو اس ایڈیٹر کا نام ظاہر کر سکتا ہوں لیکن جب کنور صاحب نے خود ہی اسے پوشیدہ رکھنا چاہا ہے تو میں کون ہوتا ہوں اُس کا نام ظاہر کرنے والا۔

سُنا ہے کہ کنور صاحب شکار کے بھی شوقین رہے ہیں۔ مجھے کبھی ان کے ساتھ شکار پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا البتہ ان کی ایک تصویر ضرور دیکھی ہے جس میں وہ اپنے مارے ہوئے ایک شیر کی نعش پر اپنا سیدھا پاؤں اور بندوق رکھے کھڑے ہیں۔ اس تصویر کی سب سے اہم خصوصیت مجھے یہ نظر آئی کہ اس میں کنور صاحب دیگر شکاریوں کی طرح اپنی فتح پر مسکراتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ شیر کے ہونٹوں پر میں نے ضرور ایک عجیب سی مسکراہٹ دیکھی ہے جیسے وہ کنور صاحب کے ہاتھوں اپنے ہلاک ہونے پر نازاں، فرحاں اور شاداں ہو۔

کنور صاحب جیسی ہشت پہلو شخصیت کے بارے میں کہنے کو میرے پاس بہت سی باتیں ہیں۔ ان کی شخصیت جن تہذیبی قدروں اور عوامل سے مل کر بنی ہے وہ قدریں اب معدوم اور ایسی شخصیتیں بھی اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ ہماری یہ خوش بختی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ایسی شخصیتوں کو دیکھا۔ وہ رواداری، انسان دوستی، محبت، یگانگت اور خلوص کا ایک انوکھا پیکر ہیں۔ جسے عزیز رکھیں اس کے لیے

کچھ بھی کر گزریں۔ ۱۹۸۴ء میں جب مجھے طنز و مزاح کا ساگر سوری غالب ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے پتہ لگانے کی کوشش کی کہ اس انعام کے لیے میرے انتخاب کی غلطی کس سے سرزد ہوئی ہے۔ جب معلوم ہوا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی اس انعامی کمیٹی کے رکن ہیں تو غلطی کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ میں نے ان سے کہا بھی کہ میں اس انعام کا مستحق نہیں ہوں۔ مجھ سے سینئر مزاح نگار کئی اور بھی ہیں مانا کہ آپ مجھے عزیز رکھتے ہیں لیکن اردو ادب تو مجھے اتنا عزیز نہیں رکھتا۔ مگر وہ نہ مانے اور مجھے انعام دلوا کر ہی دم لیا۔

نومبر ۱۹۸۴ء میں مسز اندرا گاندھی کے قتل کے بعد جب دہلی میں فسادات پھوٹ پڑے تو ہم سب پریشان ہو گئے۔ کنور صاحب کی خیریت معلوم کرنے کے لیے جب ان کے گھر فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی دوست کے گھر منتقل ہو گئے ہیں۔ اُن کے دوست نارنگ ساقی صاحب نے بتایا کہ ان کے بیٹے کی کوٹھی جلا دی گئی ہے اور ان کا کافی نقصان ہوا ہے۔ جب حالات ذرا سنبھلے تو میں اُن سے ملنے گیا۔ چہرے پر وہی شگفتگی بشاشت اور تازگی نظر آئی۔ انھوں نے فسادات کا ذکر تک نہ کیا جب میں نے ہی اپنے طور پر فسادات پر اپنے دکھ کا اظہار کیا تو بڑی متانت اور اور خاموشی کے ساتھ بولے۔

"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

اب بھلا بتایئے اس کے بعد میں ان سے اس موضوع پر کیا بات کر سکتا تھا۔ ان کا یہ جملہ مجھے آج بھی ان کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

اگرچہ کنور صاحب کی مادری زبان پنجابی ہے لیکن اردو سے انھیں جو والہانہ عشق ہے ویسا عشق مجھے کسی اردو والے کے ہاں نظر نہیں آیا۔ وہ سراسر اردو تہذیب کی زندگی جیتے ہیں۔ اردو سے متعلق دہلی کی کوئی ادبی سرگرمی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اسے کنور مہندر سنگھ بیدی کی سرپرستی حاصل نہ ہو۔

ان کی کتاب "یادوں کا جشن" ایک ایسی شخصیت کی یادوں کا مجموعہ ہے جس نے اس برصغیر کی تاریخ کے ایک کربناک اور نازک دور سے گزرنے کے باوجود انسان دوستی کے دامن کو اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ جس کے پائے استقامت کو کسی بھی آزمائش میں لڑکھڑاہٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ایک اعتبار سے یہ کتاب برصغیر کی تاریخ کو صحیح پسِ منظر میں سمجھنے کے لیے ایک نیا زاویۂ نگاہ عطا کرتی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے آدرش کی حیثیت رکھتی ہے۔

کنور صاحب اپنی مصروف سماجی زندگی میں سے شام کے دھندلکے میں کچھ وقت ضرور نکال لیتے ہیں جب وہ چیمسفورڈ کلب کے لان پر اکیلے چہل قدمی کرتے ہوئے گوربانی کا پاٹھ کرتے ہیں۔ دوست بھی موجود ہوں تو اجازت لے کر پاٹھ کرنے کے لیے چلے جاتے ہیں۔ میں نے اکثر انہیں تنہائی میں اس طرح کی عبادت کرتے دیکھا ہے۔ وہ اپنے سر کو جھکائے چپ چاپ چلتے رہتے ہیں جیسے انھیں اس دنیا سے کوئی علاقہ نہ ہو۔ ایسے وقت وہ مجلسی آدمی بالکل نہیں دکھائی دیتے۔ انھیں دیکھ کر میرا جی بھی خدا سے دعا کرنے کو چاہتا ہے کہ کنور صاحب برسوں ہمارے درمیان رہیں اور اپنی باتوں سے ہمیں جینے کا نیا حوصلہ عطا کرتے رہیں۔ اس وقت مجھے ایک بچہ کی یاد آگئی جسے رات میں سونے سے پہلے ماں نے کئی دعائیں مانگنے کی تاکید کی۔ آخر میں ماں نے بچہ سے کہا "بیٹا اب ذرا اپنے ناناجان کی درازیٔ عمر کے لیے بھی دعا مانگو کہ وہ کئی برس تک اس دنیا میں زندہ رہیں۔" اس پر بچّہ نے کہا "نہیں ماں! یہ دعا بیکار ہے۔ ناناجان اب ویسے بھی اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ اس بڑھاپے کے ساتھ ان کا مزید کچھ برس تک زندہ رہنا مناسب نہیں ہے۔ برخلاف اس کے میں خدا سے دعا کرنا چاہوں گا کہ وہ انھیں پھر سے نوجوان بنادے۔" کنور صاحب کے تعلق سے میری دعا کی نوعیت

بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ خدا کے فضل سے مہ و سال کی اس گردش کے باوجود ان میں آج بھی نوجوانوں کی سی توانائی اور حوصلہ ہے۔ اور اسی توانائی اور حوصلہ کا نام کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ہے۔ میری دعا ہے کہ ان کی یہ توانائی اور جولانی ہماری آخری سانس تک قائم و دائم رہے۔

(آمین ثم آمین)

پروفیسر گوپی چند نارنگ

اس کی پیری ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

میں جب بھی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے بارے میں سوچتا ہوں، یا اُن کے اشغال اور گوناگوں سرگرمیوں پر نظر کرتا ہوں تو مجھے پُرانے زمانوں کے وہ دیو زاد یاد آجاتے ہیں، جو گویا چند قدم میں پوری زمین ناپ لیتے تھے، یا پوری دنیا ایک گولے کی طرح اُن کے ہاتھوں میں آجاتی تھی۔ اب تو خیر زمانہ ہی بدل گیا، نہ وہ ظرف ہیں، نہ وہ شخصیتیں ہیں، جسے دیکھئے سُکڑا ہوا، اپنے آپ میں سمٹا ہوا، ذات کے ماحول میں محصور، یا پھر بیمارِ انا اور تکبّر سے پھولا ہوا، یا حسد کی آگ میں جلتا تپتا، تعصّبات کا مارا ہوا۔ اس منظر نامے پر بیدی صاحب کی شخصیت بڑی سرسبز و شاداب دکھائی دیتی ہے جیسے ہری بھری پتیوں سے لدا پھندا ایک گھنا تناور پیڑ۔ ڈال ڈال پات پات سے پرندے اُڑتے رہتے ہیں، پھر یہ آکر اِن ہی پتیوں کی چھاؤں میں بسیرا کرتے ہیں۔ کتنے موسم آئے، کتنی رتیں بیت گئیں، کتنی بہاریں اور برساتیں گزر گئیں، کتنے راہگیر مسافر سستانے کے لئے رُکے، کتنے بادِ نسیم کے جھونکے کی طرح اِدھر سے آئے، اُدھر نکل گئے مگر یہ پیڑ جوں کا توں ہرا بھرا ہے۔ اُس کی محبتوں اور شفقتوں کی چھاؤں ویسی ہی گھنی ہے۔ ہمارے عہد میں بھرپور آدمی اب آسانی سے نہیں ملتا۔ زمین سے اُٹھنے والا زمین کا آدمی، زمین کے رس کا شناسا، زمین کا حق ادا کرنے والا آدمی اب نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ اگلوں کے بارے میں سوچیئے تو کیسے کیسے جامع الصفات لوگ ہوا کرتے تھے۔ پہلو دار کنور مہندر سنگھ بیدی بھی ان ہی معنوں میں پہلو دار شخصیت ہیں۔ انہوں نے زندگی کو مختلف رنگوں میں اور مختلف سطحوں پر دیکھا ہے اور ہر رنگ سے جی بھر کر کسبِ فیض کیا ہے۔ یوں تو جس میں جو بھی ہو کمال اچھا ہے لیکن

شاید زندگی کا سب سے بڑا ہنر زندگی کرنا ہے، اور بیدی صاحب اس میں یکتائے روزگار ہیں۔ وہ ہر سطح پر زندگی کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ رندوں میں رند، پارساؤں میں پارسا، شاعروں میں شاعر، ادیبوں میں ادیب، رہبروں میں رہبر، امیروں میں امیر صوفیوں میں صوفی، بٹیر بازوں میں بٹیر باز ہیں۔ اُردو میں شاید ہی ایسا کثیر الاشغال اور کثیر الاطراف آدمی دوسرا ہو۔ مزید برآں صدق و صفا اور مہر و اخلاص کا پیکر، دوسروں کی خدمت کرنے، اُن کے کام آنے والا، شفیق اور درد مند، مشربِ صلحِ کُل میں یقین رکھنے والا، ہندو، مسلم سکھ، عیسائی میں فرق نہ کرنے والا ایسا انسان رواداری جس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ انسانیت کا پرستار، ادیب، ادیب گر، ادیب نواز، ادیب شناس۔ یوں کہنے کو تو وہ فری اسٹائل کشتی چیمپین شپ بازوں، شطرنج بازوں، پتنگ بازوں، مکہ بازوں اور پہلوانوں اور دنگل بازوں کے بھی انجمن آرا ہیں لیکن اُن کی اصل پہچان، اُن رنگارنگ بزم آرائیوں سے ہے جو اُردو کے حوالے سے معنی خیز ہیں۔ مجھے اپنی اس کوتاہی کا اعتراف ہے کہ اُن کا پہلا مجموعۂ کلام "طلوعِ سحر" میری نظروں سے نہیں گذرا لیکن میں نے اُن کو بارہا محفل آرا دیکھا ہے، اُن پر داد و تحسین کے ڈونگرے برستے ہوئے بھی دیکھے ہیں، اور اُن کو مشاعرے لوٹتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ پاکستان میں اُن کی جو پذیرائی ہوتی ہے اور جس طرح انھیں ہندوستانی ثقافت کا سفیر سمجھا جاتا ہے۔ اُس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ خاکسار شاعر نہیں، لیکن کئی بار سفرِ پاکستان میں میرا اُن کا ساتھ رہا ہے۔ ۱۹۸۶ء کے اوائل میں اُردو ادیبوں کا جو وفد پاکستان گیا تھا، اُس میں شرکت کا شرف مجھے بھی حاصل ہوا تھا۔ صدرِ مملکت جنرل ضیاءُالحق صاحب نے بیدی صاحب کا جو پُرتپاک خیر مقدم کیا تھا، وہ منظر بھی مجھے یاد ہے۔ ایوانِ صدر میں عشائیہ کے موقع پر، کنور صاحب اور اُن کی بیگم صاحبہ کی نشست صدر صاحب کے دائیں اور بائیں تھی۔ اسی میزِ خاص پر قبلہ مسعود حسین خاں اور جناب جگن ناتھ آزاد بھی تھے، اور یہ خاکسار بھی۔ مسلمانوں میں وہ جس عزت اور احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس عہد میں کوئی دوسرا غیر مسلم اس درجہ معروف و مقبول نہیں ہے۔ اُن کی خود نوشت سوانح "یادوں کا جشن" کے صفحات ایسے سینکڑوں واقعات سے لبریز ہیں۔ یہ کتاب صحیح معنوں میں یادوں کا جشن ہے۔ تخیلی یادوں کا نہیں، واقعاتی یادوں کا جشن سے بیدی صاحب کی رنگارنگ شخصیت عبارت ہے ___

بیدی صاحب کا سلسلۂ نسب براہِ راست سکھ دھرم کے بانی بابا گورو نانک دیو سے ملتا ہے۔ اس کتاب میں خاندانی بزرگوں، لڑکپن، تعلیم و تربیت، ملازمت، تقرریوں اور تبادلوں کے حالات بھی ہیں۔ مشاعروں شکاروں، زمین داریوں اور دوستیوں کا ذکر بھی ہے اور برگزیدہ شخصیتوں کے خاکے اور لطائف و ظرائف بھی ہیں۔ ہر جگہ بیدی صاحب کی شخصیت صاف شفاف دکھائی دیتی ہے۔ بے لوث و بے ریا، انسانیت کا درد شناس، خوش مذاق و خوش باش انسان، جو خوش وقتی کو زندگی کا سب سے بڑا انعام سمجھتا ہے اور جو دوسروں کے لئے بھی اسی انعام کو ارزانی رکھنا چاہتا ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب کی عمر کا بڑا حصہ، منصفی اور مجسٹریٹی میں گزرا ہے۔ اس طرح کے سینکڑوں واقعات انہوں نے اپنی کتاب میں قلم بند کئے ہیں۔ جب حق و انصاف کا ساتھ دینا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہوتا ہے لیکن بیدی صاحب نے حتی الامکان مظلوم کا ساتھ دیا اور جہاں تک بن پڑا انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ پولیس کے بارے میں، آنند نرائن ملّا صاحب نے الٰہ آباد ہائی کورٹ کے اپنے فیصلے میں جو رائے دی تھی وہ دوسروں کو یاد ہو، نہ ہو، اُردو والوں کو خوب یاد ہے۔ بیدی صاحب نے ل پور کے واقعے کا ذکر کیا ہے کہ اُن کے پاس ایک ملزم کا کیس آیا جس پر بیلوں کی چوری کا الزام تھا۔ جب مقدمہ پیش ہوا تو تھانیدار نے اُن سے تخلیے میں کہا کہ ملزم ایک نہایت شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ صحبتِ بد میں آ کر اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ اس کو جیل بھیجنے کے بجائے اُس سے نیک چلنی کی ضمانت لے لی جائے۔ اگر جیل بھیجا گیا تو عادی ملزموں سے اس کا میل جول رہے گا اور اُس کے سدھرنے کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ بیدی صاحب نے ایسا ہی کیا۔ اگلے دن اتفاقاً ڈی، ایس، پی سے اُن سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ایک درخواست سرکار کر اُن کے سامنے رکھدی۔ یہ درخواست اُسی تھانیدار کی تھی۔ میں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ایک ایسے خاندان کے فرد کو گرفتار کیا تھا جس سے پولیس ہمیشہ خائف رہتی لیکن مجسٹریٹ صاحب نے اُس کو جیل بھیجنے کے بجائے نیک چلنی کی ضمانت پر رہا کر دیا۔ اب اُس کا اِس علاقے میں تھانیدار کے طور پر رہنا شدید ذاتی خطرے کا باعث ہو گا، اسی لئے اُسے کسی اور تھانے میں تبدیل کر دیا جائے۔ یہ درخواست دیکھ کر بیدی صاحب حیران ہوئے اور ڈی ایس پی کو سارا قصہ سنا دیا۔ وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے "بیدی صاحب آپ ابھی نئے نئے آئے ہیں، پولیس والوں کا اعتبار تو اُن کے والدین بھی

نہیں کرتے۔"

رواداری اور اتحاد پسندی کے بارے میں اُن کا یہ بیان خاص طور پر لائق توجہ ہے، اور جہاں تک میں نے دیکھا ہے، اس پر وہ لفظاً لفظاً عمل کرتے ہیں۔

بیدی صاحب کے بارے میں ہر شخص کو معلوم ہے کہ اُن کے شام کے معمولات بندھے ہوئے ہیں۔ وہ یا تو کلب سے ہو کر آتے ہیں اور اگر کلب کا وقت ہو جائے تو کہیں پر ہوں، کیسے اہم جلسے یا محفل میں کیوں نہ ہوں، تقریر کر کے یا کلام سُنا کے خاموشی سے نکل جاتے ہیں۔ اس بارے میں اُن کا مسلک، بیربل کا سا ہے۔ کچھ اُمرا نے اکبر سے شکایت کی اور کہا کہ بیربل شرابی ہے۔ اکبر نے کہا میں ماننے کو تیار نہیں آزمائش کے لئے ایک رئیس کے یہاں دعوت کا انتظام کیا گیا۔ اکبر پردے کے پیچھے سے منظر دیکھ رہا تھا۔ دورِ جام شروع ہوا۔ بیربل نے جام سے کہا: تجھ میں کیا خوبی ہے اور خود ہی جواب دیا کہ میں دن بھر کی تھکان اتار دیتا ہوں۔ اس پر بیربل جام چڑھا گیا۔ دوسرا دور شروع ہوا، بیربل کو جام پیش کیا گیا۔ بیربل نے پھر وہی سوال کیا کہ بتا تجھ میں کیا گُن ہے اور پھر خود ہی جواب دیا کہ میں تمام غم غلط کر دیتا ہوں، یہ کہہ کر بیربل یہ جام بھی نوش کر گیا۔ اکبر سے حاسد امرا نے کہا "اب تو حضور کو یقین آیا" یک نہ شُد دو شُد"۔ اتنے میں دوسرا دور شروع ہوا اور تیسرا جام پیش کیا گیا۔ بیربل نے اسی طرح پوچھا کہ بتا تجھ میں کیا خوبی ہے اور خود ہی جواب دیا کہ میں عقل پر پردہ ڈالنا شروع کر دیتا ہوں۔ یہ کہتے ہی بیربل نے جام کو ٹھکرا دیا۔ بیدی صاحب کا قول ہے کہ مجھے اُن لوگوں سے بے حد نفرت ہے جو شراب کو بُرا سمجھتے ہیں لیکن جو شراب خوری سے کہیں زیادہ بُری علتوں میں گھرے رہتے ہیں، مثلاً مکر و ریا، فریب دہی، دروغ گوئی، بدکرداری، رشوت خوری وغیرہ۔ اُن کا خیال ہے کہ شراب پہ اعتراض کرنے والوں میں اکثر و بیشتر ایسی بُرائیاں پائی جاتی ہیں۔

کثرت شراب نوشی کو بیدی صاحب بے حد معیوب سمجھتے ہیں "شہیدانِ مے" کے عنوان سے انہوں نے بعض ایسے شعرا کا ذکر کیا ہے جو شراب کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے اور وقت سے بہت پہلے لقمۂ اجل بن گئے۔ مثلاً نریش کمار شاد، شیو کمار بٹالوی، مجاز، اختر شیرانی وغیرہ۔ شاد اور مجاز کے سینکڑوں واقعات مشہور ہیں۔ بیدی صاحب نے لکھا ہے کہ انہوں نے شاد کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ باز نہیں آیا۔ جیمس فورڈ کلب کے ایک مشاعرے میں جب شاد کی باری آئی تو وہ بہت

بجھے بجھے اور مریل انداز سے کلام سنانے لگا۔ وقفہ ہوا تو بیدی صاحب نے بیرے سے کہا کہ وہ شاد کو ایک چھوٹا پیگ وہسکی کا پلا دے تاکہ وہ کچھ موڈ میں آکر پڑھے۔ جب مشاعرہ پھر شروع ہوا اور شاد کو بلایا گیا تو وہ پھر اسی مریل آواز سے پڑھنے لگا۔ بیدی صاحب نے ٹوکا "شاد ذرا سنبھل کر موڈ میں آکر پڑھو۔ شاد نے کہا: حضور! خطا معاف، ایک چھوٹے پیگ سے تو آواز اسی طرح نکلے گی"۔

بیدی صاحب کی کتاب بیسویں صدی کی ادبی شخصیات کا بیش بہا مرقع ہے، جوش ملیح آبادی، خواجہ محمد شفیع، پنڈت ہری چند اختر، سر شنکر لال، خواجہ حسن نظامی، شیو راج بہادر، حیرت بدایونی، شنکر پرشاد سمیع اللہ قاسمی، سائل دہلوی، شاہدہ نکہت، بسمل سعیدی، بسمل شاہجہانپوری، ساحر ہوشیار پوری، اختر شیرانی ملا واحدی، گوپی ناتھ امن، مرلی دھر شاد، شکیل بدایونی، ظریف دہلوی، سید محمد جعفری، ساحر ہوشیار پوری، کیسی کیسی ہستیوں سے اس نگار خانے میں ملاقات ہو جاتی ہے اور بعض خاکے تو اتنے مکمل ہیں کہ جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم اِن لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ بیدی صاحب کی قوتِ مشاہدہ اور حسِ مزاح ایسی زبردست ہے کہ ہر شخصیت پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ بیدی صاحب کو مخالفوں اور حاسدوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جب دہلی میں سٹی مجسٹریٹ تھے، اِن دنوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حاسد و تنگ ظرف لوگ کسی کو کامیاب دیکھ کر عجیب و غریب ہتھکنڈوں پر اُتر آتے ہیں۔ اپنی شاعری کے ضمن میں کھُل کر ذکر کیا ہے کہ دہلی کے زمانۂ قیام میں ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ خود شعر نہیں کہتے۔ سرکاری افسر ہیں، اس لئے اپنے رعب سے اوروں سے شعر کہلواتے ہیں اور انھیں اپنا کہہ کر سناتے ہیں۔ اس الزام تراشی میں کچھ سر کردہ صحافی بھی شریک تھے۔ نہ صرف اخباروں میں بیدی صاحب کے خلاف لکھا جاتا رہا بلکہ پوسٹر بازی بھی ہوتی تھی۔ بیدی صاحب، نے لکھا ہے کہ اس طرح کی تہمت مجھ سے بھی پہلے سینکڑوں شاعروں پر ہر دور میں لگتی رہی ہے، حالانکہ لوگوں نے شیکسپیر تک کو نہیں چھوڑا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اُردو میں فی البدیہہ شعر گوئی کی کسوٹی موجود ہے۔ چنانچہ جب یہ پروپیگنڈہ حد سے زیادہ بڑھا تو بیدی صاحب نے اپنی کوٹھی واقع نئیس ہزاری میں دہلی کے بہت سے شاعروں نقادوں اور صحافیوں کو چائے کی دعوت دی۔ جب تواضع ہو چکی تو اپنا مدعا ظاہر کیا کہ کیوں نہ اسی وقت مصرع طرح تجویز کیا جائے اور فی البدیہہ شعر کہے جائیں۔ خواجہ شفیع۔ ماہر القادری

شکیل بدایونی سب موجود تھے۔ مصرع تجویز ہوا تو بہت سے حضرات یہ کہہ کر کہ "میں ابھی حاضر ہوا کھسک لئے"، باقی حضرات نے شعر کہے اور سنائے۔ بیدی صاحب نے فی البدیہہ مشاعروں کا سلسلہ دو برس تک جاری رکھا اور نوا اور داغ، بیخود اور سائل جیسے اساتذہ کی غزلوں پر بھی غزلیں کہی گئیں۔ بفضلہٖ سرخروئی ہوئی اور بالآخر جو بدترین دشمن تھے، بہترین دوست بن گئے'۔

بیدی صاحب کی شخصیت کا ایک نہایت روشن پہلو، اُن کی نکتہ رسی اور بذلہ سنجی ہیں۔ لکھتے ہیں ایک محفل میں جب جوشؔ اپنی تہلکہ خیز نظم "گلبدنی" سنا رہے تھے تو والہانہ داد دیتے ہوئے بیدی صاحب نے کہا: حضرات ملاحظہ ہو، ایک پٹھان کیسی اچھی نظم سنا رہا ہے"۔ جوش صاحب نے فرمایا: "حضرات یہ بھی ملاحظہ ہو کہ ایک سکھ کتنی اچھی داد دے رہا ہے"۔ بیدی صاحب خواتین کے بڑے قدردان ہیں۔ شاعرات کو مشاعرہ کا اہم جُز تصوّر کرتے ہیں۔ ایک بار ایک شاعرہ غزل سنا رہی تھیں، ردیف تھی، "رہا ہوں میں"۔ یعنی جارہا ہوں میں"، یعنی آرہا ہوں۔ غزل پر بہت داد مل رہی تھی۔ بیدی صاحب نے ازراہِ ہمدردی کہا۔ ان کے گھر والوں کو مطلع کردیا جائے، خیال رکھیں ان کی جنس تبدیل ہو رہی ہے"۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ جب پہلی بار اسٹوڈنٹ یونین کے لوگ بلانے آئے تو انہوں نے دعوت قبول کرلی، بعد میں پتہ چلا کہ وہاں کا مشاعرہ تو ہلڑ بازی کے لئے بدنام ہے۔ طلبا ہر شاعر کی نقل اُتارتے ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایک مشہور شاعر کا قصہ بھی سنایا گیا کہ اس نے معاوضہ دگنا طلب کیا۔ لڑکوں نے پوچھا یہ کیوں تو اُس شاعر نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ میرا معاوضہ تو اتنا ہی ہے جتنا پہلے لیا کرتا تھا، لیکن باقی رقم ہوٹ ہونے کا معاوضہ ہوگی۔ بیدی صاحب کا بیان ہے کہ وہ 'ہاں' کر چکے تھے، کس منہ سے انکار کرتے، جب مشاعرے میں پہنچے تو طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آج جب میں اس مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے گھر سے روانہ ہوا تو اپنی بیوی سے کہا: خدا کی بندی، میرا کہا سنا معاف کردینا۔" وہ بے چاری حیران ہو کر پوچھنے لگی خدانخواستہ کیا بات ہے، ایسی بات تو آپ نے پہلے کبھی نہیں کہی۔ اس پر بیدی صاحب نے کہا، بی بی، کہا سنا اس لئے معاف کرا رہا ہوں کہ مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشاعرے میں شریک ہونا ہے۔ خدا خیر کرے، اس پر قہقہہ بلند ہوا اور طلبا نے بے حد پذیرائی کی۔

جوش ملیح آبادی کے بارے میں اُن کا یہ واقعہ خاصا مشہور ہے کہ "آجکل"، کے دفتر اولڈ سکریٹریٹ میں پنڈت ہری چند اختر، عرش ملسیانی، بسمل سعیدی، جگن ناتھ آزاد اور مانی جائسی، جوش صاحب کے

پاس بیٹھے ہوئے تھے، ہری چند اختر کی عادت تھی کہ اُردو میں بات کرتے کرتے پنجابی میں رواں ہو جاتے تھے، جوش صاحب نے فوراً ٹوک کر کہا۔ پنڈت جی یہ تو جہنم کی زبان ہے"۔ بیدی صاحب نے فوراً کہا: جوش صاحب آپ ابھی سے یہ زبان سیکھنا شروع کر دیں تاکہ آخری جائے قیام میں زحمت نہ ہو۔"

بیدی صاحب کی نظامت کے بھی کئی واقعات مشہور ہیں۔ خدا بخشے علامہ انور صابری بڑی خوبیوں کے شاعر تھے۔ ہوم منسٹر ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو ایک مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے، نظامت بیدی صاحب کی تھی۔ جب انور صابری مائیک پر تشریف لائے تو حسبِ عادت انہوں نے پہلے تقریر شروع کر دی: کہ صاحبِ صدر اِس وقت مجھے پہچانتے بھی نہیں لیکن میں اور وہ الہ آباد جیل میں اکٹھے تھے۔ بیدی صاحب نے کہا" بیشک! ایسا ہی ہوگا لیکن دونوں کے جرائم کی نوعیت الگ الگ ہوگی"۔ ایک بار کسی مشاعرے کے دوران جب علامہ انور صابری مائیک پر تشریف لائے تو فوٹو گرافر نے اُن کی تصویر لے لی۔ مولانا ازراہِ انکسار کہنے لگے "بھائی میری فوٹو کس لئے لے رہے ہو؟" فوراً جواب ملا۔ "مولانا، یہ بچوں کو ڈرانے کے کام آئے گی"۔ غرض۔ بیدی صاحب، جہاں بھی ہوں، محفل کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ 'یادوں کا جشن' میں بیدی صاحب کی نکتہ رسی اور داستان سرائی نے ادبی تاریخ کے بہت سے واقعات کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ بیدی صاحب کے لئے یہ کہنا کہ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ رسمی اور چھوٹی بات ہے جس دور سے اُن کا تعلق رہا ہے وہ دور بھی بڑا پُر بہار تھا۔ اپنے کارناموں اور خدمات سے یہ لوگ اُردو کے ادبی مرقعوں میں کیسے کیسے رنگ بھر گئے۔ اب اس دور کی نشانیاں چند ہی رہ گئی ہیں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر جیسا باغ و بہار اور بھرپور انسان اور اُردو کا عاشقِ صادق روز روز پیدا نہ ہوگا۔ ہمارے لئے یہ سعادت کم نہیں کہ ہم نے انہیں دیکھا، انھیں سنا، اُن کی ہم نشینی کا شرف حاصل کیا اور اُن کی شفقتوں اور کرم فرمائیوں سے فیض یاب ہوئے؛ ع

سنتے ہیں عشق نام کے گذرے ہیں اِک بزرگ
ہم لوگ سب مُرید اُسی سلسلے کے ہیں!"

ساحرؔ ہوشیارپوری

ستیم شِوم سُندرم

ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد کبھی ماضی بعید میں جھانکتا ہوں تو متعدد بزرگوں
دوستوں اور عزیزوں کے چہرے سامنے آجاتے ہیں۔ شکلیں اُبھرتی ہیں، مٹ جاتی ہیں،
کچھ صورتیں نمُودار ہوتی ہیں تو آہستہ آہستہ اُن کے خدوخال مسخ ہونے لگتے ہیں اور چہرے
چہرے اِس طرح متشکل ہو جاتے ہیں کہ میں نقش بہ دیوار ہو کر اُن کو پہروں دیکھتا رہتا
ہوں۔ ان میں سب سے نمایاں ایک ایسا چہرہ ہے جو وجاہت، دل کشی اور تبسم زیرِ لب
لئے ہوئے سامنے آتا ہے تو پھر اوجھل نہیں ہو پاتا۔ اس چہرے کا نام ہے کنور مہندر سنگھ
بیدی سحرؔ جو میرے مربیؔ بھی ہیں، محسن بھی، برادرِ مکرّم بھی اور خلوت و جلوت کے ساتھی بھی۔
ہزاروں یادیں، سینکڑوں واقعات اور بے شمار رنگین و سنگین حکائتیں ان کی ذات سے
ذہن میں محفوظ اور دل پر مُرتسم ہیں۔

۱۹۴۳ء میں آل انڈیا ریڈیو، سے یومِ داغؔ کا مُشاعرہ نشر ہو رہا تھا۔
ہندوستان کے سبھی معروف اور قابلِ ذکر شعرا اس میں شریک ہوئے تھے۔ میں
دِلّی سے سینکڑوں میل دور بیٹھا ہوا جگرؔ، سائلؔ اور مجازؔ کے کلام سے لُطف اندوز
ہو رہا تھا کہ ایک نئی آواز سُنائی دی۔

ہ حُسن پھر محوِ خود نمائی ہے ٹل نہیں سکتی جس کی آئی ہے
بے وفا مجھ کو سوچ کر کہنا مُنہ سے نکلی تو پھر پرائی ہے
سجدہ و عشق میں ہے فرق اتنا بندگی یہ ہے وہ خدائی ہے
عشق موزوں ہے ضبط کی حد تک اِس سے گزرے تو خود نمائی ہے

منجھا ہوا ترنم، دہلی کی ٹکسالی زبان اور سلیس اندازِ بیان۔ سامعین کی واہ واہ اور مشاہیر کی تحسین آفرین کے درمیان شاعر نے مقطع پڑھا

تا یہ شکوہ فِراق سحؔر زندگی مستقل جدائی ہے

اور ناظمِ مشاعرہ نے اعلان کیا "ابھی آپ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحؔر سے اُن کا کلام سُن رہے تھے اردو شاعری میں میرے لئے یہ ایک نیا نام تھا۔ اس فن کا سے ملنے اور بالمشافہ کلام سُننے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پوچھ تاچھ پر دوستوں سے معلوم ہوا کہ سحؔر صاحب دِلّی میں کسی اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔ دو تین بار دِلّی جانے کا اتفاق بھی ہوا لیکن باوجود کوششوں کے ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔

ایک بار طالبؔ دہلوی مرحوم کے ہمراہ خواجہ محمد شفیع کے مکان پر اردو مجلس کی نشست میں بھی اسی غرض سے شریک ہوا لیکن وائے مایوسی کہ سحؔر صاحب اس روز دِلّی سے باہر گئے ہوئے تھے اور مجھے دوسرے دِن ہی دلّی کو خیر باد کہہ دینا تھا پھر میں کاروباری مصروفیات میں اس قدر الجھ گیا کہ سحؔر صاحب سے ملاقات کرنے کا اشتیاق تو قائم رہا لیکن اس جذبے کا اضطرار و اضطراب کسی حد تک کم ہو گیا۔

لاہور میں بھی ہمارا کاروبار تھا۔ تقسیم مُلک کا اعلان ہوتے ہی اسے بند کر دینا پڑا۔ نئے کام کی تلاش شروع ہوئی اور ضلع کانگڑہ کے محکمۂ سول سپلائی کی جانب سے کپڑے کی ایجنسی مل گئی۔ نگروٹہ میں ایک وسیع و عریض کوٹھی میں دفتر، گودام اور رہائش کا معقول انتظام کر کے کام شروع کر دیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو حکّام اعلیٰ نے جشن آزادی منانے کا "دھرم شالہ" میں اہتمام کیا اور اس سلسلے میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں شرکت کے لئے مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ انعقادِ تقریب سے چند روز قبل۔ ان کو

بھرپور تعاون دیا۔ ۱۵ اگست کی صبح کو جناب جگن ناتھ کمال کرتارپوری اور گلشن نارنوی کو ہمراہ لے کر دھرم شالہ پہنچا۔ کوتوالی بازار کے میدان میں اس تقریب کے لئے ایک وسیع پنڈال آراستہ کیا گیا تھا۔ مقررہ وقت پر سردار کپور سنگھ ڈپٹی کمشنر نے قومی پرچم لہرایا۔ قومی ترانے کی دھن بجائی گئی۔ یومِ آزادی کی اہمیت پر مختصر تقریریں ہوئیں اور پھر مشاعرہ کا اعلان کیا گیا۔ شعرا حضرات اسٹیج پر آ گئے۔ کھادی کے کرتے اور چوڑی دار پاجامے پر نہرو جیکٹ میں ملبوس ایک وجیہہ و شکیل شخصیت نے مائیک سنبھالا اور مشاعرہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے نپے تلے انداز میں چند جملے ادا کئے اور مہمان شعرا کو دعوتِ سخن دینے سے پہلے اپنے کلام سے ہی مشاعرے کا آغاز کیا۔ پہلا مصرع سُننا تھا کہ نہاں خانۂ دِل میں ایک بجلی سی کوند گئی یہ دِل آویز آواز تھی جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ صاحب کی۔ چار برس سے جس آرزو نے بے قرار و بے تاب کر رکھا تھا وہ نگروٹہ، میں بر آئی۔ عجیب عالم تھا اس وقت میرے اضطرب و اشتیاق کا، اگر آدابِ محفل کا لحاظ نہ ہوتا تو اٹھ کر دست بوسی کی مسرت حاصل کر لیتا۔ اپنا کلام ختم کر کے انھوں موجود شعرا کو باری باری کلام سُنانے کی دعوت دی اور اختتامِ تقریب پر ان سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ میں مُہر بہ لب دیکھتا ہی رہ گیا اور پھر یہ سوچ کر دل کو تسلّی دی کہ سحرؔ صاحب دھرم شالہ ہی میں ہیں تو اب اُن کے نیاز حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ جائے قیام پر آئے تو یہ پیغام مِلا کہ اسی شام کو سحرؔ صاحب نے دھرم شالہ کلب میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا ہے اور ہم کو اس میں شریک ہونا ہے۔ شام کو کلب میں دورِ جام کے ساتھ دورِ کلام بھی جاری رہا اور شعر و سخن کی یہ مخصوص نشست جب رات ڈھلے ختم ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ اس پہلی ملاقات ہی میں تکلّفات و تعارف کی تمام حدیں سمٹ کر رفاقت و مقاربت کے لازوال جذبے میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ یہ تھا اُن کے دلی خلوص، خوش اخلاقی اور عالی ظرفی کا کرشمہ۔ میں ہفتے میں دو، تین بار دھرم شالہ آتا تو اُن کے یہاں ضرور حاضر ہوتا اور بیدی صاحب جب "پالم پور"، "جوگندر نگر"، "نیول" وغیرہ سرکاری دورے پر جاتے تو میرے غریب خانے پر بھی تشریف لاتے۔

ڈیڑھ، دو مہینے تک خوش اوقاتی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ مجھے کسی ضروری کام کے لئے ہوشیارپور جانا پڑا اور چند روز بعد واپس "نگروٹہ" پہنچا تو معلوم ہوا کہ اہلِ دِلّی کے پرزور مطالبے پر وزیرِ اعظم پنڈت جواہرلال نہرو کی ہدایتِ خاص کی روشنی میں بطور سٹی مجسٹریٹ انہیں دہلی میں تعینات کر دیا گیا ہے تاکہ وہ راجدھانی کے ماحول کو خوشگوار بنانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکیں۔ اسی اثنا میں میرے ذاتی حالات نے کچھ ایسا عجیب سا پلٹا کھایا کہ میری زندگی کا شیرازہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اس غیر متوقع طوفان کو پسپا کرنے اور الجھنوں کو سلجھانے کی ہزار کوششیں کیں لیکن بے سود اور بالآخر نو جنوری ۱۹۴۸ء کو میں ترکِ وطن کر کے دہلی پہنچ گیا۔ ایک دوست کے گھر سامان رکھا اور بیدی صاحب کی کوٹھی کا رُخ کیا۔ وہاں سینکڑوں اشخاص کا تانتا لگا ہوا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو لپک کر آئے۔ میں کورنش بجا لایا۔ فرمایا "کب آئے؟ کیسے آئے؟" میں نے عرض کیا کہ خادم مشرقی پنجاب کے ایک ہندو مہاجر کی حیثیت میں آج ہی دِلّی میں وارد ہوا ہے۔ بیدی صاحب کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آئی۔ مجھے ایک طرف لے گئے اور فرمایا کہ شام کو آجایئے مفصّل باتیں ہوں گی۔ شام کو ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنی رُوداد تفصیل سے گوش گزار کر دی۔ نہایت سنجیدگی سے سنتے رہے۔ میری رام کہانی ختم ہوئی تو کہا "اب تم نے یہ قدم اٹھا ہی لیا ہے تو ہمّت نہ ہارنا۔ حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنا۔ اللہ مدد کرے گا۔ میں نے تمہیں چھوٹے بھائی کی طرح مانا ہے۔ مجھے ایک روٹی ملے گی تو آدھی آدھی بانٹ لیں گے" ان کی اس حوصلہ افزائی نے مجھے بڑا سہارا دیا اور یہ حقیقت ہے کہ ان اڑتیس ۳۸ برسوں میں مجھے ایسی شفقت، محبّت، خلوص اور سرپرستی سے نوازتے رہے ہیں جو ایک برادرِ بزرگ کو ہی زیب دے سکتی ہے۔

گذشتہ چند برسوں سے میں فرید آباد میں خرابیٔ صحت کی بنا پر گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا ہوں اور ان کی خدمت میں پابندی سے حاضر ہونے کی سعادت سے محروم ہوں لیکن میری نیازمندی میں ذرّہ بھر بھی فرق نہیں آیا اور ان کی نوازشیں اور الطاف و اکرام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ میں نے جب بھی یاد کیا وہ سَو کام چھوڑ کر تشریف

لائے اور میری یاد نے اُن کے دِل میں ذرا چٹکی لی تو وہ از خُود کچّے دھاگے سے بندھے ہوئے میرے غریب خانے پر جلوہ افروز ہوئے ہیں اللہ کرے یہ رشتہ مروت و موانست قائم و دائم رہے۔

بیدی صاحب نے اپنی سوانح حیات "یادوں کے جشن" میں متعدد واقعات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اُن میں سے اکثر واقعات کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ اس مضمون میں اُن کا اعادہ محض تحصیل لاحاصل ہے ۔ لہذا چند ایسے واقعات رقم کرنا چاہتا ہوں جن کو وہ قصداً یا سہواً احاطہ تحریر میں نہیں لا سکے لیکن میرے خیال میں ان کا بیان کرنا اس لئے ضروری ہے کہ وہ ان کے کردار، مزاج اور خواص عوام میں اُن کی مقبولیت نیز ان کی ذات سے وابستہ عقیدت واحترام کے احساسات وجذبات کی بڑی حد تک ترجمانی کرتے ہیں اور ان کی اعلیٰ ظرفی، نیک نیتی، راست گفتاری اور ان کے رگ وپے میں رچے بسے زندگی کے طرزِ عمل کی نشان دہی کرتے ہیں۔

۱۹۵۶ء میں پہلی بار، وہ کراچی تشریف لے گئے تو دِلّی کے ایک مہاجر خاندانی رئیس کے ہوٹل میں قیام رہا۔ میں ان کے ہم رکاب تھا۔ ڈیلی گیشن کے لئے چار کمرے مخصوص کر دِئے گئے تھے سات روز وہاں قیام رہا۔ ہوٹل کی طرف سے میزبانی کے جملہ فرائض نہایت خوش اسلوبی سے ادا ہوتے رہے اور وقتِ رخصت منتظمینِ مشاعرہ نے اخراجات کی پیش کی تو ہوٹل کے مالک جمیل صاحب نے خندہ پیشانی سے اسے قبول نہ کرتے ہوئے صِرف ایک جُملہ کہا "بیدی صاحب آپ کے مہمان نہیں بلکہ پاکستان کے مہمان ہیں اور میں بھی پاکستان ہی کا ایک شہری ہوں۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنے دیجئے۔"

مشاعرے کے دُوسرے روز ہی سے بیدی صاحب کے احباب، کراچی کے ادبا و شعراء اور دہلی سے کراچی میں جا کر بسے ہوئے مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اِن مہمان درمہمان تک کی خاطر تواضع میں ہوٹل کی جانب سے کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کے ساتھ ہی ادبی نشستوں، اعزازی تقریبوں اور ملاقاتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ بھی جاری رہا۔ ناشتہ کر کے نکلتے تو رات کے بارہ بجے سے قبل

واپسی نہ ہوتی۔ پہلے روز ہی ہم ہوٹل سے نیچے اُترے تو ایک ڈرائیور نے مودّبانہ سلام کیا۔ ہم اس کی گاڑی میں بیٹھ گئے اور وہ ہمیں منزلِ مقصود پر لے گیا وہاں ایک ، ڈیڑھ گھنٹے نشست جمی ، فارغ ہو کر باہر آئے تو اُسی ڈرائیور کو اپنا منتظر پایا۔ ہم نے یہ خیال کیا کہ میزبان نے ہمیں ہوٹل سے لانے اور واپس لے جانے کے لئے یہ انتظام کر رکھا ہوگا۔ سہ پہر کو ہم نیچے اُترے تو اسی ڈرائیور نے پھر مودّبانہ سلام کیا اور دریافت کرنے پر کہنے لگا کہ میں تو ایک ادنیٰ ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ آپ کے یہاں قیام کے دوران میں اگر مجھے خدمت کرنے کا موقع دیا جائے تو بندہ پروری ہوگی۔ ٹیکسی کی ہمیں ضرورت تو تھی ہی۔ عمدہ نئے ماڈل کی کار اور مہذّب و ہوشیار ڈرائیور ، ہمیں اور کیا چاہئے تھا؟ رات گئے تک گھومتے رہے۔ واپس ہوٹل پہنچے تو بیدی صاحب نے کرایہ دریافت کیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اُن کے سوال کو ٹالتے ہوئے نہایت عاجزی سے عرض کیا "حضور! فی الحال یہ فرمایئے کہ صبح کس وقت حاضر ہو جاؤں؟ آپ تو ابھی چند روز یہاں قیام فرمائیں گے۔ میں کرائے کا حساب نوٹ کر رہا ہوں۔ رخصت ہوتے وقت آپ یکمشت عنایت فرما دیں گے تو یہ رقم میرے کسی کام آجائے گی" بیدی صاحب مطمئن ہو گئے۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور سات روز تک ہماری ڈیوٹی میں رہا لیکن بیدی صاحب کو جس روز دہلی کے لئے روانہ ہونا تھا نہ وہ ٹیکسی نظر آئی نہ ڈرائیور۔ واقعی ؏

؏ تول سکتا ہے کون خوشبو کو

اللہ جانے یہ ٹیکسی ڈرائیور کا جذبۂ خلوص و ایثار تھا یا بیدی صاحب کے کسی مدّاح کا اظہارِ عقیدت مندی! اسی سفر کا تیسرا واقعہ جناب جوشؔ ملیح آبادی سے تعلق رکھتا ہے جو چند ماہ قبل ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے اور ان دِنوں کراچی میں مقیم تھے۔ ہندوستان ڈیلی گیشن کے اعزاز میں انڈین ہائی کمیشن نے لنچ کا اہتمام کیا تو اس میں کراچی کی مقتدر ادبی اور سماجی شخصیتوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ حضرتِ جوشؔ کا نام سرِفہرست تھا۔ بیدی صاحب اور میں موٹر کار میں سوار "بندر روڈ"

سے گزر رہے تھے کہ میری نظر جوشؔ صاحب پر پڑی جو ایک بس اسٹینڈ پر کھڑے تھے۔
میں نے بیدی صاحب کو متوجہ کیا۔ اُنھوں نے بھی جوشؔ صاحب کو دیکھا لیکن فوراً نگاہ
پھیر لی۔ میں نے عرض کیا "اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو گاڑی رکوالی جائے اور جوشؔ
صاحب کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔ وہ بھی تو انڈین ہائی کمیشن کے وہاں مدعو ہیں"، بیدی
صاحب کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا "جی تو میرا بھی
یہی چاہتا ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ اِس طرح ان کی خودداری کو ٹھیس پہنچے گی۔ ہم نے اُن
کو بس اسٹینڈ پر کھڑے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ اس کا نفسیاتی ردِّ عمل ناخوشگوار بھی ہو سکتا
ہے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ یہ راز ہم دونوں تک ہی محدود رہے"، جوشؔ صاحب کی زندگی
میں تو یہ راز ہی رہا اب وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں تو میں نے اس واقعے کا ذکر کر دیا ہے۔
بیدی صاحب نے جوشؔ صاحب کی خوشنودی کے لئے اپنی نیازمندی کے اعتراف
میں کیا کچھ نہیں کیا یہ ایک الگ داستان ہے۔

۱۹۵۸ء میں بیدی صاحب ہندوستانی کی کھیل کود ٹیم کے سربراہ اور شاعروں
کے کاروانِ سالار بن کر تقسیم ملک کے بعد پہلی بار لاہور گئے۔ اس قیام کے دوران میں
چند اہم واقعات اور مشاہدات کا مذکور توان کی کتاب "یادوں کا جشن"، میں صراحت
سے موجود ہے البتہ جس انوکھے تجربے کو انہوں نے غالباً خلافِ مصلحت سمجھ کر قلم بند
نہیں کیا، میرے خیال میں اُسے بیان کر دینا ازبس ضروری ہے۔ اس انڈو پاک
مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان سے پندرہ ۱۵ شاعر مدعو تھے اور یہ
فہرست بیدی صاحب ہی نے مرتب کی تھی۔ مشاعرہ رات کے دو ۲ بجے نہایت
کامیابی سے اختتام پذیر ہوا اور اس کے بعد کئی روز تک نشستوں اور دعوتوں کا
سلسلہ جاری رہا۔ مشاعرے کے دوسرے روز داعیان، بیدی صاحب کے پاس
مہمان شعرا کی فہرست لے کر آئے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ہر شاعر کے نام کے آگے
معاوضے کی رقم تحریر فرما دیں۔ چنانچہ بیدی صاحب نے یہ خوش گوار فرض بھی ادا کر دیا۔
منتظمین نے رقم کا میزان کر کے مبلغات ان کی خدمت میں پیش کر دیئے اور بیدی

صاحب نے یہ روپے، فہرست کے ساتھ میرے حوالے کر دیئے۔ مُنتظمین رخصت ہوئے
تو میں نے شعراء حضرات کی خدمت میں فہرست کے مُطابق ان کا ہدیہ تقسیم کر دیا۔ معاوضہ
معقول تھا۔ سب نے بہ خوشی قبول کر لیا۔ سوائے دو مترنم شاعروں کے جو اس ہدیہ کو دیکھتے
ہی چراغ پا ہو گئے اور بلند آوازوں میں کہنے لگے کہ اس سے زیادہ تو ان کو ہندوستان
کے معمولی مشاعروں میں مل جاتا ہے۔ یہ معاوضہ ان کی شاعرانہ عظمت کے منافی ہے اور
اسے قبول کرنا وہ اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ بیدی صاحب بخوبی واقف تھے کہ ہندوستان میں
ان شعراء کو کیا معاوضہ ملتا ہے؟ لہٰذا ان کے چہرے پر ۲ دو منٹ کے لئے تو خفگی کے آثار
نمودار ہوئے لیکن موقع کی نزاکت کو بھانپ کر وہ سنبھل گئے۔ جناب گوپال متل اور مجھے
مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ دونوں اپنے معاوضے کی رقم ان کو دے دیجیئے۔ ہم نے تعمیلِ
ارشاد کی۔ وہ دونوں شاعر خوش ہو گئے اور شکریہ ادا کرنا تو کجا، بغیر علیک سلیک کئے
رخصت بھی ہو گئے۔ کنور صاحب اُن کی اس نازیبا حرکت پر جھنجھلا گئے پھر فرمایا کہ ان ۲ دو
شاعروں نے بد اخلاقی کا مظاہرہ کر کے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ آئندہ اِن کو کسی بھی مشاعرہ
میں نہ بلاؤں لیکن ہوا یوں کہ جب واپس دہلی آئے تو چیمسفورڈ کلب کے سالانہ مشاعرہ
میں اُن کو دعوتِ شرکت ارسال کر دی۔ میں نے دبی زبان سے پُوچھا کہ حضرت آپ نے لاہور
میں تو اس کے برعکس فیصلہ صادر فرمایا تھا۔ کہنے لگے "اُس وقت میں مغلوب الغضب تھا۔
اور ایسی حالت میں کیا گیا فیصلہ برحق نہیں ہوتا"۔ مزید فرمایا کہ اُنھوں نے تو اپنی بداخلاقی
اور اصلیت ظاہر کر دی، میں اپنی سطح سے گر کر کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکتا جو کسی کے
نقصان اور دل آزاری کا باعث ہو۔

ع وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

کنور صاحب اکتوبر ۱۹۴۷ء میں دوبارہ دہلی آئے تو قریباً ساڑھے پانچ سال تک
بطور سٹی مجسٹریٹ اور محکمۂ بحالیات میں ہاؤسنگ اینڈ رینٹ (HOUSING & RENT
OFFICER) آفیسر تعینات رہے۔ میں بلاناغہ اُن کے دفتر میں یا پھر ان کی کوٹھی پر
قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک روز بعد دوپہر کچہری کے رٹیائرنگ رُوم

میں اُن کے پاس بیٹھا تھا کہ حضرت بیخودؔ مرحوم لاٹھی ٹیکے اور کسی نوجوان کے کاندھے پر ہاتھ رکھے تشریف لے آئے۔ کنور صاحب نے سلام عرض کیا اور بصد احترام کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیخودؔ صاحب گراں گوش تھے۔ عُمر بھی نوّے سال کے لگ بھگ تھی، کرسی پر بیٹھتے ہی کڑک کر بولے "دو نالی بندوق کا لائسنس لینے آیا ہوں شکار کھیلوں گا۔" سُنا ہے کہ عالم شباب میں بیخودؔ صاحب شکار خوب کھیلا کرتے تھے۔ کنور صاحب کو ان کی دل شکنی منظور نہیں تھی۔ ایک سفید کاغذ ان کے سامنے کر دیا اور کہا کہ اس پر دستخط فرما دیجئے میں اس پر درخواست ٹائپ کرالوں گا۔ انشاء اللہ چند روز میں لائسنس مل جائے گا۔ بیخودؔ صاحب بولے "اور بندوق کہاں سے آئے گی؟" کنور صاحب نے کہا کہ اُس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ آپ اطمینان فرمائیں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ فی البدیہہ ایک غزل عنایت فرما دیجئے۔ "دیجئے مصرع" بیخودؔ صاحب نے کہا۔ کنور صاحب نے "جواب کیا ہوگا، ثواب کیا ہوگا" کی زمین تجویز کر دی۔ دو، تین منٹ کے بعد ہی اس زمین میں مطلع فرما دیا اور پھر اسی طرح پر ڈیڑھ، دو منٹ کے وقفے سے جو شعر کہنا شروع کئے تو اپنے مخصوص رنگ میں پانچ اشعار کی غزل مکمل کر کے رکھ دی۔ اُن کی اس غزل کے اشعار کو میں نوٹ کرتا رہا اور یہ غزل میرے پاس محفوظ ہے۔ اِس عمر میں یوں فی البدیہہ شعر کہنا کمالِ شاعری نہیں تو اور کیا ہے؟ غزل ملاحظہ فرمائیے:—

کِسی کے حُسن کا پیدا جواب کیا ہو گا
ابھی ہے اُن کا لڑکپن، شباب کیا ہو گا

کسی کے ہجر نے درگور کر دیا مجھ کو
اب اِس سے بڑھ کے لحد میں عذاب کیا ہوگا

تمام عمر پڑھی ہیں نمازیں زاہد نے
ہزاروں من کا یہ آخر ثواب کیا ہوگا

دعا قبول نہ ہو گی جو حشر کے دن بھی
بنا دے پھر دلِ خانہ خراب کیا ہوگا

بہت ہی بچ کے نکلتی ہے مجھ سے بجلی بھی
اب اس سے بڑھ کے بھلا اضطراب کیا ہوگا

سحرؔ صاحب کے پاس ایک جہازی سائیز کی بیاض تھی۔ مشاعروں اور نشستوں میں یہ بیاض کبھی ان کے ساتھ نہیں گئی۔ غزلیں، رباعیاں، قطعے، نعتیں، منقبت، مرثیے اور طویل نظمیں یونہی حافظے کی مدد سے بے تکان سنا دیتے تھے۔ اُن کی یہ بیاض گھر میں ایک میز پر رکھتی رہتی تھی (اب کئی برس سے مجھے اس بیاض کے دیدار نصیب نہیں ہوئے) ایک روز میں کوٹھی پر حاضر ہوا تو یہ بیاض اُٹھالی۔ کلام بیدی صاحب ہی کا تھا لیکن تحریر اُن کی نہیں تھی۔ مجھے متعجب دیکھا تو فرمایا "تم بھی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو! اس بیاض میں کچھ اشعار تو میں نے خود لکھے ہیں لیکن زیادہ تر فیضؔ جھنجھانوی اور بسملؔ شاہ جہان پوری کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس وقت مجھے ذرا فرصت ہے دو، چار نئی غزلیں کہہ رکھی ہیں۔ میں بولتا جاتا ہوں تم اس بیاض میں نقل کر دو"۔ غالباً اس بیاض ہی کا یہ شاخسانہ تھا کہ دِلّی کے ادبی حلقوں میں یہ افواہ گشت کرنے لگی تھی کہ سحرؔ صاحب خود شعر نہیں کہتے۔ ایک رسالے کے مدیر نے تو "دروغ بر گردنِ راوی" کے تحت اس خبر کو جلی حرفوں میں شائع بھی کر دیا تھا۔ یہ بات بیدی صاحب تک پہنچی تو اُنھوں نے اس کی تردید کے لیئے ایک انوکھا پلان بنایا۔ دہلی کے چند شاعروں اور صحافیوں کو اپنی رہائش گاہ پر چائے پر مدعو کیا۔ اُن کے شایانِ شان خاطر تواضع کی گئی۔ چائے کا دور ختم ہوا تو ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہنے لگے کہ یہ امر میرے لئے باعث فخر و مسرت ہے کہ آج راجدھانی کے ممتاز صحافی اور شعرا حضرات نے میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا ہے۔ میرے متعلق اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ میں خود شعر نہیں کہتا۔ میں فرداً فرداً اس کی تردید نہیں کرنا چاہتا۔ آپ حضرات مناسب سمجھیں تو کوئی صاحب ایک مصرع تجویز فرما دیں اور اس پر طبع آزمائی کر لی جائے۔ شعر کہنے کے لئے دس منٹ کا وقت مقرّر کر لیتے ہیں۔ جتنے بھی شعر ہو جائیں، محفل میں سُنا دئے جائیں، خوش اوقاتی بھی رہے گی اور صلاحیت کا امتحان بھی ہو جائے گا۔ بس پھر کیا تھا! عالم سکوت طاری ہو گیا۔ جس رسالے میں

سحرؔ صاحب کے متعلق خود شعر نہ کہنے کا اعلان شائع ہوا تھا اس کے مدیرِ محترم بھی مہمانوں میں موجود تھے۔ انہوں نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا "بیدی صاحب، آپ ہم سب کے لئے ایک محترم و معزز شخصیت ہیں۔ میں آپ کی تجویز سے بھی پورا اتفاق کرتا ہوں لیکن مصرع طرح پر اشعار کہہ لینے کے باوجود بھی اگر میں اپنے غلط یا درست موقف پر قائم رہوں اور آپ کو شاعر تسلیم نہ کروں تو اس کا کیا علاج ہے؟" مدیرِ محترم کے اس اعلان پر محفل میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔ مدیر محترم نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ بیدی صاحب اُن سے بغل گیر ہو گئے اور یہ محفل بہ خیر و خوبی اختتام پذیر ہوئی۔

؎ بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

ایک اور واقعہ غور طلب ہے۔ علامہ بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی مرحوم نے "فاؤسٹ" کا اردو ترجمہ کیا اور وزیر تعلیم مولانا آزاد مرحوم کو دکھایا۔ انہیں بے حد پسند آیا اور انہوں نے یقین دلایا کہ اس کی اشاعت ہو جائے گی مگر آزاد صاحب وفات پا گئے اور یہ ترجمہ شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکا۔ منور صاحب نے اس کا ذکر بیدی صاحب سے کیا۔ بیدی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ بے فکر رہیں" بیدی صاحب کا ہی یہ سحر تھا کہ پاکستان میں جناب ممتاز حسین کی معاونت سے کتاب چھپی اور منوّر صاحب کو اس کا معقول معاوضہ بھی دیا گیا اس واقعہ کا ذکر منوّر صاحب کے شاگرد دلیپ بادل نے بھی کیا ہے اور اکثر و بیشتر منوّر صاحب بیدی صاحب کے اس جذبۂ انسان دوستی کی بے حد تعریف و توصیف کیا کرتے تھے۔

۱۹۵۱ - ۱۹۵۲ء میں میرے معاشی حالات خراب ہو گئے تھے۔ کوئی مستقل ذریعۂ آمدن نہیں تھا۔ ایک روز جوشِ محبت میں آ کر فرمایا "تم رفیوجی بن جاؤ۔ حکومت مہاجروں کو دوکانات، مکانات اور اراضیات الاٹ کر رہی ہے۔ تمہیں بھی کوئی دکان یا مکان مل جائے گا۔ اُسے کرایے پر اُٹھا دینا اور اس طرح ماہانہ آمدنی کا ذریعہ پیدا ہو جائے گا جس کے باعث بال بچوّں کی پرورش ہوتی رہے گی۔" میں نے کہا "میں تو رفیوجی نہیں ہوں، لاہور میں کاروبار تو تھا لیکن رفیوجی ہونے کے لئے جو ضابطہ ہے، مجھ پر اُس کا اطلاق

نہیں ہوتا" ہنس کر فرمایا "ہزاروں اشخاص نے غلط بیانی کر کے حکومت سے امداد حاصل کر لی ہے۔ تم اپنے لئے نہ سہی، اپنے بچوں کے لئے بھی اتنا نہیں کر سکتے؟ پھر سوچ لو اور کل جواب دے دینا" میں اگلے روز حاضر ہوا۔ فرمایا "کیا سوچا؟" میں نے عرض کیا "میرا ضمیر اجازت نہیں دیتا۔ میں غلط بیانی کا مرتکب ہو کر رُوسیاہ نہیں ہونا چاہتا" میرا یہ فیصلہ سُن کر کچھ افسردہ سے ہو گئے۔ چار، پانچ برس کے بعد میرے حالات قدرے بہتر ہو گئے تو عالی جاہ کو دِلی مسرت ہوئی۔ ایک روز فرمانے لگے "آج مجھے وہ بات یاد آرہی ہے۔ اگر تم میری ترغیب پر غلط بیانی کر کے رفیوجی ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیتے تو صرف تم ہی میری نگاہوں سے نہ گر جاتے بلکہ میں خود بھی اپنی نگاہوں سے گر جاتا اور میرا ضمیر مجھے ہمیشہ کے لئے لعنت ملامت کرتا کہ میرے کہنے پر تم سے یہ غیر انسانی حرکت سرزد ہوئی۔"

بیدی صاحب کی زندگی میں مشاعروں کی ایک خاص اہمیت ہے ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں اردو زبان کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے مشاعرے ایک موثر کردار ادا کرتے ہیں، لہذا جب وہ دہلی میں تھے تو گرد و نواح میں سَو، ڈیڑھ سو میل تک منعقد ہونے والے مشاعروں میں منتظمین کی خواہش پر اکثر شریک ہو جاتے تھے اور اپنے شاعر دوستوں کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ شام کو اجلاس سے فارغ ہوئے، کوٹھی پر آئے، بھگوان سنگھ کی ویگن میں احباب کے ہمراہ سوار ہوئے اور منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔ سفر کے دوران فی البدیہہ شعر ہوتے، لطیفے ہوتے، خوش گپیّاں ہوتیں، دورِ جام بھی چلتا، مشاعرے میں پہنچے، صبحِ کاذب مشاعرہ ختم ہوا اور واپس دہلی آگئے۔ نہائے، دھوئے، دوسرے روز اگر اتوار ہوا تو آرام فرمایا ورنہ مقررّہ وقت پر کچہری پہنچ گئے۔

ایک بار "ایٹہ"، سے کچھ طالب علم آئے۔ شرکتِ مشاعرہ کے لئے ان سے درخواست کی اور یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ بسمل سعیدی، عزیز وارثی، نریش کمار شاد اور ساحر ہوشیارپوری کو بھی اس مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے اپنے ساتھ ضرور لے کر آئیں۔ معقول معاوضہ

پیش کر دیا جائے گا" چناں چہ حسبِ معمول بھگوان سنگھ کی ویگن میں یہ قافلہ شرکتِ مشاعرہ کے لئے روانہ ہوگیا۔ سخت سردی کا موسم تھا رات کے ۲ ½ بجے مشاعرہ اختتام کو پہنچا تو منتظمین نے کہا" بیدی صاحب! آپ ذرا آرام فرمالیں، ہم دس پندرہ منٹ میں شعرا حضرات کے لئے معاوضہ لے کر آتے ہیں"، جس کمرے میں آرام کے لئے 'لئے کہا گیا تھا وہاں صرف ایک پلنگ پر بستر لگا ہوا تھا اور کمرے میں اتنی وسعت نہیں تھی کہ ہم سب فرش پر بھی آسانی سے بیٹھ سکیں۔ ہم نے عرض کیا" حضور! آپ ذرا آرام فرمالیں، منتظمین آجائیں گے تو آپ کو بیدار کر دیا جائے گا"، بیدی صاحب ایسی صورتِ حال دیکھ کر قدرے افسردہ ہوگئے اور کہا کہ بہتر ہوگا کہ آپ سب اس پلنگ پر میرے ساتھ ہی بیٹھ جائیں۔ دس پندرہ منٹ ہی کی تو بات ہے۔ باتوں میں یہ وقت گزار لیتے ہیں۔ انھوں نے پلک جھپکنا تک مناسب نہیں سمجھا۔ ناظمِ مشاعرہ پندرہ منٹ کی بجائے ۱ ½ گھنٹے کے بعد آیا اور لجاجت آمیز لہجے میں کہنے لگا کہ اس مشاعرہ کے لئے ہماری توقع کے مطابق روپیہ جمع نہیں ہو سکا۔ دیگر شعراء کو معاوضہ دینے کے بعد یہ باون ۵۲ روپے کی رقم بچی ہے جو حاضرِ خدمت ہے"، بیدی صاحب نے کہا" صاحب زادے، یہ رقم اپنے پاس ہی رکھئے اور کسی کارِ خیر میں خرچ کر لیجیے گا، ہم لوگ تو پیشہ ور شاعر ہیں!" مشاعرے سے واپس دہلی پہنچے تو بیدی صاحب نے ہم سب لوگوں کو روک لیا اور ملازم سے چائے لانے کو کہا۔ چائے پی چکے تو بیدی صاحب نے اپنی طرف سے ہمیں کچھ مبلغات کی پیش کش کی جسے ہم نے، اُن کے اصرار کے باوجود لینا پسند نہیں کیا۔ بھگوان سنگھ ڈرائیور کو دو سَو روپے بطور کرایہ بھی دینا چاہا مگر وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا کہ حضور! یہ ٹیکسی آپ کی ہے اور میں آپ کا خادم ہوں مجھے آپ کا کرایہ نہیں، آپ کی سرپرستی چاہیئے۔ ڈرائیور کے ان پرخلوص خیالات کو سُن کر یک بیک مجھے کسی کا یہ لافانی شعر یاد آگیا ؎

؎ جس کو کہتے ہیں محبت، جس کو کہتے ہیں خلوص
جھونپڑوں میں ہو تو ہو، پختہ مکانوں میں نہیں

جہاں تک مشاعرے کی نظامت کا تعلق ہے ان کا اپنا منفرد مقام ہے۔ مشاعروں کا ماحول دیکھ کر اور تقدیم و تاخیر کا خیال کئے بغیر وہ شعرا کو دعوتِ کلام دیتے ہیں اور ایسے حسین تعارف کے ساتھ کہ سامعین کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ کسی اچھے اور عمدہ تحت پڑھنے والے شاعر کا تعارف کراتے ہوئے اکثر یہ جملہ کہتے "یہ وہ تحت ہے کہ جس پر ہزاروں ترنّم قربان ہو سکتے ہیں" ظاہر ہے کہ سامعین اور زیادہ متوجہ ہو کر اس کا کلام سنتے ہیں اور شاعر داد سے جھولیاں بھر کر رخصت ہوتا ہے۔ اُن کی نظامت کا یہ کرشمہ ہے کہ مشاعروں کے ماحول میں تازگی اور بیداری کا احساس بدرجۂ اتم جاری و ساری رہتا ہے۔ شاعر کو دعوت کلام دیتے وقت منظوم تعارف کرانے کا انوکھا طریقہ بھی ان ہی کی ایجاد ہے۔ فی البدیہہ شعر کہہ کر شاعر اور سامعین میں ایک ہم آہنگی کا ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر عرشؔ ملسیانی کے بارے میں اکثر یہ شعر فرماتے تھے ؎

؎ معجزہ آپ کو دکھاتا ہوں — عرشؔ کو فرش پر بلاتا ہوں

اور ظفرؔ ادیب کے بارے میں فرماتے ؎

؎ اگر فدائے ادب کو ادیب کہتے ہیں — ظفرؔ ادیب سے بڑھ کر کوئی ادیب نہیں

نابینا شاعر سلیمؔ لکھنوی کے لئے کیا برمحل شعر کہہ کر تعارف کراتے ہیں ؎

؎ رنج سے لے کے درس راحت کا
تو نے ظلمت میں نور دیکھا ہے
گو کہ آنکھیں نہ تھیں مگر تو نے
دل کی آنکھوں سے دور دیکھا ہے

جناب حیرتؔ بدایونی ایک حقیقی اور پرہیزگار بزرگ تھے تھے۔ ان کو سخن سرائی کے لئے درخواست کرتے تو نہایت متانت سے یہ شعر پڑھ دیتے ؎

؎ تلاش تھی ان کی مسجد میں، ندامے خانے سے آئی
یہاں ہیں حضرت علامہ حیرتؔ بدایونی

اور جب علامہ حیرتؔ کلام سنانے کے لئے اسٹیج پر جلوہ افروز ہونے تو سامعین

ان کی مولویانہ وضع قطع کو دیکھ کر "مسجد و مے خانہ" کے التزامی کی معنی خیزی سے لُطف اٹھاتے ہوئے زیرِلب مسکرا دیتے۔

بیدی صاحب کی صحبت میں، میں سگرٹ نوشی سے احتراز کرتا ہوں مگر سگرٹ اور شراب میں چولی دامن کا ساتھ ہے اُسے کچھ وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جو اِن دونوں کا عادی ہو۔ ایک مرتبہ دورانِ مےکشی میں نے سگرٹ پینے کی اجازت طلب کی تو فرمایا "مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ سگرٹ نوشی سے صحت تمہاری خراب ہو گی نہ کہ میری" میں نے عرض کیا "اور یہ شراب کیا مضرِ صحت نہیں؟" بڑی متانت سے فرمایا "یہ تو شیرنی کا دودھ ہے اسے ہر کوئی ہضم نہیں کر سکتا اور رہا اس کے مضرِ صحت ہونے کا سوال تو کیا تم نے اپنے پردادا استاد ذوقؔ کا یہ شعر نہیں سُنا؟

پیرِ مغاں کے پاس ہے وہ دارُو جس سے ذوقؔ
نامرد، مرد، مرد، جواں مرد بن گیا

بیدی صاحب کا دائرہ احباب سمندر کی مانند وسیع و عریض ہے۔ یہاں چند ایسے افراد کا ذکر کرنا مقصود ہے کہ جو لہروں کی طرح آئے اور جب گئے تو واپس آنے کا رُخ نہ کیا۔ مگر بیدی صاحب کا اس میں قطعاً قصور نہیں۔ ایسے احباب کی تین اقسام ہیں۔ کچھ لوگ تو محض اپنے کسی خاص کام کی خاطر اُن کے نزدیک آجاتے ہیں اور جب ان کا کام نِکل گیا تو وہ نو، دو گیارہ ہو گئے۔

دُوسری قسم اُن اشخاص کی ہے جن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس سرچشمۂ فیض سے نہ صرف استحقاق سے زیادہ حاصل کرتے رہیں بلکہ خزانے کی چابی بھی اُن کے ہاتھ میں رہے اور وہ اجارہ دار بن کر کسی اور کو مستفید نہ ہونے دیں۔ یہ کج اندیشی ان کو ایک نہ ایک دن لے ڈوبتی ہے۔

تیسری صف ان حضرات کی ہے جو بیدی صاحب کی شرافت، اخلاق اور سادہ دِلی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اُن کے ادبی اور ذاتی سیکریٹری کا منصب سنبھال لیتے ہیں اور اپنی حاضر باشی کا ناجائز استعمال کر کے فریب کاری، ریشہ دوانی اور دروغ گوئی کے حربے

اپنانے لگتے ہیں اور جب پردہ فاش ہوجاتا ہے تو بیدی صاحب سے کنارہ کشی کرکے اُن کو عوام میں مطعون کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔

اُن کے حلقۂ احباب میں ایک صنف ایسی بھی ہے۔ جسے ہم "منظورِ نظر" کہہ سکتے ہیں۔ بیدی صاحب احباب کے وقار کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیتے۔ ان کی ہر جائز خواہش کا مناسب احترام بھی کرتے ہیں لیکن اپنے "منظورِ نظر" اور احباب میں حدِّ فاصل قائم کرنا بادی النظر میں دشوار معلوم ہوتا ہے تاہم یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ وہ احباب کی فرمائش کو تو کبھی کبھار ٹال بھی جاتے ہیں مگر "منظورِ نظر" کی خواہش پر احباب کو بھی زحمت دینے سے گریز نہیں کرتے۔

ایک نوجوان، نرم و نازک اور خوبصورت شاعر طارق بدایونی ان کے منظورِ نظر ہوئے تھے، اس نے بدایوں میں مشاعرہ کا اہتمام کیا تو اس کے حسبِ خواہش فلم اسٹار دلیپ کمار کو بدایوں کی گلیوں میں کھینچ لائے۔ ڈاکٹر ایچ۔ ایس گُلاٹھی نظر پر چڑھے تو محمد رفیع، اوم پرکاش اور جانی واکر کو رڑکی میں لا کھڑا کیا۔ یوپی کے گورنروں جناب گوپالا ریڈی اور جناب اکبر علی خاں سے اُن کے مشاعروں کی صدارت کرادی۔ روی بھاردواج اُن کا شاگرد بنا تو جودھ پور میں اُس کا جشن منوا دیا۔ کرن جھانسوی سے متأثر ہوئے تو اسے پورے ہندوستان کے مشاعروں میں گھما دیا۔ قیصر حیدری کو اپنا ادبی سیکریٹری بنا لیا اور ہلال سیوہاروی کو غالب صدی میں لندن تک لے گئے۔ اُن کا منظورِ نظر بننے کے لئے کسی خاص صلاحیت، امتیاز یا وصف کی چنداں ضرورت نہیں۔ بس ع

ع کیا جانئے تُو نے اسے کس آن میں دیکھا!

والا معاملہ سمجھئے۔

جہاں شکیل بدایونی ان کے منظورِ نظر تھے وہاں اختر پھپھوندوی نے بھی یہ بلند مقام حاصل کرلیا تھا حالاں کہ اختر پھپھوندوی ایک مصرع تک نہ کہہ سکتا تھا اور شکل و صورت اور حلیئے میں بھی شکیل کی ضد تھا۔ یہاں ایک ایسے منظورِ نظر کا ذکر کرنا بھی دلچسپی کا موجب ہوگا کہ جو اُن کا چہیتا ملازم تھا (اب کئی برس سے میں نے اسے نہیں دیکھا)

بیدی صاحب جب کبھی تفریح کے موڈ میں ہوتے تھے تو مخصوص اور عزیز ترین دوستوں کی موجودگی میں اسں ملازم کو آواز دیتے اور سوال و جواب کی شروعات یوں ہوتی تھی۔

"تم ہمارے پاس کب ملازمت کے لئے آئے تھے؟"

اس نے جواب دیا "حضور! غالباً پندرہ برس پہلے"

"اس وقت تمہاری عمر کیا تھی؟"

"قریب اٹھارہ برس"

"ہم نے پوچھا تھا تمہارے والد صاحب کا نام کیا ہے؟ اور تم نے والد کا نام بتایا اور یہ کہا کہ ان کو سورگ سدھارے بیس برس ہوگئے ہیں" یہ کہتے ہی بیدی صاحب اُسے حرام زادے کے لقب سے پُکارتے اور اس کے ساتھ ہی ٹھیٹ پنجابی میں بے نقط گالیوں اور صلواتوں کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ ملازم گالیاں سُنتا رہتا اور خاموش کھڑا مسکراتا رہتا غالباً بیدی صاحب کی صحبت میں رہ کر اس نے یہ مصرع سُن رکھا ہوگا۔

ع۔ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

تفریح کا یہ نادر سلسلہ دس پندرہ منٹ تک جاری رہتا اور پھر دوستوں سے مخاطب ہو کر کہتے "اب تو آپ اس شخص کی اصلیت سے واقف ہوگئے ہیں۔ بدقسمتی سے کبھی سامنا ہو جائے تو پہچاننے میں غلطی ہرگز نہ کرنا" یہ تفریحی ڈرامہ مہینے میں دو، تین بار ضرور کھیلا جاتا تھا۔ بیدی صاحب آخر انسان ہیں۔ کسی کو آج تک انھوں نے گالی نہیں دی البتہ اس انسانی کمزوری کی تکمیل کے لئے شاید یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ گھر کی بات گھر میں رہے تو بہتر ہے۔

ان کے چند دوستوں کی یہ بھی رائے ہے کہ بیدی صاحب دو قسم کی زندگی بسر کر رہے ہیں ایک خارجی زندگی جس میں وہ وفود کے سربراہ، مشاعروں کے روح رواں، مختلف انجمنوں اور اداروں کے صدر، اور سرپرست کی حیثیت سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور ایک داخلی زندگی جس میں، وہ بطور شاعر، وفاکیش عاشق، محبوب کی اداؤں، غمزوں اور عشوؤں کے رمز شناس اور دلبری و دلداری کے مزاج داں کی شکل میں ابھرتے

ہیں۔ میں اپنے تجزیے اور تجربے کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے کبھی دوہری زندگی بسر ہی نہیں کی۔ جب وہ سرکاری ملازم تھے اور پھر ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کے معمولات میں داخلیت کا عنصر دور دور تک نظر نہیں آیا۔ وہ کبھی تنہا ہوتے ہی نہیں۔ دن میں ہر وقت حلقۂ احباب کی زینت ہوتے ہیں اور ملاقاتوں اور نشستوں میں مصروف رہتے ہیں۔ گھر پہنچ کر کھانا کھایا اور ٹیلی فون کا چونگا نیچے رکھ کر سو رہے۔ سہ پہر کو بیدار ہوئے، ہاتھ مُنھ دھویا اور کلب چلے گئے وہاں "بلیرڈ" کھیلتے ہیں "رمی" اور "برج" سے دل بہلاتے ہیں۔ کبھی کبھار تفریحاً شغلِ جام بھی کر لیتے ہیں۔ وہیں سے مشاعروں اور ادبی و ثقافتی تقاریب میں شرکت کرنے چلے گئے یا محفلِ موسیقی سے حظ اٹھا کر رات ڈھلے گھر پہنچے اور سو گئے۔ صبح اُٹھے تو سیر کو روانہ ہو گئے۔ ایسی نپی تلی اور ڈھلی ڈھلائی زندگی بسر کرنے والا انسان داخلی زندگی کی طرف رجوع ہو ہی نہیں سکتا۔

اب رہی شاعری کی بات تو وہ شعر اس لیے کہتے ہیں کہ یہ فطرت کی ودیعت ہے۔ بیدی صاحب ایک موضوع طبع، خوش فکر اور زود گو سخنور ہیں۔ موٹر کار ڈرائیو کر رہے ہیں، ساتھیوں سے محوِ گفتگو بھی ہیں اور شعر بھی کہے جا رہے ہیں منزلِ مقصود تک پہنچتے پہنچتے غزل مکمل ہو جاتی ہے۔

اب رہا یہ خیال کہ محبوب کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے بغیر اور ہجر و وصال کی لذت سے ناآشنا رہ کر وارداتِ حسن و عشق کا مؤثر بیان اشعار میں نہیں کیا جا سکتا تو اس کے جواز میں مولانا حسرت موہانی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ مولانا کے ایک مدّاح نے اُن سے سوال کیا کہ حضرت آپ کی زندگی تو ایک مجاہدِ جنگ آزادی اور سیاسی رہنما کے طور پر گزری ہے اور قید و بند کی صعوبتیں بھی آپ نے برداشت کی ہے اس کے برعکس آپ کی غزلوں کے یہ اشعار: ؎

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بُلانے کے لئے وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

یا

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ سر بسر　　رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

یا پھر

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا　　کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ آپ کسی کافرادا محبوبہ کے عشق میں بھی مبتلا رہے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی یہ سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہے پھر رازدارانہ لہجے میں فرمایا کہ میاں ہم نے بھی عشق کیا ہے لیکن شادی سے قبل اور جس نازنین کو دل دیا اسی کو شریک حیات بنا لیا۔" مزید برآں اردو زبان و ادب کی تاریخ میں چند ایسے شہرۂ آفاق اہلِ قلم کے نام لئے جا سکتے ہیں جن کے کلام میں حُسن و عشق، جام و مینا اور فراق و وصال کا ذکر اثر انگیز انداز میں جا بجا ملتا ہے لیکن اُن کی ذاتی زندگی پاکیزگیٔ نفس، شرافت اور اعلیٰ قدروں کی آئینہ دار رہی ہے۔ اس ضمن میں نوح ناروی، جعفر علی خاں اثر لکھنوی، شاد عظیم آبادی، جگر بریلوی، سائل دہلوی، جوش ملسیانی، امیلا رام وفا، تلوک چند محروم، تاجور نجیب آبادی، منور لکھنوی، ہری چند اختر، امن لکھنوی اور عرش ملسیانی سرِ فہرست ہیں۔ میری رائے ہے بیدی صاحب نے اگر کبھی وادیٔ حسن و عشق میں قدم رکھا بھی ہے تو اپنے دامن کو آلودۂ ہوس نہیں ہونے دیا۔ ان کا یہ قطعہ میرے نظریے کی تصدیق کرتا ہے ؎

؎ فطرت میں ذوقِ حسن پرستی تو ہے مگر
آگے حدودِ عشق سے جاتے نہیں ہیں ہم
عاشق ہیں ہم، ہوس کے پجاری نہیں حضور
ہم سونگھتے ہیں پھول کو، کھاتے نہیں ہیں ہم

بیدی صاحب کی عملی زندگی میں سنجیدگی ہے اور ان کے اندازِ گفتگو میں شوخی کے ساتھ ساتھ خرد مندی اور استدلال کی بالادستی بھی ہے۔ چوں کہ وہ باعتبارِ مزاج سیماب صفت ہیں اس لئے کسی خیال کے ذہن میں آتے ہی، ان کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ یہ خیال جلد سے جلد ایک واضح پیکر کی صورت اختیار کرلے اور پھر اس منصوبے کی تکمیل کے لئے ایسی لگن اور انہماک کو بروئے کار لاتے ہیں کہ جنون و شیفتگی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بلند حوصلگی اور رجائیت پسندی اُن کا مطمحِ نظر ہے۔ "ناممکن" کا لفظ اُن کی لغت میں شامل نہیں۔

بیدی صاحب حق پرستی اور انصاف پروری کے موید ہیں اور ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہیں۔ ان کی شخصیت آئینہ کی طرح صاف شفاف ہے جس کے جملہ اوصاف کو محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن بیان نہیں کیا جاسکتا۔ دوست نوازی اُن کی زندگی کا ایک زرّیں اصول ہے۔ اس "اصول پرستی" کے باعث اکثر اوقات "دوست نما" دشمن بھی اُن سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور پھر اُن کی کشادہ دلی اور عالی ظرفی سے متاثر ہوکر اُن کے حلقہ بگوش ہوجاتے ہیں۔

بیدی صاحب کے اِس غیر جانبدارانہ طرزِ عمل ہی نے ان کو ہر حلقہ میں مقبول و ممدوح بنادیا ہے۔ انسان دوستی اُن کے مزاج کا خاصہ ہے۔ انھوں نے بلاامتیاز نہایت فراخ دلی سے اپنی محبّت اور شفقت کے پھول ہر کسی پر نچھاور کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جاننے، پہچاننے اور چاہنے والوں نے بھی ہمیشہ ان کو دلی خلوص اور جذباتِ احترام و عقیدت کا خراج پیش کیا ہے جس کا اعتراف سحر صاحب کے اپنے ایک شعر سے مترشح ہے ؎

؎ ہم نے وہ وقت بھی دیکھا ہے محبت میں کہ جب
کوئی شکوہ نہ رہا تنگئ داماں کے سوا

میرے اس تاثراتی مضمون میں جن حقائق اور واقعات کو احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے ان کی روشنی میں سنتیم، شوم، سندرم کا عنوان "عالی جاہ" کی خدمت میں میرے احساسات کا ایک ادنیٰ سا نذرانہ ہے۔ ان کی کا زندگی کا صرف ایک ہی نصب العین رہا ہے اور وہ ہے 'خدمت' ـــــــ جسے خدمتِ اُردو اور خدمتِ خلق کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اللہ کرے وہ اپنے مشن میں ہمیشہ کامیاب و کامران رہیں۔
آمین ثم آمین!

جوگندر پال

کنور مہندر سنگھ بیدی سحؔر ایک انجمن

جس شخص پر خدا اتنا مہربان ہو کہ وہ اپنی تمام عمر زندگی کو جشن کے مانند مناتے
ہوئے گزار دے، دن بیت جانے پر اُس کی مُندی مُندی آنکھوں میں شفق کے رنگوں کی
دھوم سی مچی ہوتی ہے۔کنور مہندر سنگھ بیدی سحؔر اپنی کتاب "یادوں کا جشن" کے راستے
قاری کو بڑی پُروقار انکساری سے رنگوں کی اس دھوم دھام میں لا اتارتے ہیں اور کسی
نہایت مشفق میزبان کی طرح اُس کی آسائش اور شادکامی کے لئے کوئی دقیقہ فرو
نہیں کرتے۔

کوئی آپ بیتی پڑھتے ہوئے اگر ہمیں محسوس ہو کہ لکھنے والے کو اپنی خوش بختی
کے ذکر کی آڑ میں نام و نمود درکار نہیں، بلکہ وہ اپنی تمامتر خوشیاں ہمیں بے تحفظ سونپ
رہا ہے تو ہم اپنے ذہنی تحفظات کو ایک کونے میں ڈال کر اس سے جذباتی ہم آہنگی
کے احساس سے سرشار ہونے لگتے ہیں۔جداگانہ فکری حوالہ اپنی جگہ، محبتوں کے عرفان
کے حصول کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ آدمی اپنی غلط یا صحیح سوچ کے تحت اپنے
آپ پر آدمیت کے دروازے بند نہ کرے۔ اس اعتبار سے "یادوں کا جشن" کے
مطالعۂ سے دو باتیں بڑے واضح طور پر بار بار ابھر کر آتی ہیں: ایک، کنور صاحب کا

راست بیان، اور دو، اُن کے یکپشن اور نیک نیتی کا یہ عالم، کہ بدخواہ پر بھی بُرا وقت آن پڑے تو اپنے کسی نام نہاد دوست کا دروازہ کھٹکھٹانے کی بجائے اُنہی سے اپنی مشکل کشائی کی امید باندھے۔ ان کی شخصیت کے ان محبوب اوصاف میں اُس صاف ستھری تربیت کا بڑا ہاتھ ہے جو اُنہیں اپنے نہایت آسودہ حال خاندان کے بے حساب وسائل کی بدولت میسر آئی۔ اِسے آپ کنور صاحب کی خوش قسمتی پر بھی محمول کر سکتے ہیں لیکن انسانی نیکیوں کا مدار اگر صرف قسمت پر ہوتا تو انگریزی راج کے دوران رئیس زادے عام طور پر اتنے بگڑے ہوئے کیوں ہوتے؟ اچھی قسمت کے علاوہ کنور صاحب کی شخصیت میں یقیناً اُن کی نیت اور ریاض کو بھی دخل ہو گا۔

جاگیردارانہ ربط وضبط کے زیرِ اثر کنور صاحب کی ذہنی ترجیحات نے اُن کی ایک خوب صورت سی حاشیہ بندی کر دی تھی۔ عمر بھر اپنی خیر سگالی کو اِسی ترجیحی تربیت کا پابند کر کے وہ زندگی کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی میں اپنے دور کے بعض ایسے اکابر کا ذکر کیا ہے جنہیں اُنہی کے مانند اپنے مخصوص تہذیبی رکھ رکھاؤ کا پورا پاس تھا، مثلاً سر عمر حیات خاں ٹوانہ، سر سکندر حیات خاں، ملک سر فیروز خاں نون، نواب سعید احمد خاں چھتاری، مہاراجہ بھوپندر سنگھ، چودھری سر چھوٹو رام اور بہت سے دوسرے ۔۔۔ ان سبھوں سے کنور صاحب کے خاص روابط تھے۔ یہ ہستیاں اپنے مخصوص ماحول میں بڑی اہمیت کی حامل تھیں اور اسی ماحول میں حاشیہ آرا۔ اِن بھلے بھلے بڑے لوگوں کے تعلق سے کنور صاحب کا گرم جوش تاثر نہ صرف اِن کے شخصی کردار وعمل پر بڑی ہمدردانہ فہم سے روشنی ڈالتا ہے بلکہ اس سے ہمیں اپنے ملک کی ـــــــ خاص طور پر پنجاب کی حالیہ تاریخ کے بعض اہم پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

کنور صاحب طبعاً بہت مجلسی، ملنسار اور خوش باش ہیں اور اپنی فطرت کے عین مطابق "یادوں کا جشن" میں انھوں نے اپنے بیتے ہوئے دنوں کو ایک جشن کے مانند منا یا عمر رفتہ ان کے مانوس قہقہے سن کر دوڑی چلی آئی ہے، پرانے درو دیوار میں ویسا ہی رنگ بھر آیا ہے، مرے ہوئے لوگ جوں کے توں جی پڑے ہیں،

بوڑھے ساتھی اپنے تنہائی کے گوشوں سے اُسی توانائی سے اچھل آئے ہیں اور اس نو آباد کار منظر میں پل پل میں بکھری ہوئی ناپائیدار زندگی از سرِ نو اپنے طبع زاد نقوش میں منتقل ہو کر قیام پذیر ہو گئی ہے۔ "یادوں کا جشن" پڑھ کر قاری بھی کنور صاحب کی پوری زندگی جی لیتا ہے اور یوں تاریخ کے صحرا میں ہڈیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر الٹے سیدھے نتائج پر پہنچنے کی بجائے واردانی وثوق سے اُس دور کی روح تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ کنور صاحب کی آپ بیتی اُن کی پرسنل لائف کی عکاسی تو ہے ہی، یہ کتاب ہماری حالیہ سماجیاتی تاریخ کی ایک راست دستاویز بھی ہے۔ اسے پڑھ کر آزادی سے پہلے اور اس کے فوراً بعد کے لوگوں کے رویّوں کے تناظر میں اُس زمانے کے سماجی تناؤ کے اسباب روشن ہونے لگتے ہیں۔ عالمانہ تحقیق و تنقید کی چھان پھٹک پر اکثر اوقات بعض سامنے کے امور دکھائی نہیں دیتے، لیکن ایمانداری سے لکھی ہوئی موٹی تحریروں میں انہی امور کے تذکروں کی بدولت کئی باریکیاں بے ساختہ سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔ کنور صاحب کی سادہ بیانی کا اعجاز ہے کہ عام فہم باتیں چھوٹے چھوٹے واقعات میں جُڑتی چلی جاتی ہیں اور اس طرح بیان میں ایک ایسا دم بھر آتا ہے کہ وہ قاری کو کوئی اکادمی مفروضہ معلوم نہیں ہوتا، بلکہ اُسے واقعتاً پیش آ رہا ہوتا ہے۔

"یادوں کا جشن" کی گیلری بے شمار چھوٹے بڑے لوگوں کی بھیڑ سے لدی پڑی ہے۔ چھوٹے لوگوں سے ملنے کے لئے کنور صاحب اپنی مسند سے نیچے اتر کر اُن سے خدا ترسی کے جذبے کے تحت ملتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور بڑوں کو حفظِ مراتب کا پاس رکھتے ہوئے اپنی مسند سے اوپر لا بٹھاتے ہیں۔ کسی کا کام ــــ بعض اوقات غلط کام بھی نکلوانے کے لئے اپنے اختیارات کو پوری طرح استعمال میں لے آتے ہیں اور اگر اُس کام کو خود آپ نہ کر سکیں تو پھر پرتاپ سنگھ کیروں، یا کسی بھی اور بڑی اتھارٹی کے پاس جا پہنچتے ہیں۔ اُن کی کوششیں لوگوں کے نجی کاموں تک ہی محدود نہیں۔ ایک بار پنجاب میں بجلی کی کمی پوری کرنے کے سلسلے میں پنجاب اور کشمیر کی حکومتوں میں اختلاف کی بنا پر دریائے جناب پر ڈیم بنانے کی اسکیم کھٹائی میں پڑنے لگی تو کیروں صاحب نے یہ معاملہ کنور صاحب

کو سونپ دیا تاکہ وہ بخشی غلام محمد سے اپنے خصوصی تعلقات کام میں لاکے یہ الجھن سلجھائیں۔
اور تو اور، "جب وہ (ڈاکٹر ذاکر حسین) صدر جمہوریہ ہند کے عہدہ جلیلہ کے لئے منتخب
ہوئے تو میں مبارک باد پیش کرنے گیا۔ اس سلسلہ میں کچھ ادنیٰ سی خدمت میں بھی کر چکا تھا"
یہ معاملات تو پاور کے کاریڈارز سے متعلق ہیں، کنور صاحب نے اپنے دوستوں کی شادمانی
کی خاطر اُن کی بیمار گھریلو زندگی میں بھی مسیحائی کے کرشمے دکھائے ہیں۔ جب ساحر
ہوشیار پوری کی بیوی نے اپنے شوہر کے پتلے دنوں میں پاکستان میں اپنے میکے جاکر بچہ
جننے پر اصرار کیا تو ساحر صاحب گھبرا کر ان کے پاس تشریف لائے۔ اپنے اس دوست
کی مدد کے لئے کنور صاحب نے بہ کمال دانش مندی (ناصح مشفق) کا رول ادا کیا۔ ان کی
دردمندی کا یہ نظارہ دیکھئے: "چنانچہ شام کو میں اُن (ساحر) کے ہاں پہنچا۔ بیگم ساحر
کہنے لگیں ـــــ میں میکے نہیں جاتی، مگر اتنا ضرور کہنا چاہتی ہوں کہ جس کے لئے میں
نے اپنے ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں کو خیر باد کہہ دیا اب اگر اسے بھی چھوڑ دوں گی
تو میرا اور کونسا ٹھکانہ ہو سکتا ہے؟ ـــــ یہ کہہ کر وہ رونے لگ پڑیں۔ ساحر صاحب
تو پہلے ہی بہت اداس تھے وہ بھی رونے لگے اور میں جو ناصح مشفق بن کر گیا تھا، میری
آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔"

ایسے موقعوں پر اندیشہ رہتا ہے کہ مصنف کہیں خود پارسائی کا شکار ہو کر نہ
رہ جائے، مگر کنور صاحب نے نہایت سادگی سے ـــــ بلکہ اکثر بڑی معصومیت سے
سارے واقعات دہرائے ہیں۔ اپنی سادہ لوحی کے باب میں وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں "
مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں قطعاً تامل نہیں کہ میں پڑھا لکھا ہونے کے باوجود
سادہ لوح ہوں اور مجھے بڑی آسانی سے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔" اس ضمن میں وہ چند
ایسے قصے بھی سُنا کر ہنس دئے ہیں جن میں بعض لوگ انہیں واقعی بہ آسانی جُل دے گئے۔
اپنی سوانح حیات سُنا کر کنور صاحب کو دراصل اپنی دانشوری کا لوہا منوانا مقصود نہیں،
انہیں تو اپنی یادوں کا جشن مناتے ہوئے قارئین کو اپنے بھنگڑے، (پنجابی رقص) میں
شریک کرنا ہے۔

کنور صاحب نے دلچسپ واقعات، کے عنوان کے تحت بعض ایسے واقعات بیان کئے ہیں جو ہمیں ان دنوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں، مثلاً "گوشۂ تنہائی" میں اپنے علاقے کے ایک سرکردہ زمیندار کی کہانی اس طرح سناتے ہیں کہ دنیا سے جی بھر جانے اور پرماتما سے لو لگانے کا اعلان کرنے کے بعد وہ چپکے سے اپنے گاؤں کی ایک لڑکی کو اغوا کر کے لے گئے۔ ایک اور واقعہ "آلۂ واردات" کے بیان میں لکھتے ہیں کہ تقسیم وطن سے پہلے ایک انگریز اسسٹنٹ کمشنر کو اس کے دوستوں نے مشورہ دے رکھا تھا کہ وہ پولیس کے ہتھکنڈوں سے ہمیشہ چوکس رہیں اور اُن پر ہمیشہ زور ڈالیں کہ ہر کیس میں آلۂ واردات پیش کیا جائے۔ چنانچہ زنا بالجبر کے ایک مقدمے میں انھوں نے حسبِ عادت بڑے بھولپن سے اصرار کیا کہ آلہ واردات پیش کیا جائے۔ تھانیدار بے چارے کے لئے اب اس کے سوا چارہ ہی کیا رہ گیا تھا کہ صاحب بہادر کے حضور میں ملزم کو برہنہ کر دیا جائے ـــ لیجئے صاحب، اب جی بھر کے آلۂ واردات ملاحظہ فرما لیجئے ــــ ایک اور واقعہ یوں ہے کہ اُن دنوں کنور صاحب کے ضلع کے ایک آنریری مجسٹریٹ کرتار سنگھ کی سردارنی کو ایک وکیل نے بھڑکایا کہ سردار صاحب کا کچہری کار یڈر اُن کا نام کتے والے کاف سے لکھتا ہے۔ وہ غیور خاتون یہ اطلاع پاکر بہت برافروختہ ہوئیں اور اڑ گئیں کہ اُن کے میاں اسے اپنی کچہری سے ہٹوا دیں۔ انہی واقعات کے ذیل میں جوش ملیح آبادی کی مضحکہ خیز سفارش کا ایک قصہ بھی شامل ہے جس میں کمشنر شنکر پرشاد صاحب نے دلیل کی بے سر و پائی کے باوجود محض جوش صاحب کی خوشنودی کے لئے بلونت سنگھ کی پستول کے لائسنس کی درخواست منظور کر دی۔ کنور صاحب کا اپنا مزاج بھی ایسا ہی ہے۔ کیا یہی دلیل کافی نہیں کہ یاروں کا کام نکل جائے؟

کنور صاحب کا یہ دعویٰ بے جا نہیں کہ وہ بادہ پرست ہیں، شراب خور نہیں، اُن کا کہنا ہے کہ شراب خوری رسوائی حاصل کرنے کا نام ہے اور بادہ پرستی مے سے لطف اندوز ہونے کو کہتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں: "میں شراب کا عادی نہیں ہوں ـــ بعض اوقات ہفتوں نہیں پیتا۔ بعض اوقات مہینوں ہر شام پیتا ہوں لیکن احباب کے

ساتھ۔ تنہائی میں کبھی شراب کی طرف مائل نہیں ہوا البتہ اگر کہیں مشاعرہ میں جانا ہو، کہیں کوئی تقریر کرنا ہو تو اپنے ساتھ کچھ رکھ لیتا ہوں تاکہ مشاعرہ یا تقریر سے پہلے ایک دو پیگ لے لوں۔ اگر دو گھونٹ پی لو تو تقریر بھی اچھی کر لیتا ہوں اور مشاعرے کی نظامت یا صدارت یا محض شمولیت میں بھی جان سی پڑ جاتی ہے ۔" اور اس کے فوراً بعد ۔ "آج تک میرا کوئی دوست یا دشمن یہ نہیں کہہ سکتا کہ کبھی میرا قدم لڑکھڑایا ہو ۔" اور پھر یہ بھی ۔ "مجھے اُن لوگوں سے بے حد نفرت ہے جو شراب کو بُرا سمجھتے ہیں ۔۔"

یہ واقعہ ہے کہ ہمہ وقت غرق مے رہنے کی لت بھی اُن کے یہاں ناپسندیدہ ہے۔ شہیدانِ مے کے عنوان سے انھوں نے دکھایا ہے کہ نریش کمار شاد، شو کمار بٹالوی مجاز لکھنوی، اختر شیرانی اور ناظر خیامی کیونکر اِس لت سے ضائع ہو گئے اور کہا ہے: "یہ تو میں مانتا ہوں اور جانتا ہوں کہ شراب اور شعر کا گہرا تعلق ہے مگر یہ تعلق جائز ہونا چاہیئے، یعنی مے کے ساتھ اپنی منکوحہ بیوی سا سلوک ہونا چاہیئے، نہ کہ معشوقہ کا سا، کہ ہر وقت اسے لپٹائے رکھیں ۔"

مگر یہ بیان بہرحال ایک ایگزیکیٹو دانشور کا ہے جس کی تربیتوں کا خاصہ انتہاؤں سے تامل برتنا ہے۔ کنور صاحب کا شنگاری لا اسی لئے بنا رہا کہ انھوں نے ساری عمر ہر بات میں اعتدال سے کام لیا۔ اس میں شک نہیں کہ اعتدال آدمی کی صحت اور خوش حالی کا ضامن ہوتا ہے، تاہم برائیوں کے مانند اچھائیوں کے پجاری بھی جب تک اپنے گاڑھے نشے میں انتہاؤں کو پار نہ کر جائیں اس وقت تک بوڑھی زندگی پر نئی پتیاں آنا شروع نہیں ہوتیں۔ اسی اعتبار سے عیسیٰ اور گاندھی کا لڑکھڑاتا ہوا تو دنیا سبنھلنے میں آئی۔ میرا اندازہ ہے کہ جی ہی جی میں سہی، کنور صاحب بھی کبھی نہ کبھی ایسی ہی لڑکھڑاہٹ کی تمنا سے بے قرار ہوئے ہوں گے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ خوش گو شاعر ہیں مگر جس انداز سے وہ مشاعروں کی نظامت سنبھالتے ہیں اس کا جواب نہیں۔ میں کئیوں کو جانتا ہوں جو شعراء

قطع نظر صرف اس لئے کسی مشاعرے میں کشاں کشاں جا پہنچتے ہیں کہ انھیں کنور صاحب کو نظامت کرتے ہوئے سُننا ہوتا ہے۔ میر مشاعرہ اگر حاضر جواب اور چست کلام اور زبان کے کلچر پر پوری طرح حاوی ہو تو مشاعرے پر بہار چھا جاتی ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی مرحوم اور کنور صاحب میں بہت بے تکلفی تھی۔ ایک بار کسی مشاعرے میں کنور صاحب کو اپنے کلام پر داد دیتے ہوئے پاکر جوشؔ نے کہا، 'دیکھئے، کم بخت سکھ ہونے کے باوجود کتنی اچھی داد دے رہا ہے۔ کنور صاحب برجستہ بول اٹھے، 'دیکھئے کم بخت پٹھان ہونے کے باوجود کتنا اچھا کلام سُنا رہا ہے ـــــــ سوچا جائے تو شعر کہنے سے شعر سننے میں یکساں واردات کارفرما ہوتی ہے۔ جس طرح ہمارے قومی مشاعرے میں کنور صاحب بڑے بڑے شاعروں کو سنبھال لیتے ہیں، اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان پر بھی عین وہی شعری وارداتیں بیت رہی ہیں اور جو کچھ پڑھا جا رہا ہے وہ اِسے اپنے جذب سے نبھا رہے ہیں۔ اسی لئے شعر و موسیقی کے ضمن میں کہا جاتا رہا ہے کہ شیو جی نے گایا اور وِشنو نے سُنا۔ سنانے اور سننے کے دونوں جوہر فنونِ لطیفہ سے وابستہ ہے۔ کنور صاحب مشاعرے کی نظامت کو اسی طرح برتتے ہیں، اور اس رائے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ دورِ حاضر میں مشاعرے کی انسٹی ٹیوشن کی آبرو رکھنے والوں میں اوّلین نام کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کا ہے۔ بڑا لمبا نام ہے، مانو اس انسٹی ٹیوشن کے سارے نام اسی ایک میں سمٹ آئے ہوں۔

کنور صاحب کی خوش گوئی، خوشحالی اور خوش قسمتی دیکھتے ہوئے بعض اوقات تجسس ہونے لگتا ہے کہ وہ کیا شئے ہے جسے انھوں نے دیوانہ وار چاہا ہوگا اور جو انہیں نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ اپنی تمام تر کامرانیوں کے باوصف وہ کبھی نہ کبھی تو اندر ہی اندر کہیں ضرور ٹوٹے ہوں گے۔ اس قدر کامیاب لوگوں کے تعلق سے میری یہ کرید اس لئے غیر فطری نہیں کہ اس نہج کی دریافتوں

سے بھی انسانی فکر و احساس کے برتر پہلو وا ہو جاتے ہیں۔ ہماری کامیابیوں میں کبھی ہوئی کسی نہ کسی ناکامی کی ٹوہ سے ہماری نجات کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ کنور صاحب بھی اپنے دل میں کسی ناکامی کو بلا ناغہ سیراب کرتے ہوں گے۔ شاید کبھی کوئی اس مثالی ادارے کی، جو کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کے نام سے عبارت ہے، بھرپور کھوج کی تدبیر کرے۔

مگر آئیے، اس وقت توجہ بھر کے اُن کی یادوں کا جشن منالیں۔

گوپی ناتھ امن (مرحوم)
(غیر مطبوعہ)

طلوع سحر ہیں سحر

کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب سحر کا نام آتے ہی ایک دلکش تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ وہ حسین چہرہ جس پر گذرتے ہوئے برسوں نے اپنے نقوش نہیں چھوڑے وہ روشن آنکھیں جو اس دورِ قحط الرجال میں مروت کی پناہ گاہ ہیں۔ وہ کشادہ پیشانی اور لمبی ناک جو ان کی خاندانی عظمت کا پتہ دیتی ہے اور وہ تبسم جس کی دلاویزی داڑھی مونچھ کے باوجود کم نہیں ہوتی۔ گورو نانک صاحب کے دو صاحب زادے تھے۔ ایک سری چندجی مہاراج جنہوں نے اپنی طویل عمر گورو صاحب کا مشن مختلف صوبوں میں عوام تک پہنچانے میں صرف کی۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ دوسرے باوا لکھمی چند گرہستی تھے، انہیں کی پندرھویں پشت میں کنور مہندر سنگھ بیدی ہیں۔ وہ کوئی صاحب کمال درویش تو نہیں۔ ایک ریٹائر شدہ افسر ہیں۔ لیکن خاندانی شرافت کے تمام آثار ان میں پائے جاتے ہیں۔ مروت و رواداری وسعت قلب اور بلندی نظریہ سب ان کی ذات میں نظر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں 'رند پاکباز' کہنا مناسب ہوگا۔ وہ ۱۹۴۲ء میں دلی میں سٹی مجسٹریٹ ہو کر آئے اور میں نے پہلے پہل انہیں پنڈت امرناتھ ساحر کے ماتمی جلسہ میں دیکھا۔ جہاں وہ تقریر فرما رہے تھے۔ آزادی کی آخری لڑائی لڑی جارہی تھی۔ میں تھوڑے

دنوں بعد گرفتار ہوگیا۔ لیکن گرفتاری سے قبل ایک مشاعرہ ان کی صدارت میں پڑھ چکا تھا۔ ان سے بے تکلفی ۱۹۴۴ء سے بڑھی۔ جب میں فیروز پور جیل سے رہا ہوکر دلی آیا۔ یہ ارتباط بڑھتا ہی گیا۔ وہ برطانوی حکومت کے ایک افسر تھے۔ میں اس حکومت کا مخالف تھا۔ گویا ہم دونوں دو مختلف صفوں میں تھے۔ لیکن اس سے ہمارے ربط ضبط میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ میں نے انہیں غیر سمجھا نہ انہوں نے مجھے۔ میں عمر میں بڑا تھا۔ اس لئے وہ میرا لحاظ کرتے رہے۔ اور وہ اس گرو کی نسل سے ہیں۔ جو میرا مرکز عقیدت ہے۔ اس لئے میں ان کا احترام کرتا رہا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہم دونوں ایک ہی صف میں آگئے۔ کیونکہ اب قومی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ وہ تو سرکاری افسر تھے ہی مجھے بھی صاحب زادہ آفتاب احمد خاں چیف کمشنر دہلی نے اخبارات کی دیکھ بھال کے لئے سرکاری افسر کی حیثیت سے رکھ لیا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے۔ کہ ہندوستان کی آزادی سے پہلے ۴۵ء سے ۴۷ء تک جو مشاعرے میں کانگرس کے زیر اہتمام کراتا رہا۔ کنور صاحب ان میں شریک ہوتے رہے۔ یہ معمولی ہمت کی بات نہ تھی۔ دور آزادی کے بعد میری حیثیتیں بدلتی رہیں۔ لیکن ہمارے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کنور صاحب چاہے دلّی میں رہے یا سونی پت میں، گوڑگاؤں میں یا چنڈی گڑھ میں، میرا ان کا رابطہ بدستور رہا۔ وہ مجھے برابر مشاعروں میں بلاتے رہے اور میں انہیں۔ جب میں دہلی آیا تھا۔ تو عام طور پر سر رضا علی ادبی جلسوں کی اور مشاعروں کی صدارت کیا کرتے تھے۔ اور خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ پیشہ صدارت، ان کے بعد خواجہ محمد شفیع کا دورِ صدارت آیا اور ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد کنور صاحب جب تک دلی میں رہے بیشتر ادبی محفلوں اور مشاعروں کی صدارت کرتے رہے۔ ایک اردو سبھا بھی قائم ہوئی تھی۔ جس کے صدر کنور صاحب تھے۔ نائب صدر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور سیکریٹری میں، کنور صاحب دلی سے چلے گئے تو میں اس کا صدر ہوگیا تھا۔ کنور صاحب میں صدارت کا سلیقہ بھی بہت ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے فقروں سے بزمِ ادب کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ بلکہ بگڑی ہوئی محفلوں کو سدھارنے میں یدِطولےٰ رکھتے ہیں۔ شاعر ہونے کے علاوہ کنور صاحب ادب نواز بھی ہیں اور ادیب نواز بھی۔ ادیبوں

اور شاعروں میں ہر قسم کے لوگ ہیں کچھ نے انہیں فریب بھی دیئے لیکن بیشتر بڑے آدمیوں میں یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ فریب دے تو نہیں سکتے۔ مگر فریب کھا جاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کنور صاحب کی ذات میں قدیم قدروں اور نئے تقاضوں کا ایک سنگم نظر آتا ہے۔ جسے طرۂ امتیاز کہنا چاہیئے۔ انھوں نے ادب کی جتنی خدمت کی ہے بے لوث کی ہے۔

کنور صاحب نظمیں بھی کہتے ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کی حیثیت غزل گو کی ہے ــــ مشاعروں میں جتنی داد وہ پاتے ہیں۔ ہندوستان میں آدھے درجن سے زیادہ ایسے شاعر بھی نہ ہوں گے جن کے حصہ میں اس قدر داد آتی ہے ان کے آتے ہی ہی جیسے محفل میں رونق آجاتی ہے اور لوگ بیتابی سے ان کا کلام سننے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اور اکثر یہ بھی دیکھا کہ ان کی غزل یا غزلیں سننے کے بعد مجمع اکھڑ جاتا ہے اور یہ عالم ہوتا ہے کہ ؎

بس ہو چکی نماز مصلےٰ اٹھایئے

طلوعِ سحر، کنور صاحب کی منتخب غزلوں کا مجموعہ ہے جس پر حضرت جوؔش ملیح آبادی پروفیسر تلوک چند محرؔوم، جناب جگن ناتھ آزاد، جناب نریش کمار شاؔد، جناب قتیل شفائی، جناب ساحر ہوشیار پوری جناب عرش ملسیانی اور جناب گوپال متل اور ماہر القادری نے اردو میں اور جناب بسمل سعیدی نے فارسی میں کنور صاحب اور ان کے کلام کو سراہا ہے۔ یہ تھوڑی بات نہیں کہ گوپال متل جیسا نقاد جو بڑے بڑوں کو نہیں بخشتا۔ ان کے کو گنجینۂ انوار اور ان کی ایک ایک غزل کو سلسلۂ سلک لہر کہتا ہے اور جوؔش ملیح آبادی نے ان کے لیئے خیر مجسم کا لفظ استعمال کیا ہے محرؔوم صاحب نے ان کے کلام کو

باعثِ انبساط دیدہ و دل

اور جاں فزا کہا ہے۔ جگن ناتھ آزاد ان کے کلام کو صحیفہ ادب پر نقشِ دوام مانتے ہیں۔ ساحر ہوشیار پوری نے مے خمخانۂ دل سے تاریخ نکالی ہے۔ بسمل سعیدی نے انہیں مجموعۂ اوصاف کہا ہے۔ مجموعہ میں چوتھی غزل کا یہ مطلع مجھے بہت پسند آیا۔

؎ تصورات کی خلوت سجا کے دیکھ تو لوں
میں ان کو اپنی نظر سے بچا کے دیکھ تو لوں

اتنی مشکل زمین میں کتنا نازک مطلع کہا ہے۔ کہیں کہیں ان کے کلام میں ترقی پسندی بھی جھلکتی ہے مثلاً

جو اپنی ہر نظر سے اک خدا تخلیق کرتے ہیں، انہیں دیر و حرم سی چیز سے کیا کام ہے ساقی

ہر نفس آخری نفس ہے سحر — زندگی ایک مرگ پیہم ہے

اب میں چند وہ اشعار نقل کرتا ہوں۔ جنہیں سن کر ایک محاورہ کے بموجب مشاعرے میں چھتیں اڑ جاتی ہیں:۔

تصورات کی خلوت سجا کے دیکھ تو لوں — میں ان کو اپنی نظر سے بچا کے دیکھ تو لوں

شوخی شباب ناز تبسم حیا کے ساتھ — دل لے لیا ہے آپ نے کس کس ادا کے ساتھ

گھٹا ہے باغ ہے مے ہے سبو ہے جام ہے ساقی — اب اس کے بعد جو کچھ ہے وہ تیرا کام ہے ساقی

جوانی بے خطا بے عیب ہو سکتی تو ہے لیکن — یہ جینا بھی تو خود جینے پہ اک الزام ہے ساقی

نہ رہوں میں تشنۂ آرزو، نہ رہے یہ تشنہ لبی مری
تو پلائے جا مجھے ساقیا کبھی آنکھ سے کبھی جام سے

عرض مطلب پہ ہنس کے کہتے ہیں — ہم کریں تم سے پیار کیا کہنا

نو جوانی میں حضرتِ ناصح — دل پہ ہو اختیار کیا کہنا

آدمی کل خدا سے ڈرتا تھا — اب خدا آدمی سے ڈرتا ہے

ترا کرم ہے یہ ساقی کہ مے کشی کے لئے — سبو کسی کے لئے ہے نظر کسی کے لئے

چلے آرہے ہیں وہ زلفیں بکھیرے — جالے سے لپٹے ہوئے ہیں اندھیرے

محبت زہد رندی پارسائی — ہزاروں بھیس بدلے زندگی نے

دیکھ کر اس نگاہ کا عالم — لاکھ عالم نگاہ سے گذرے

نقابِ رخ اٹھا کر مسکرا کر — چلے جانا مگر بجلی گرا کر

پرانی باتوں کو بھی انہوں نے اپنے رنگ میں پیش کر کے نیا روپ دیا ہے۔ مثلاً ؎

جنھیں مغفرت کی امید پر گریز ساقی و جام سے
انہیں بخشنا کہ وہ بے خبر ہیں کمال رحمتِ عام سے

کہیں کہیں یاس کی شدت ان کے کلام میں اس صورت میں نظر آتی ہے ؎

اے اہل چمن ہم کو نہیں خوف خزاں کا
یہ صحن بیاباں ہے گلستاں تو نہیں ہے

اور اس شعر میں داغ کا رنگ ملاحظہ ہو ؎

گذر جاتے ہیں ایسے پاس سے وہ — انہیں دیکھا نہ ہو جیسے کسی نے

اپنے متعلق کنور صاحب نے یہ ٹھیک ہی کہا ہے ؎

جو قائم تھا کبھی مہر و وفا سے — وہی بھولا ہوا دستور ہیں ہم

اور غالباً ۱۹۴۷ء میں دونوں جانب جو تباہی ہوئی اس سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا ہے ؎

اپنے دامن میں جو دیتے تھے زمانے کو پناہ
آج دنیا میں کہیں اُن کا ٹھکانا نہیں

بعض اشعار میں دونوں مصرعوں کا ربط نہایت لطیف ہوتا ہے مثلاً اس شعر میں ؎

روک دے گردشیں زمانے کی — تیرے ہاتھوں میں جام ہے ساقی

عشقِ مجازی کی عکاسی ملاحظہ فرمایئے ؎

خواہانِ رنگ و بو کو چمن میں کہاں قرار — اس شاخ پر ملے کبھی اس شاخ پر ملے

سحر صاحب کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے۔ اس کے باوجود جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ؎

کریں کس پر بھروسہ اے سحر ہم — جسے دیکھو وہ مارِ آستین ہے

تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ انھوں نے جتنے فریب کھائے ہیں جان بوجھ کر کھائے ہیں۔

زبان کا لطف اس مجموعۂ کلام میں جگہ جگہ ملتا ہے مثلاً اس شعر میں

میں تو یہ نو کرتا ہوں واعظ مگر — اڈکر جو ابرِ بہار آ گیا

پہلے مصرعہ میں لفظ 'تو' نے اور دوسرے مصرعہ میں لفظ 'جو' نے بڑا لطف پیدا کر دیا ہے۔

زمین و آسمان کا فرق شاعرانہ انداز میں یوں ظاہر کیا ہے ؎

ظلم افلاک سے لی ہم نے اماں زیر زمیں — آسماں سخت مخالف تھا زمیں تھوڑی سی

اسی غزل میں زمین کا ایک اور قافیہ ہے

ایک گھر مر کے بسانا ہے ہمیں بعد فنا — تیرے کوچے میں ہے درکار زمیں تھوڑی سی

مگر پہلا شعر بہت بلند ہے۔ اور شکوہ کا یہ انداز سبحان اللہ

اک اور عمر دے کہ تجھے یاد کر سکیں — یہ زندگی تو وقفِ غمِ کائنات ہے

شعر میں الفاظ کا سلیقہ سے دہرانا مشکل کام ہوتا ہے۔ دیکھئے ایک ہی لفظ ایک شعر میں چار جگہ کس لطف سے استعمال کیا ہے۔

حُسن دھوکا ہے تو دھوکا ہی سہی — یہ حسین دھوکا ہے تو دھوکا کھائیں گے

مجھے یہ مقطع بھی بہت پسند آیا

انسان ہیں۔ اسی لئے ان کی شاعری ہر اس وصف کی حامل ہے۔ جو ایک ایسے انسان سے متوقع ہو سکتا ہے۔ میں نے انہیں اپنے خیال میں اس دور کا شیفتہ درست ہی کہا ہے ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ مجھ سے اس امر میں اختلاف رکھیں۔ انہیں اس کا اختیار ہے لیکن مجھے اپنی بات کہنے کا حق پہنچتا ہے۔ کوئی چاہے میری بات تسلیم کرے یا نہ کرے، میں نے تو جو محسوس کیا ہے۔ وہ کہہ دیا ہے۔ پھر بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ صورت نہ ہو ؎

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

خیر، جو ہو سو ہو، آخر میں سحرؔ صاحب کا ہی ایک شعر اپنی بریت کے لئے پیش کرتا ہوں ؎

بے وفا مجھ کو سوچ کر کہنا — منہ سے نکلی تو پھر پرائی ہے

(یہ مضمون گوپی ناتھ امنؔ مرحوم نے کئی سال قبل لکھا تھا۔ بعض وجوہ سے لیکن یہ پہلے شائع نہیں ہو سکا تھا۔)

ڈاکٹر خلیق انجم

کنور مہندر سنگھ بیدی۔ شیشے اور لوہے کا آدمی

جوشؔ ملیح آبادی مرحوم، کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب کے بہترین دوستوں میں تھے۔ انھوں نے خلوت اور جلوت دونوں میں کنور صاحب کو دیکھا تھا اور اتنی کثرت اور اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ کنور صاحب کی کوئی خوبی اور خرابی اُن کی نظر سے چھپ نہیں سکتی تھی۔ جوشؔ صاحب شمشیر برہنہ تھے۔ جس شخص کے بارے میں اُن کے جو تاثرات تھے، انھوں نے یادوں کی برات میں بے کم و کاست اور بے خوف و خطر بیان کر دیئے تھے۔ انھوں نے پاکستان اور پاکستانی حکام کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا اس کی سزا مرتے دم تک پائی۔ اسی مرد حق گو نے یادوں کی برات میں کنور صاحب کے بارے میں جو لکھا ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ جوشؔ صاحب لکھتے ہیں:

> "(کنور صاحب کے) جدّ اعلا تھے گرو نانک جنھوں نے سکھ مت کی اس نیت سے طرح ڈالی تھی کہ ہندو اور مُسلم کی دوئی کو مٹا کر ان میں وحدت پیدا کر دیں اور دو کو ایک بنا دیں۔ لیکن تاریخ کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ وہ دو کو ایک نہیں بنا سکے اور ان کی تمنّا کے علی الرغم سکھوں کے اضافے کے بعد، دو کے تین بن گئے ؎ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔"

لیکن ان کی تمنا، ان کے بچے کنور مہندر سنگھ نے پوری کر دی۔ جن کی ذات میں ہندو، مسلم اور سکھ، یہ تینوں گروہ مدغم ہو کر، ایک اکائی کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔"

کنور صاحب کی خود نوشت سوانح عمری "یادوں کا جشن" کے لیے جوش صاحب نے اپنے تاثرات قلم بند کیے تھے۔ ان تاثرات کا ایک اقتباس ملاحظہ کر لیجئے۔

"میں بڑی دیانت داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ جب دنیا کے دو پاؤں پر چلنے والے اربوں درندوں کے درمیان، جن کو دھوکے سے آدمی سمجھا جاتا ہے، بیدی صاحب کے سے انسان کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس ہولناک ماحول میں بیدی صاحب کا سا انسان پیدا کیوں کر ہو گیا۔ ہو نہ ہو یہ روزگار کا ایک عظیم اعجاز ہے۔ ان کا کاسۂ سر اس قدر موزوں ہے کہ تاج انسانیت اس پر ٹھیک منطبق ہو جاتا ہے۔ نہ ڈھیلا ہوتا ہے نہ تنگ۔"

میرا خیال ہے کہ اگر جوش صاحب کے ان دو اقتباسات پر اپنا مضمون ختم کر دوں تو میری بات پوری ہو جائے گی۔ کیونکہ کنور صاحب کی پوری شخصیت کو بہت مختصر لیکن جامع ترین الفاظ میں جوش صاحب نے پیش کر دیا ہے۔ کچھ اور باتیں اس لیے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی تو کچھ نہ کچھ کہنا ہی ہے۔

پہلی بات تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کنور صاحب کے بارے میں یہ تاثر ان کے ہم عصروں ہی کا نہیں، اس نسل کا بھی ہے جو اُن کے بعد پیدا ہوئی ہے۔

کنور صاحب نے اپنے زمانے کے بہترین کالجوں چیفس کالج لاہور، اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ چیفس کالج بقول کنور صاحب اپنی قسم کا ایک عظیم الشان ادارہ تھا۔ اس میں والیانِ ریاست اور جاگیرداروں کے لڑکوں کے علاوہ صرف ایسے لڑکے داخل ہو سکتے تھے، جن کے خاندان کا ذکر ملک یا صوبے کی تاریخ میں آتا ہو۔ اس کالج میں تعلیم کے ساتھ ساتھ طالب علم کی ذہنی تربیت بھی کی جاتی تھی۔ اس لیے چیفس کالج کے طالب علم،

نیک ،شریف، ایمان دار، مخلص، ہمدرد، انسان دوست اور ہر طرح کے تعصب سے بالاتر ہوتے ہیں۔ کنور صاحب ان تمام خوبیوں کا مجسمہ ہیں۔ انسان دوستی، سیکولر روایت، اور خاکساری و انکساری کنور صاحب کو اپنی خاندانی روایت سے ملی ہیں اور ان پر جلا اردو سماج میں ہوتی ہے۔

گورنمنٹ کالج میں تعلیم سے فارغ ہو کر کنور صاحب نے اپنا خاندانی کام یعنی زمین داری کا کام سنبھال لیا۔ وہ کنور صاحب جو اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے، شہروں کی سماجی زندگی کے روح رواں اور ادبی زندگی کی آبرو بن کر رہے۔ انھوں نے زندگی کا آغاز زمین دار کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس عہد میں کنور صاحب کی جو مصروفیات تھیں، ان کا ذکر خود کنور صاحب نے "یادوں کا جشن" میں اس طرح کیا ہے:

> "زمینداری کے دوران میرا معمول یہ تھا کہ صبح ہوتے ہی سواری کے لیے کھیتوں میں نکل جاتا تھا اور دیکھتا تھا کہ کاشتکار اپنے اپنے کھیتوں میں کام پر آچکے ہیں کہ نہیں۔ دو تین گھنٹے اس کام میں صرف ہو جاتے تھے۔ ۹ نو بجے کے قریب واپس آنا اور دو گھنٹے کثرت کرتا۔ ڈنڈ بیٹھک سپاٹے لگاتا مگدر منگلیوں سے کثرت کرتا۔ اس کے بعد مالش کروا کر نہاتا۔ اور باہر مردانے میں بیٹھ کر ملنے والوں اور مربضوں سے ملاقات کرتا۔ ایک بجے کے قریب کھانا کھاتا اور ایک سے چار بجے تک سوتا یا آرام کرتا۔ اس کے بعد اکھاڑے میں کشتی لڑتا۔ غروب تک یہ شغل جاری رہتا۔ اس کے بعد نہا دھو کر کچھ وقت اپنے والدین کی خدمت میں گزارتا۔ رات کو کوئی نہ کوئی کھیل تماشا ضرور ہوتا، جو ہماری جانب سے گاؤں والوں کی تفریح کے لیے کرایا جاتا۔ کبھی بہروپیے آتے کبھی بھانڈ۔ کبھی بھاٹ، کبھی دیہاتی موسیقار کبھی کبھی پکا گانے والے بھی آجاتے۔ اس میں ہم اپنے پڑوسی زمینداروں کو بھی مدعو کرتے، ایسی صحبتیں نصف شب تک جاری رہتیں۔ اگلی صبح پھر وہی معمول ہوتا۔"

کنور صاحب ایک بہت خوش حال خاندان سے تھے۔ اللہ نے اتنا دیا تھا کہ انھیں ملازمت کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ لیکن انھیں "جولاہے کی ضد" میں ملازمت کرنی پڑی۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ کنور صاحب کے ایک چچیرے بھائی کو ان سے بہت حسد تھا۔ وہ خود ملازمت میں ناکام ہو چکے تھے۔ اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ کنور صاحب کو کوئی ملازمت ملے۔ ان کے حواریوں نے حکومت کو درخواستیں بھیجیں کہ کنور صاحب اپنے ساتھ ڈاکو اور خطرناک مجرم رکھتے ہیں۔ خاندانی وقار کی وجہ سے حکومت نے ان شکایتوں پر یقین نہیں کیا۔ چچیرے بھائی کو نیچا دکھانے کی ایک صورت یہ تھی کہ کنور صاحب ملازمت حاصل کریں۔ کنور صاحب کے والد نے ملازمت کے لیے درخواست دلوائی اور سر سکندر حیات خاں سے ملے۔ سر سکندر حیات خاں، اس خاندان سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے فوراً ملازمت دے دی اور کنور صاحب کو اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نامزد کر دیا۔

کنور صاحب کو شرافت، انسانیت، مذہبی رواداری، حق پرستی اور انصاف ورثے میں ملے تھے۔ گرو نانک جی اور راجا جوگی بابا صاحب سنگھ جی بیدی کی روایتوں کو نہ صرف اپنایا بلکہ جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ کنور صاحب نے "یادوں کا جشن" میں اس وقت کے تاثرات لکھے ہیں، جب پہلی بار عدل و انصاف کی ترازو ان کے ہاتھ میں دی گئی اور وہ عدالت کی کرسی پر بیٹھے۔ لکھتے ہیں:

> "چارج لے کر اس کمرے میں گیا، جو میری عدالت کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ وہاں میرا عملہ، یعنی ایک پیشکار، ایک اہل مد، اور ایک چپڑاسی میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور ڈائس پر چڑھا، کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میں ذرا جذباتی سا ہو گیا۔ عدالت کی کرسی ایک مقدس چیز ہوتی ہے۔ اس پر بیٹھنے کے بعد اکثر دماغ بگڑ جاتا ہے۔ انسانیت کنارا کر جاتی ہے۔ فرعونیت طاری ہو جاتی ہے اور انسان اپنے آپ کو انسان سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے۔ میرے پیشکار ایک مولوی

نما بزرگ تھے۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ آپ میرے لیۓ پہلے دعا کیجئے

کہ اس کرسی پر بیٹھ کر، حق و انصاف کا نام اونچا کروں۔ چنانچہ انھوں نے

دعا مانگی، اور اس کے بعد کرسی پر بیٹھا“

اپنی ملازمت پر تبصرہ کرتے ہوئے کنور صاحب نے لکھا ہے:

”میں نے تقریباً چونتیس برس ملازمت کی اور میں اپنے معبود کو حاضر و ناظر

جان کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی عدالتی زندگی میں جان بوجھ

کر کبھی کسی سے بے انصافی نہیں کی۔ سہواً اگر کوئی غلطی ہو گئی

ہو تو ہو گئی ہو“

۱۹۴۲ء میں دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ برطانوی حکومت کی مصلحت تھی کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اتحاد اور رواداری قائم کی جائے۔ کیونکہ اگر ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے تو جنگ پر اس کا بُرا اثر پڑے گا۔ اس مقصد کے تحت حکومت نے نیشنل فرنٹ، نام کا ایک محکمہ قائم کیا۔ اس محکمے کی دلّی شاخ کے نگران کے طور پر کنور صاحب کو مقرر کیا گیا۔ اور کنور صاحب ملازمت کے سلسلے میں پہلی بار دہلی آئے۔ دہلی پہنچ کر انھوں نے یہاں کے شاعروں، ادیبوں، دانش وروں اور اخبار نویسوں سے رابطہ قائم کیا اور ان سے قومی یکجہتی، رواداری، باہمی اتفاق و محبّت کے موضوعات پر نظم و نثر لکھوائی۔ اس زمانے میں کنور صاحب کو خواجہ حسن نظامی مرحوم، خواجہ محمد شفیع خان بہادر حاجی رشید، سردار موہن سنگھ دھوپیا، سر شنکر لال، خان بہادر شیخ محمد عبداللہ، سردار سندر سنگھ دھوپیا، اور مرلی دھر شاد جیسی ہستیوں سے قربت کا موقع ملا۔ کنور صاحب کی کوششوں سے چند ہی روز میں، دلّی میں ایک ایسا ماحول بن گیا کہ لوگ مذہبی اور سیاسی اختلافات کو فراموش کر کے شیر و شکر ہو گئے۔ کنور صاحب کی ان کوششوں کو برطانوی حکومت اور ہندوستانی دونوں سراہتے تھے۔ انھیں اپنے مقصد میں اس لیے کامیابی ہوئی تھی، کہ یہ کام صرف ان کی ملازمت کا ہی حصہ نہیں تھا، بلکہ ان کی زندگی کا مقصد تھا۔

ملک تقسیم ہو چکا تھا۔ دہلی میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ پنڈت نہرو اور ان کے ساتھی امن قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ لیکن کسی طرح کامیابی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ پنڈت نہرو کے مشورے سے دہلی کے حوض قاضی پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا۔ جس میں امن قائم کرنے کی تجویزوں پر غور کیا گیا۔ اس جلسہ میں پنڈت جی نے بڑی جذباتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ان حالات میں مسلمانوں کا دہلی سے چلا جانا، ہندوستان کی حکومت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہوگا۔ ہم دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

دو بھائیوں میں لڑائی ہوتی ہے، لیکن کیا وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے ہیں۔ پنڈت جی نے اہل جلسہ سے کہا کہ وہ تجویز پیش کریں، کہ کس طرح اس انسان دشمن بربریت کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ ایک مسلمان بزرگ مائیک پر آئے۔ اُنھوں نے کئی تجویزیں پیش کیں۔ ان کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ کنور مہندر سنگھ بیدی (جو ان دنوں دھرم شالہ میں تھے) کو فوراً اسٹی مجسٹریٹ کی حیثیت سے دہلی بلایا جائے اور شہر کا تمام انتظام اُن کے حوالے کر دیا جائے۔ پنڈت جی کو یہ تجویز پسند آئی۔ فوراً کنور صاحب کو بلا کر شہر کا نظم و نسق ان کے حوالے کر دیا گیا۔ کنور صاحب نے کس طرح حالات کو سنبھالا، اس کا تفصیلی ذکر انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح میں اس طرح کیا ہے۔

ان کی ایما پر ایک ایسی میٹنگ کا انتظام کیا گیا جس میں سردار پٹیل، مولانا آزاد، اور دہلی کے چوٹی کے پولیس افسران شامل تھے۔ دہلی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر رندھاوا اور چیف کمشنر صاحب زادہ خورشید بھی موجود تھے۔

اب یہاں سے داستان خود کنور صاحب کی زبانی سُنیے۔

"کافی دیر تک دہلی میں امن قائم رکھنے پر بات چیت ہوتی رہی۔ جب سب اپنی اپنی کہہ چکے تو میں نے سردار پٹیل سے کہا کہ اگر اجازت ہو میں بھی کچھ عرض کروں۔ انھوں نے فرمایا کہ ضرور کہیئے۔ چنانچہ میں نے گزارش کی کہ اگر دہلی شہر کا نظم و نسق صحیح معنوں میں ایک ہفتے کے لیے میرے حوالے

کر دیا جائے تو میں ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ خنجر زنی کی وارداتیں بند ہو جائیں گی۔ اس پر سردار پٹیل نے صاحبزادہ خورشید، ڈی. سی۔ رندھاوا، اور ڈی آئی، جی سے کہہ دیا کہ جس طرح سے بیدی صاحب چاہیں، اسی طرح سے تمام انتظام کیا جائے۔ میں میٹنگ کے ختم ہوتے ہی کوتوالی آگیا۔ ڈی۔ آئی۔ جی سے کہا کہ مجھے پچاس آدمی پولیس کے دیئے جائیں جو سفید کپڑوں میں ہوں لیکن جن کی جیب میں پستول ہو۔ اس کے بعد میں نے پریس کانفرنس بلائی اور اس میں بیان دیا کہ پانچسو سفید کپڑے والے پولیس کے آدمیوں کو مسلمانوں کا بھیس بدلوا کر پستولوں سے مسلح کر کے شہر کی گلیوں میں گشت کرنے پر مامور کر دیا گیا ہے اور انھیں حکم دے دیا گیا ہے کہ اگر اُنھیں کہیں یہ شک گزرے کہ کوئی ان پر حملہ کرنے کی نیت رکھتا ہے تو اس پر گولی چلا دیں۔ ان دنوں رات رات بھر نعرے لگا کرتے تھے، یہاں تک کہ لوگوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ میں نے پبلسٹی وین میں بیٹھ کر سارے شہر کا چکر لگایا اور اعلان کیا کہ اگر رات کے وقت کہیں سے کوئی نعرہ اٹھا تو میں اس مکان کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ یہ بھی اعلان کیا کہ لوگ اپنے محلوں اور گلیوں میں پہرہ دیں۔ اگر کسی جگہ خنجر زنی کی واردات ہو گئی تو میں ارد گرد کے جتنے گھر والے ہیں سب کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دوں گا۔ یہ سارا کام شام کے چھ سات بجے تک ختم ہو گیا اور میں کوتوالی لوٹ آیا۔ ابھی مجھے کوتوالی لوٹے ہوئے آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا ہو گا کہ ٹیلی فون آیا کہ گلی مرغان کے نکڑ پر ایک آدمی کو چھُرا مارا گیا ہے مگر اُسے معمولی سی خراش آئی ہے۔ میں فوراً کافی تعداد میں نفری لے کر وہاں پہنچا اور وہیں موقع پر بیٹھ کر ارد گرد کے گھروں کی فہرست بنائی اور ہر گھر میں جو کنبے کا مالک تھا اُسے گرفتار کر لیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو آدمی اس طرح گرفتار ہوئے۔ ان میں کئی تو میرے واقف کار ہی نہیں، بلکہ ملنے والوں میں سے تھے۔ ڈگمبر پرشاد گوہر کے سسرال والے بھی ان میں تھے۔

گوہر صاحب میرے پاس آئے کہ انھیں چھوڑ دیجئے۔ میں نے کہا کہ گوہر صاحب کل صبح آپ کے سسرال والوں کے ہاں حاضر ہو کر ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لونگا لیکن اس وقت شہر کے امن کا سوال ہے۔ آپ میرے ساتھ تعاون کیجئے۔ چنانچہ سب لوگ ایک رات کوتوالی کی حوالات میں رہے۔ اس شام کی یہ خنجر زنی، آخری خنجر زنی تھی۔ اس کے بعد کوئی ایسی قسم کی واردات نہیں ہوئی۔ رات کے نعرے بھی ختم ہو گئے۔ لوگوں میں خود اعتمادی لوٹ آئی۔ وہ لوگ جو ہر وقت خوف کے مارے گھروں میں گھسے رہتے تھے گلی محلوں میں نکلے، ایک دوسرے سے میل جول بڑھایا، اور فضا خدا کے فضل سے ہموار ہونا شروع ہو گئی۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر لوگوں کا دل بہلتا رہے تو تخریبی کاموں کی طرف دھیان نہیں جاتا چنانچہ اس سلسلے میں دو باتوں کا خاص طور پر اہتمام کیا، جو ہمیشہ دہلی والوں کی تفریح کا باعث ہوتی رہی ہیں۔ دہلی کی ادبی اور کلچرل تاریخ شاہد ہے کہ مغلیہ دور سے ہی یہاں مشاعروں اور ادبی محفلوں سے امرا اور عوام دل بہلایا کرتے تھے۔ مُرغ بازی، تیتر بازی، پتنگ بازی کا ذوق بھی عام تھا۔ چنانچہ میں نے مشاعروں کا، مُرغ اور تیتر لڑانے کا، خاص طور سے اہتمام کیا۔ مقصد دراصل یہ تھا، کہ ہندو مسلم، سکھ عیسائی سبھی مذہب کے لوگ پھر سے ایک جگہ تفریح کریں تاکہ فرقہ وارانہ فسادات نے جو گہرے گھاؤ لگائے تھے، مندمل ہوں۔ دقت صرف اتنی تھی، کہ ان کو کہاں اکٹھا جائے۔ میں نے سب سے پہلے اپنی جائے رہائش، واقع تیس ہزاری میں ہی یہ تیتر، بٹیر، مرغ مینڈھے لڑانے کا سلسلہ شروع کیا۔ شہر کے مختلف حصّوں میں ٹرک اور بسیں بھیج کر لوگوں کو اپنی کوٹھی پر بلواتا تھا۔ اور ان پالیوں کے بعد، وہی بسیں اور ٹرک انھیں اپنے محلوں میں پہنچا آتی تھیں۔ جن لوگوں نے پرانے قلعہ میں پناہ لی تھی، اُن کو بھی واپس اپنے

گھروں میں لانا تھا۔ ان کو یقین دلایا اور فضا قدرے ہموار ہونے سے انھیں
خود بھی احساس ہوا کہ گھر، گھر ہی ہے، چنانچہ آہستہ آہستہ ان میں سے بھی
بہت سے لوگ اپنے گھروں میں واپس آگئے۔ چند نام نہاد لیڈروں کو یہ سب
کچھ ناگوار گزرا۔ انھوں نے سردار پٹیل کے پاس یہ شکایت کی کہ آپ نے اچھّا
سٹی مجسٹریٹ بلوایا ہے جسے سوائے تیتر بٹیر لڑانے اور مشاعرے کرانے کے اور
کوئی کام نہیں۔ صاحبزادہ خورشید دہلی سے تبدیل ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ
شنکر پرشاد جی جو اجمیر کے چیف کمشنر تھے، دہلی تعینات ہو گئے۔ سردار پٹیل
نے ان سے پوچھا کہ آپ کے سٹی مجسٹریٹ کے خلاف یہ شکایت ہے کہ وہ مقدمات
کی طرف کم توجہ دیتا ہے اور زیادہ وقت مشاعروں میں اور تیتر بازی میں صرف
کر دیتا ہے۔ شنکر پرشاد جی نے مجھے طلب کیا اور دریافت کیا تو میں نے سارا
ماجرا بیان کیا، اور کہا کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے اور ابھی اس مہم
کو جاری رکھوں گا۔ انھوں نے مجھ سے نہ صرف اتفاق ہی کیا بلکہ میری پیٹھ
بھی ٹھونکی اور فرمایا کہ آپ اپنا کام جاری رکھیں۔ میں خود سردار پٹیل کو سمجھا
دوں گا، کہ سٹی مجسٹریٹ جو کچھ کر رہا ہے میرے حکم سے کر رہا ہے۔ اور ایسے
حالات میں ایسا ہونا شہر کے امن کے لیے مفید ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے۔"

کنور صاحب پر دتی کے مسلمانوں کو اتنا بھروسہ تھا کہ پاکستان جاتے وقت بہت
سے مسلمان اپنا قیمتی سامان بکسوں میں بند کر کے کنور صاحب کی کوٹھی پر چھوڑ گئے تھے۔
بعد میں انھوں نے اپنا سامان خود منگوایا یا کنور صاحب نے ان تک پہنچانے کا انتظام کیا۔
میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ حادثہ رونما ہو چکا تھا
جس کے بعد اردو پڑھنے والے نوجوان شاعر بن جاتے ہیں اور اگر شعر کہنے کی صلاحیت
نہیں ہوتی تو دوسروں کے شعر سن سن کر وصل اور فراق کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتے
ہیں۔ ڈاکٹر اسلم پرویز خود شعر کہتے تھے اور میں دوسروں کے شعروں سے کام نکالتا تھا۔
دہلی میں مشاعرے بہت ہوتے تھے لیکن ہمارے والدین کا خیال تھا کہ مشاعروں میں جانے

تھی۔ اور یہ روایت الحمدللہ آج تک قائم ہے۔ ہمیں اس قربت پر اعتراض نہیں تھا۔ اعتراض یہ تھا کہ جب کوئی شاعر اچھا شعر پڑھتا تو کنور صاحب دل کھول کر داد دیتے اور داد دیتے ہوئے پاس بیٹھی اس خاتون کی کمر تھپتھپاتے اور اس طرح تھپتھپاتے کہ ہاتھ خاتون کی کمر پر زیادہ دیر رہتا اور ہوا میں بہت کم دیر۔ مشاعرے کے سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ سُن لیجئے۔

دہلی کے رام لیلا گراؤنڈ میں بہت بڑا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ حسبِ معمول کنور صاحب میر مشاعرہ تھے۔ میرے محترم ساغر نظامی مرحوم انہی دنوں میں بمبئی سے دہلی آئے تھے۔ یہاں آل انڈیا ریڈیو پر ان کا تقرر ہوا تھا۔ وہ بھی مشاعرے میں شریک تھے۔ ساغر صاحب کو کلام پڑھنے کی دعوت دیتے ہوئے ساغر صاحب کے فن کی بہت تعریف کی لیکن شامتِ اعمال کہ کنور صاحب نے کہیں یہ کہہ دیا کہ "ساغر صاحب ملک کے سب سے بڑے قوال ہیں"۔ کنور صاحب نے جن الفاظ میں ساغر صاحب کا تعارف کرایا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کنور صاحب کا مقصد ساغر صاحب کا مضحکہ اڑانا ہرگز نہیں تھا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ ساغر صاحب مائک پر آئے اور ایسا بھڑکے کہ الٰہی توبہ۔ انھوں نے کنور صاحب کو بہت بھلی بُری سنائیں۔ یہ کنور صاحب کی شرافت اور انسانیت تھی کہ خاموش بیٹھے مسکراتے رہے۔ ساغر صاحب غصے میں کہنے لگے "جب سے یہ شیر دِلّی آیا لومڑیوں کی جان پر بن گئی"۔ اس موقع پر گلزار صاحب نے کھڑے ہو کر دست بستہ عرض کیا "حضور آپ جنھیں لومڑیاں کہہ رہے ہیں، دہلی آئی تھیں تو یہ بھی خود کو شیر کہتی تھیں"۔

کنور صاحب گرو نانک کے خاندان سے ہیں۔ انھیں ورثے میں بہت دولت ملی۔ ساری زندگی حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر گزاری، آزادی کے بعد حکومت کے اعلیٰ ترین صاحب اقتدار طبقے کے قریب ترین لوگوں میں رہے۔ وہ ہند و پاک کے مشاعروں کے روح رواں ہیں۔ ان کے نام سے مشاعرے کامیاب ہوتے ہیں۔ اس سب کے باوجود کنور صاحب خاکساری اور انکساری کا ایک زندہ مجسمہ ہیں۔ مجھے ان سے قربت کا فخر حاصل ہے۔ میں نے گھنٹوں ان کی گفتگو سنی ہے۔ لیکن کبھی ان کے منہ سے ایسا فقرہ نہیں سُنا، جس

سے نوجوانوں کا اخلاق بگڑ تا ہے ، اس لیے ہمیں مشاعروں میں جانے کی اجازت نہیں تھی ، ہم چھپ چھپ کر جاتے تھے ۔ مشاعروں میں ہمارے لیے دلکشی کے دو وجوہ تھے ۔ ایک تو شعرو شاعری اور دوسرے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ، گلزار دہلوی ، اور ایک خاتون ۔ اسکول میں ہمیں کچھ ایسے اساتذہ نے تعلیم دی تھی ، جنھوں نے ہمیں ذہن نشین کرایا تھا کہ زبان کی بنیاد مذہب پر ہوتی ہے ۔ اردو مسلمانوں کی ، ہندی ہندوؤں کی اور پنجابی سکھوں کی ۔ ان حالات میں جب ہم مشاعروں میں ایک وجیہہ اور حسین سکھ کو بہت شگفتہ اور خوبصورت اردو بولتے ہوئے سنتے تو حیرت میں ڈوب جاتے ۔ سکھ اور ایسی بامحاورہ اور شگفتہ اردو ـــــ جی چاہتا تھا کہ بس کنور صاحب بولتے ہی رہیں ۔ مشاعروں کے میرِ مشاعرہ کنور صاحب ہی ہوتے ۔ وہ ہر شاعر کا تعارف بہت دلچسپ انداز میں کراتے ، موقع کے مطابق شعر سناتے لطیفوں سے مشاعروں کو زعفران زار کر دیتے ۔ بہت سے شاعروں کے کلام سے بہتر کنور صاحب کی نثری گفتگو ہوتی ۔ یقین جانیے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مُنہ سے پھول جھڑ رہے ہوں ۔ مشاعروں کی دوسری شخصیت تھی گلزار دہلوی ۔ گورے چٹے ، بوٹا سا قد بہت ہی سلیقے سے پہنی ہوئی شیروانی اور اسٹیج پر اچھل کود ۔ کبھی ادھر بیٹھے اور کبھی اچھل کر کسی اور شاعر کے پاس جا بیٹھے ۔ کلام سُنانے سے پہلے ایسی زبان میں تقریر کرتے کہ جس پر فارسی کا شبہ ہوتا ۔ ان کے بہت سے الفاظ اور فارسی ترکیبوں کا مطلب اس زمانے میں تو کیا آج بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتا ۔ بہرحال ہم ان کے مداح بلکہ FAN تھے ۔ مشاعروں کی تیسری شخصیت ایک خاتون کی تھی ۔ درمیانہ قد ، گورا رنگ ، لمبوترا چہرہ ، آنکھیں نرگسی ، لب و لہجہ مردانہ ، اور گفتگو میں رس ۔ سامعین کی توجہ کا خوب مرکز رہتیں ۔ عمر میں ہم سے بہت بڑی تھیں ۔ لیکن بہت اچھی لگتی تھیں ۔ بڑے ہو کر جب بزرگ شاعروں کی پرائیوٹ محفلوں میں شریک ہونے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ ان بیشتر ہم عصر شاعروں کو وہ خاتون اچھی لگتی تھیں ۔ ان معاصر شاعروں میں بعض کا شعری محرک بھی وہی تھیں ۔ اس خاتون کے سلسلے میں کنور صاحب کی ایک بات ہمیں بہت ناگوار گزرتی تھی ۔ ان سب واقعات کو مدتیں گزریں لیکن اس ناگواری کے اثرات آج بھی ذہن پر نقش ہیں ۔ مشاعروں میں یہ خاتون بلکہ ہر خاتون کنور صاحب کے پاس ہی بیٹھتی

ہیں ان کی اپنی تعریف کا پہلو نکلتا ہو یا جس میں "ہم چو مَن دیگرے نیست" کی بو آتی ہو۔ اگر کوئی ایسا واقعہ سُناتے ہیں، جس میں ان کی برتری ثابت ہوتی ہو، یا جس میں وہ کسی شخص کی مالی یا کسی اور طرح کی مدد کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں، اس وقت ان کے چہرے کی کیفیت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ اور لہجے میں کچھ لکنت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے، جیسے کوئی ناتجربہ کار نوجوان۔

کنور صاحب کو اہلِ اردو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کنور صاحب کو شگفتہ سلیس اور دلکش و دلاویز نثر لکھنے پر جو قدرت حاصل ہے وہ بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت ان کی خود نوشت سوانح عمری "یادوں کا جشن" ہے۔ اس سوانح میں ہندوستان اور خاص طور سے دلی کی ادبی سماجی اور سیاسی زندگی پر بہت خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ سوانح عمری اس لئے نہیں لکھی گئی کہ پڑھنے والے پر اپنے خاندانی وقار اور اپنی عظمت کا سکّہ بٹھایا جائے۔ یہ دونوں کام تو قدرت پہلے ہی کر چکی تھی۔ اس سوانح عمری میں کسی غزل کے چھیڑنے پر عمر رفتہ کو آواز دینے کی سی کیفیت ہے۔ اس سوانح عمری سے یاد آیا کہ آزادی کے بعد یہ پہلی کتاب ہے جس کا مصنف ہندوستانی ہے۔ اور جسے مصنف کے پاکستانی دوستوں نے بڑے اہتمام سے پاکستان میں شائع کیا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا، ہندوستانی ادیبوں کا ایک پاکستانی وفد پاکستان گیا تھا۔ میں بھی اس وفد میں شریک تھا۔ اس وفد نے کراچی، اسلام آباد، لاہور، میں مختلف ادبی تقریبوں، اور سمیناروں میں شرکت کی تھی۔ اس دوران میں پاکستان میں کنور صاحب کی مقبولیت اور شہرت کا اندازہ ہوا۔ ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں میں سب سے زیادہ مقبولیت پاکستان میں کنور صاحب کو حاصل ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری دونوں حلقوں میں۔ پاکستان کے صدر جنرل ضیاءالحق نے وفد کو ڈنر دیا اس ڈنر کے موقع پر انھوں نے کہا کہ میں جب ہندوستان گیا تھا تو میں نے صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ سے کہا تھا کہ آپ کنور صاحب کی قیادت میں ہندوستانی ادیبوں کا ایک وفد پاکستان بھیجئے۔ میں شکر گزار ہوں کہ ذیل سنگھ صاحب نے میری درخواست قبول کی۔ صدر ضیاءالحق نے کنور صاحب کی اتنی تعریف کی کہ ہندوستان

ادیبوں کے وفد کے تمام اراکین کے سر فخر سے بلند ہو گئے۔

میرا یقین ہے کہ ہندوستان کا کوئی وفد کسی بھی مقصد سے پاکستان جائے، اس کا قائد کنور صاحب کو ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ان کی موجودگی ہی وفد کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

کنور صاحب باقاعدہ خاکہ نگار نہیں ہیں۔ لیکن "یادوں کا جشن" میں انھوں نے اپنے دوستوں اور ہم عصروں کے جو چھوٹے چھوٹے خاکے لکھے ہیں وہ اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ اگر کنور صاحب خاکہ نگاری کے فن کو باقاعدہ اختیار کرتے تو ان کا شمار اردو کے بہترین خاکہ نگاروں میں ہوتا۔

کنور صاحب کی قوت مشاہدہ بہت تیز ہے۔ وہ کسی شخصیت کا قلمی خاکہ لکھتے ہوئے صرف ان پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں، جن سے اس شخصیت کی پوری تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ دہلی میں ایک بزرگ شاعر تھے استاد ہلال۔ میں نے لڑکپن میں انھیں دیکھا تھا۔ اُن کی مختلف داستانیں اور دلچسپ لطیفے تو آج تک مشہور ہیں، کنور صاحب نے ان پر دو صفحے لکھے ہیں۔ پہلے ہی پیراگراف میں استاد ہلال کا بھرپور عکس اتار دیا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"گورا رنگ، دراز قد، چہرے پر ضعیفی کے باوجود حُسن۔ آنکھیں روشن لب و لہجہ میں سنجیدگی۔ یہ تھے استاد ہلاؔل دہلوی۔ ان سے بھی میری پہلی ملاقات خواجہ شفیع کی اردو مجلس میں ہوئی۔ وضع قطع سے میں نے یہ سمجھا کہ کوئی خاموش خانہ نشین سے شاعر ہیں، جو مشاعروں سے اکثر گریز کرتے ہیں۔ لیکن مخصوص نشستوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ جب خواجہ صاحب نے اُن کا تعارف کرایا تو میں سمجھ گیا کہ یہ بزرگ بھی اس جماعت کے شاعر ہیں جو بظاہر سنجیدہ نظر آتے ہیں لیکن شاعری میں جن کی ایک نہیں کئی چولیں ڈھیلی ہوتی ہیں۔ آپ کے پڑھنے کا انداز بھی نرالا تھا۔ انھیں بارہا سننے کے باوجود میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ ترنم سے پڑھتے ہیں یا تحت اللفظ۔ ماشاء اللہ وہ فارغ البحورین تھے۔ قوافی بھی عجیب و غریب تراشتے تھے۔

ویسے نجی زندگی میں وہ ایک اچھے دواخانے کے اکاؤنٹینٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ عام گفتگو میں بھی سنجیدہ نظر آتے تھے۔ لیکن جہاں شاعری کا ذکر آیا تھا تو صورت ہی دوسری دکھائی دیتی تھی۔"

کنہیالال پوسوال کا خاکہ اور سُن لیجئے:-

"لمبا قد، متناسب جسم، گورا چہرہ، گفتگو میں اخلاص اور نرمی گوپیوں کی توجہ کا مرکز کرشن کنہیا۔ یہ ہیں کنہیالال پوسوال۔۔۔۔ نہایت ہی ملنسار اور خدمت گزار قسم کے انسان ہیں۔ ہریانہ میں وزیر داخلہ بھی رہے ہیں۔ جنتا حکومت کے قیام کے بعد ہریانہ میں واحد کانگریسی امیدوار تھے، جو چناؤ میں کامیاب ہوئے۔ دوستوں کے بہت اچھے دوست ہیں مگر دشمنوں کے دشمن بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہریانہ کی جنتا حکومت نے بھی، ہمیشہ ان کا احترام کیا۔ اب پھر جب کانگریسی حکومت آئی ہے تو وزیر داخلہ مقرر کیے گئے ہیں۔

پوسوال صاحب ایک خوبصورت مرد ہیں۔ اہل دل ہیں، سخی ہیں۔ اس لیے وہ صنف نازک کی توجہ کا خاص مرکز بنے رہے ہیں۔ ان کے دوست احباب انھیں ان کی ان فتوحات کی داد دیا کرتے ہیں۔ ایک بار ایک نوجوان اسکول ٹیچر میرے پاس آئی اور شکایت کی کہ اُسے کئی مہینوں سے تنخواہ نہیں ملی۔ وہ اس بارے میں درخواست دے کر جلد ہی اپنے گاؤں واپس جانا چاہتی تھی۔ میں اس سے کہا کہ یہ دریافت کرنے میں کہ اُسے کیوں اتنے ماہ سے تنخواہ نہیں ملی، کچھ وقت لگے گا۔ اس لیے یا تو وہ دو تین دن کے بعد پھر مجھ سے دریافت کرے، یا کسی ایسے آدمی سے کہہ دے، جو اُسے جانتا ہو۔ ساتھ ہی وہ میرا بھی واقف ہو تاکہ میں اُسے ساری تفصیل بتا دوں۔ وہ کہنے لگی میں خود تو نہیں آسکوں گی لیکن کسی کے ذمّہ اس کام کو لگا جاتی ہوں، وہ آپ سے پوچھ لے گا میں نے کہا، یہی درست رہے گا۔ وہ کہنے لگی آپ کنہیالال پوسوال کو جانتے ہیں، میں نے کہا، ان کو تو میں خوب جانتا ہوں

اور اب آپ کو بھی جان گیا - اس نے کہیں پوسوال صاحب سے اس بات کا ذکر کیا ہوگا - جب وہ اگلی بار مجھ سے ملے تو تذکرہ کیا کہ وہ لڑکی کہتی تھی کہ کنور صاحب کو ان ساری باتوں کا پتہ کیسے چل گیا - بہت دیر تک ہنسی مذاق ہوتا رہا -

بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی میں کنور صاحب کا جواب نہیں - کوئی شخص چاہے جیسی ان پر چوٹ کرے، انھیں کبھی غصہ نہیں آئے گا - ہمیشہ ہنس کر ایسا جواب دیں گے کہ چوٹ کرنے والے کے دانت کھٹے ہو جائیں - ایسا ہی ایک واقعہ سنیے - ایک دفعہ ایک پٹھان کسی کام سے کنور صاحب کے پاس آئے - گفتگو کے دوران وہ بے تکلف ہو گئے - اور انھیں کچھ مذاق کی سوجھی - کہنے لگے کنور صاحب! آپ تو پڑھے لکھے سردار ہیں - کیا یہ بات واقعی صحیح ہے کہ دن کے بارہ بجے سرداروں کو کچھ ہو جاتا ہے - کنور صاحب نے کہا کہ یہ تو لوگوں نے یونہی مذاق بنا رکھا ہے ورنہ اس کا حقیقت سے کیا تعلق؟ ان صاحب نے اصرار کیا کہ انھوں نے خود بارہ بجے سرداروں کو بہکتے دیکھا ہے - کنور صاحب نے پھر سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ بھائی، سردار ذہانت میں علم میں، قابلیت میں کسی ہندوستانی سے کم تھوڑے ہی ہوتے ہیں - یہ تو لوگوں نے لطیفے گھڑ لیے ہیں - کنور صاحب بات ٹالنا چاہتے تھے، لیکن وہ پٹھان صاحب اصرار کیے جا رہے تھے کہ سب سردار بارہ بجے بہک جاتے ہیں - بحث ختم کرنے کے لیے کنور صاحب نے کہا، فرض کیجیے آپ درست فرما رہے ہیں، تو کیا ہوا؟ پٹھان صاحب فرمانے لگے دن کے بارہ بجے ہی کچھ ہوتا ہے یا رات کے بارہ بجے بھی کچھ ہوتا ہے؟ کنور صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، بھائی! اگر کچھ ہوتا بھی ہے تو دن کو بارہ بجے ہوتا ہے - رات کو کیا سوال پیدا ہوتا ہے - پٹھان صاحب فرمانے لگے، لیکن ہماری گلی میں تو ایک سردار رہتا ہے، وہ رات کو بھی بہکتا ہے - اب کنور صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا - اور ساتھ ہی ان کی حسِ مزاح جاگ اٹھی - فرمانے لگے میاں سرداروں میں ایسا ہی ہوتا ہے جو میں بتا رہا ہوں - وہ سالا پٹھان سے سکھ ہوا ہوگا - وہ صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے -

دہلی والا ہونے کی وجہ سے یہ بات میرے علم میں ہے کہ دہلی میں کنور صاحب مجسٹریٹ کی حیثیت سے بہت مقبول تھے۔ لوگ اُن کی حق پرستی اور انصاف کے بہت قائل تھے۔ اسی لیے مظلومین اور ان کے وکیلوں کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کا مقدمہ کنور صاحب کی عدالت میں پیش ہو۔

عدالت مجبور ہے کہ اپنا فیصلہ پیش کی گئی شہادتوں کی بنیاد پر کرے۔ لیکن کبھی کبھی کچھ لوگ شہادتیں پیش کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، جس وجہ سے مظلوم غلط فیصلوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ کنور صاحب عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر فیصلہ کرتے وقت شہادتوں کے علاوہ عقل کا بھی استعمال کرتے تھے۔ اسی لیے کبھی کبھی، کنور صاحب کی عدالت قدیم داستانوں کے قاضی صاحب کی عدالت بن جاتی تھی۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ سنیے۔

ایک دفعہ کنور صاحب کی عدالت میں ایک نوجوان ملزم کو پیش کیا گیا۔ اُسے تھانیدار نے گرفتار کیا تھا۔ تھانیدار کا کہنا تھا کہ ایک رات وہ گشت کر رہا تھا، اس نے دیکھا کہ کوئی شخص دیوار سے چپکا کھڑا ہے، تھانیدار کو دیکھتے ہی ملزم بھاگ نکلا۔ تھانیدار نے پیچھا کر کے اسے پکڑ لیا۔ اس کی جیب سے موم بتی، ماچس اور بلیڈ نکلا، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ملزم کسی واردات کے لیے وہاں کھڑا تھا۔ کنور صاحب نے پولیس کا پورا بیان غور سے سُنا۔ انھوں نے دیکھا کہ نوجوان بہت کم عمر اور بہت دبلا پتلا ہے اس کے برعکس تھانیدار بہت موٹا اور معمّر تھا۔ کنور صاحب عدالت کے کمرے سے باہر آ گئے۔ تھانیدار، ملزم، اُس کے وکیل اور عدالت میں حاضر دوسرے لوگوں کو اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ ملزم، وکیل، گواہ اور عدالت کے ملازمین سب پریشان تھے، کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ کنور صاحب سب کو لے کر عدالت سے قریب رِنگ روڈ کی طرف چلنے لگے، اس ہجوم کو جاتا دیکھ کر اور بھی بے شمار لوگ ساتھ ہو گئے۔ بالآخر یہ جلوس رِنگ روڈ پر پہنچا۔ کنور صاحب نے دبلے پتلے ملزم اور فربہ اندام تھانیدار کو ایک ساتھ کھڑا کر کے تھانیدار سے کہا کہ میں ملزم سے دوڑنے کے لیے کہوں گا۔ آپ بھاگ کر اسے پکڑ لیجیے۔ ظاہر

ہے کہ ملزم کے پیچھے دوڑنا تھانیدار کے بس کا نہیں تھا۔ مختلف بہانے کرنے لگا۔ کنور صاحب عدالت میں آئے اور ملزم کو رہا کر دیا۔

کنور صاحب دلوں کے درد سے خوب واقف ہیں حسن وعشق کے معاملات میں وہ کچھ زیادہ ہی فعال ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے بڑی بڑی تعداد میں چاہنے والوں کی ناکامی کو کامیابی میں بدلا ہے۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس سلسلے کا واقعہ سُن لیجئے۔ دہلی کے ایک مسلم نوجوان نے کنور صاحب کی عدالت میں درخواست دی کہ مجھے فلاں لڑکی سے محبت ہے، وہ لڑکی بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں، لیکن اُس کے گھر والے اُس کی مرضی کے خلاف اُس کو گھر میں روکے ہوئے ہیں۔ اس طرح کی درخواست ملنے پر اگر عدالت کو یہ یقین ہو جائے کہ درخواست میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ درست ہے تو عدالت زیر دفعہ ۱۰۰ فوجداری وارنٹ نکال کر علاقے کے تھانیدار کو حکم دیتی ہے کہ وہ لڑکی کو عدالت میں حاضر کرے۔ کنور صاحب دونوں خاندانوں کو جانتے تھے۔ دونوں شریف اور معزّز خاندان تھے۔ کنور صاحب جانتے تھے کہ اگر عدالتی کارروائی کی گئی تو دونوں خاندانوں اور خاص طور سے لڑکی کے خاندان کی بہت رسوائی ہوگی۔ اس لیئے کنور صاحب نے لڑکی کے والد کو اپنے گھر بلا کر انھیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ والد کو یقین ہی نہیں آیا کہ اُن کی لڑکی صاحبِ دل ہو سکتی ہے کنور صاحب نے مشورہ دیا کہ وہ صاحب ماں یا سہیلیوں کی معرفت لڑکی سے دریافت کریں۔ دوسرے دن وہ صاحب کنور صاحب کے پاس آئے اور بتایا کہ "دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی"۔ لڑکی کے والد بہت نروس تھے، اُنھیں خاندان کی عزت کا خیال بہت پریشان کر رہا تھا۔ کنور صاحب نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ لڑکے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کے لیئے تیار ہیں۔ ان صاحب نے بتایا کہ لڑکا انھیں پسند ہے، وہ شادی بھی کرنا چاہتے ہیں مگر اس طرح کہ بدنامی نہ ہو۔ کنور صاحب نے انھیں اطمینان دلا کر گھر بھیج دیا۔ کچھ دن بعد کنور صاحب نے لڑکے والوں کی طرف

سے کچھ معزز حضرات کو پیغام دے کر لڑکی کے گھر بھیجا، فریقین راضی ہو گئے۔
اور شادی ہو گئی۔ میرا عقیدہ ہے کہ یہ کام بغداد کے ہارون رشید کر سکتے تھے یا
پھر ہندوستان کے کنور مہندر سنگھ بیدی۔

یہ ہے دلچسپ شخصیت ہمارے کنور مہندر سنگھ بیدی کی۔ خدا انھیں ہمیشہ
تندرست، خوش و خرم اور ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی

گنگا جمنی تہذیب کے نمائندے کنور صاحب

قبلہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر شہزادے ہیں اور دو آتشہ شہزادے ہیں ایک شہزادگی ان کی روحانی ہے کہ حضرت باباگورونانک کی اولاد ہیں۔ اور ایک شہزادگی جسمانی کہ زر زن، زمین، حکومت سب ان کے زیر نگیں رہے ہیں۔ انسانی کارخانے کی اسمبلی لائن پر کبھی کبھی کسی بھول چوک کی وجہ سے شہزادوں کو جسم غلاموں کا سا مل جاتا ہے۔ مگر کنور صاحب کے سلسلے میں ایسی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ صورت سیرت ہر لحاظ سے وہ شہزادے ہیں۔ بوٹا سا قد، گورا رنگ جس کو شاید باوا آدم کی مخصوص رغبتوں کی وجہ سے انھوں نے گندم گوں کر لیا ہے۔ تیکھے نقوش، کسرتی بدن کہ جو لباس پہنیں جچے۔ رزم بزم دونوں کی رونق۔ اتنی نعمتیں خدا کسی بندے کو عطا کرے اور وہ خود فراموش نہ ہو جائے۔ بگڑنے سے بچ جائے۔ ایسا کم ہوتا ہے۔ مگر جب ہوتا ہے تو کنور مہندر سنگھ بیدی جیسی شخصیت بنتی ہے۔

کنور صاحب چاہتے تو خاندانی عظمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے۔ اور اپنا پورا انحصار موروثی زمیں داری پر رکھتے۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ دنیا میں ہوتا بھی یہ ہی ہے کہ جہاں کسی شہزادے اور پیرزادے

پر تین چار پشتیں گذریں اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھا۔ مگر کنور صاحب ان روائتی بادشاہ زادوں اور بزرگ زادوں سے قطعی مختلف ہیں۔ انھوں بزرگوں کے ورثے کو محض ایک مزید نعمت سمجھا اور اپنا پانی خود کنواں کھود کر پیا۔ ان کی ساری عظمت اپنی پیدا کی ہوئی ہے۔ اور جہاں تک زندگی کی تگ و دو اور جد وجہد کا تعلق ہے۔ قبلہ کنور صاحب کا بڑھاپا بہت سے جوانوں کو شرمانے والا بڑھاپا ہے۔ وہ سرکاری سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی اپنی ہمہ جہت مصروفیتوں سے ریٹائر نہیں ہوئے۔ انھوں نے ہندوستانی سماج کو خاص کر اس کی مشترکہ قدروں کو بہت کچھ دیا ہے۔ اور اس کے بدلے میں عوام و خواص سے محبّت اور عقیدت کا جو خراج وصول کیا ہے۔ اس کی مثال آزادی کے بعد کے برِصغیر میں مشکل سے ملے گی۔

کنور صاحب نے زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے۔ آزادی کی جد وجہد دیکھی۔ ۱۹۴۷ء کا پُر آشوب زمانہ دیکھا۔ آزادی کی خوش حالی اور فارغ البالی کے مزے چکھے اور پھر ایک دفعہ اور فرقہ وارانہ فسادات سے دوچار ہوئے۔ مگر ہر زمانے میں انھوں نے جام و سنداں کا حق ادا کیا۔ جنگ آزادی کے انتہائی نازک دور میں انگریز حکومت کا ایک افسر ہونے کے باوجود آزادی کے بعد کوئی ان کی طرف انگلی اٹھا کر یہ نہ کہہ سکا کہ کنور صاحب نے فلاں بات غلط کی تھی اور ان کا فلاں قدم جذبہ حب الوطنی کے خلاف تھا۔ اسی طرح آزادی کے بعد جب بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے اور ذاتی فائدے اٹھانے کا وقت آیا تو کسی سے یہ شکایت نہیں سنی گئی کہ کنور صاحب نے اپنا گھر بھرا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دو فرقے جو ایک دوسرے پر کم سے کم اعتماد رکھتے تھے۔ مسلم اور سکھ فرقے تھے۔ لیکن اس دور میں اگر کوئی مسلمان کسی سکھ پر اپنے بھائی اور جگری دوست ـــــ سے بھی زیادہ اعتماد رکھتا تھا۔ تو وہ کنور مہندر سنگھ بیدی تھے کہ مسلمان جوق در جوق پناہ اور مدد کے لیئے ان کی طرف رجوع ہوتے تھے۔ کنور صاحب اور ان کے خاندان کو پاکستان کا علاقہ اور اپنی قیمتی زمین اور جائداد چھوڑ کر ہندوستان آنا پڑا تھا۔ لیکن اس امتحان نے ان کے مزاج میں ذرا بھی تلخی پیدا نہیں کی۔ اسی طرح دہلی کے حالیہ فسادات میں ان کے بیٹے کا گھر جلا مگر اس کی تمازت نہ

کنور صاحب کے چہرے کو تمتما نہ سکی - نہ کنور صاحب کا دریا دل کدورت کی ریت سے اٹا - نہ ان کے روشن اور بے تعصب دماغ پر فرقہ واریت کی آندھی گرد و غبار کا کوئی اثر چھوڑ سکی - کنور صاحب ہر آگ سے کندن بن کر نکلے اور ہر آزمائش نے ان میں ایک نیا نکھار پیدا کیا - شاید ان کا مقدس خون ان کی حفاظت اور رہنمائی کرتا رہتا ہے -

کنور صاحب کی وضع داری بھی بے مثال ہے - ان کا جس سے جو تعلق ہے اس کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں اور نبھاتے ہیں - لوگوں کے کام آنا اور دنیا کے بگڑے کام بنانا ان کی عبادت ہے - ان کا دربار کھلا دربار ہے - وہاں کسی کو بھی باز یابی میں دشواری نہیں ہوتی - وہ سب کے خیر خواہ ہیں اور اپنے عقیدت مندوں پر شفیق باپ کی طرح مہربان رہتے ہیں - ادیبوں اور شاعروں کی پرورش وہ اپنا فرض منصبی جانتے ہیں - اور اس سلسلے میں پرانے راجہ نوابوں کا فرض کفایہ وہ اکیلے ادا کرتے رہتے ہیں -

قبلہ کنور صاحب سنگھ بیدی کی شخصیت اس لحاظ سے بھی بے مثال ہے کہ وہ ہندوستان پاکستان کے عوام ہی میں نہیں - پتہ کھڑکے بندہ بھڑکے قسم کے ارباب اختیار میں بھی یکساں مقبول اور محبوب ہیں - کسی من چلے کی تجویز تھی کہ کنور صاحب کو سفیر بنا دیا جائے یہ وضاحت اس نے غالباً جان بوجھ کر نہیں کی کہ انھیں پاکستان کا سفیر ہندوستان میں بنایا جائے یا ہندوستان کا سفیر پاکستان میں مقرر کیا جائے کیونکہ یہ سب ہی جانتے ہیں کہ وہ جس کے سفیر جہاں ہوں - کام چل ہی جائے گا - البتہ یہ خیال اس ستم ظریف کو نہیں آیا کہ کنور صاحب حضرت غالب کی برادری سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے کہا تھا ؎

دوست دار دشمن ہے اعتماد دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی - نالہ نارسا پایا

غالب نے محبوب کو دشمن یوں کہا کہ وہ ظلم ڈھاتا رہتا ہے - اور اپنے

آہ نالے کی بے اثری کی وجہ سے کچھ بیں آتی کہ دل اندر رخانے اس دشمن یعنی محبوب سے ملا ہوا ہے ۔ یعنی وہ خفیہ خفیہ دشمن کا دوست دار ہے ۔ دشمن کو دوست رکھتا ہے نالہ وفریاد تو محض دکھاوے کے ہوتے ہیں۔ اب کوئی ایمانداری سے بتائے کہ کنور صاحب جس کے سفیر جہاں ہوں۔ دشمن کے دوست دار سمجھے جائیں گے یا نہیں؟ اور ان حالات میں کون انھیں سفارت جیسا نازک کام سونپے گا۔ بلکہ ایک اندیشہ ان کی سفارت میں اور بھی ہے اور وہ بھی غالب کے شعر ہی سے پیدا ہوا ہے۔ کنور صاحب سفیر ہو گئے تو سیاسی جھگڑے تو شاید مٹ جائیں مگر عاشقی معشوقی کے جھگڑے فوراً شروع ہو جائیں گے ۔ کنور صاحب ٹھہرے دونوں جگہ محبوب ۔ اس یوسف ہندی کی خاطر کون سی زلیخا طعنے تشنوں سے بچے گی ؟ لامحالا اُس مصر والی بی بی کی طرح یہاں بھی رقیبوں کے لئے مہنگے مہنگے پھل خریدنے ہوں گے اور اس سے زیادہ مہنگی چھریاں فراہم کرنی پڑیں گی۔ اور سرحدوں پر طوبیں نہ بھی چلیں تو حسینوں کی انگلیاں کٹنے کی نوبت تو ضرور آجائے گی۔ اور وہ بھی صرف اتنی سی بات کی گنجائش نکالنے کے لئے کہ جو میرا حال وہی پڑوسن کا!

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

اللہ تعالیٰ کنور صاحب قبلہ کو ہزاری عمر دے ان کے دم سے علمی ادبی محفلوں ہی میں روشنی نہیں ہے ۔ محبت اور اخوت کی یادگاری بھی ہے۔ وہ ہمارے مشترکہ کلچر اور گنگا جمنی تہذیب کے نمائندے ہیں۔ اور مذہبی رواداری میں ان کی شخصیت مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی انھیں سفیر بنائے یا نہ بنائے جس طرح وہ مقبولیت کی دنیا میں عوام وخواص کے بے تاج بادشاہ ہیں ۔ اس طرح برصغیر کی سیاسی حد بندیوں کے باوجود ایک ایسے پسندیدہ انسان اور شہری ہیں۔ جس کی ہر جگہ قدر ہے۔ جس کی ہر جگہ طلب گاری ہے۔ جو نفرتوں کے دریا پر محبتوں کا پل ہے۔ جس نے زندگی سے اچھی چیزیں لی ہیں اور جس نے زندگی کو اچھی چیزیں دی ہیں۔ جس کی شخصیت کل بھی سب کو پیاری تھی۔ آج بھی پیاری ہے۔ اور آنے والے کل بھی خدا نے چاہا وہ اسی طرح محبوب اور مقبول رہیں گے۔

نریندر لوتھر

یادوں کا جشن ۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

بہت عرصے کے بعد اُردو میں ایک ایسی سوانحِ عمری دِکھائی دی ہے جسے میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا ۔ بعد میں افسوس ہوا کہ اگر اتنی جلد بازی نہ کرتا تو کئی دن تک مزے لے سکتا تھا۔

"یادوں کے جشن" میں بیدی صاحب کی ہمہ گیر پہلودار اور پُرکشش شخصیت اپنی پوری شان اور آب و تاب کے ساتھ اُبھر کر سامنے آتی ہے ۔ رئیس زادہ ۔ غریب نواز، شاعر ۔ ادیب نواز، افسر ۔ عوام پسند، ماہر شکاری ۔ جانوروں کا عاشق، اکھاڑے کا پہلوان ۔ نفاست کا دلدادہ، پکا سِکھ ۔ تعصب سے پاک، ماہر انتظامیہ، سوجھ بوجھ اور حکمتِ عملی کا حامل ۔ کتنی ہی صورتیں ہیں کہ عیاں ہو گئیں!

یہ ایک شخص کی سوانح حیات نہیں، ایک عہد کی تاریخ ہے ۔ مصنف اگر کوئی سیاستداں یا تاریخ داں ہوتا تو اِس کتاب کو 'غلامی سے آزادی تک'، یا پرکاش ٹنڈن کی انگریزی سوانح "دی پنجابی سنچری"، کا عنوان دے سکتا تھا ۔ لیکن یہ ایک حساس شاعر کی زندگی کا سفرنامہ ہے ۔ جو بیسویں صدی کے دو تہائی حصے کا احاطہ کرتا ہے ۔ اس عرصے میں بیدی صاحب کی بزم ہمیشہ آراستہ رہی ۔ اِس بزم میں رِند بلا نوش اور زاہد خُشک نے ایک ہی گھاٹ اور بیک

وقت پانی اور اپنی اپنی پسند کی وہسکی پی ہے۔ ہر ورق پر ہند و پاک کی نامور سیاسی، ادبی اور سوشل ہستیاں اپنے مختلف موڈوں اور مخصوص انداز میں خراماں نظر آتی ہیں۔ بیدی صاحب نے اُن سے ہمارا تعارف کرایا ہے۔ ان میں سے اچھے لوگوں کو سراہا ہے۔ جن کو کوسنا چاہیئے تھا، ان کو فراخدلی سے معاف کر دیا ہے یا طنز کا ایک ہلکا سا تازیانہ لگا دیا ہے۔ اُن کی جولانیِ طبع بیان کی روانی بن گئی ہے۔ نہایت ہی سلیس زبان میں بے شمار دلچسپ اور سبق آموز واقعات کو بیان کیا ہے۔

اس کتاب کو دیکھ کر غیر ارادی طور پر جوش مرحوم کی خود نوشت "یادوں کی بارات"، یاد آجاتی ہے۔ بیدی صاحب نے اپنی دلچسپ اور معرکہ آرا زندگی کے "براتوں" کے اس عنصر کے بیان سے احتراز کیا ہے جن کی جوش صاحب کی کتاب میں بھر مار ہے۔ یہاں تک کہ ان کی ایک برات (جو ہر صورت جائز ہے) کا ذکر بھی نہیں آیا۔ بقول بیدی صاحب یہ پالیسی اس مصلحت کے تحت اپنائی گئی تاکہ یہ کتاب پورے کا پورا کنبہ ایک ہی وقت ساتھ بیٹھ کر پڑھ سکے۔ گویا "فیملی پکچر" کی طرح یہ 'فیملی بک' ہے۔ بیدی صاحب کا یہ خدشہ کہ ایسے تذکروں سے بچّوں کے اخلاق پر کہیں بُرا اثر نہ پڑے بیجا لگتا ہے آج کل کونسا ایسا بچّہ ہے جو اردو پڑھ سکتا ہے؟ اور اگر کوئی ہے تو اس کا کردار مزید خراب ہونے سے رہا۔ میری رائے ہے کہ بیدی صاحب بِلا خوف اپنی دوسری سوانح حیات لکھنا شروع کر دیں جس کو (A) سرٹیفیکٹ دے کر صرف بالغوں کے لئے ہی شائع کیا جا سکتا ہے۔ اور چونکہ حکومت اب تعلیم بالغاں پر زور دے رہی ہے، اِس لئے یہ برموقع اور مفید ثابت ہو گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حکومت اِسے خود ہی سپانسر کر دے۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ بیدی صاحب کی یہ کتاب غیر دانستہ طور پر ہندو پاکستان کی مشترکہ قدروں اور بنیادی دوستی کی مظہر بن گئی ہے کہ لِکھی تو ہندوستان میں گئی اور چھپی پاکستان میں ــــ اور پڑھی جائے گی دونوں ملکوں میں!

یہ کتاب بیشتر کتب خانوں کی زینت بنے گی۔ تاریخ کے طالب علم، سوشل ورکر، افسر اور سرکاری نوکر، ادیب اور شاعر ہر قسم کے لوگ اس سے محظوظ اور مستفید ہو سکتے ہیں۔ آج تک بیدی صاحب ایک قد آور اور منفرد شاعر کی حیثیت سے مانے جاتے تھے۔

اس کتاب کے لکھنے کے بعد انھوں نے نثر کے نگار خانے میں اپنے لئے ایک دائمی گوشہ محفوظ کر لیا ہے۔"یادوں کے جشن" کے انعقاد کے ساتھ اُردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ نثر نگاروں کو "صحبت آدمی مبارک ہو"

کشمیری لال ذاکر

عالی جاہ

جب کوئی پینتیس برس پہلے میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ سے ملا تو اُن کے پاس کئی شاعر جمع تھے۔ ساحرؔ ہوشیار پوری، نریش کمار شادؔ، بسمل سعیدی، عرش ملسیانی(؟) عزیز وارثی، رام کرشن مضطر، کچھ اور شاعر بھی تھے جن کے نام مجھے اس وقت یاد نہیں۔ اور سبھی اُنہیں عالی جاہ کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے سمجھا شاید وہ بہت بڑے شاعر ہیں اس لیے سب انہیں 'عالی جاہ' کہتے تھے۔ جب اُن سے ملاقاتوں کا سلسلہ بہت طویل اور گہرا ہوتا گیا اور ہم آپس میں بہت کھل گئے تو میں نے جانا کہ شاعر تو وہ تھے ہی اور مشاعرے بھی لوٹتے تھے لیکن وہ ایک بہت اچھے انسان تھے اور میری نظر میں ایک بہت اچھا انسان ہونا ایک بہت اچھا شاعر ہونے سے زیادہ اہم ہے۔ اس دوسرے انکشاف کے بعد میں نے بھی اُنہیں عالی جاہ کہنا شروع کر دیا۔

لیکن اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔

اتنا طویل عرصہ گذرنے کے ساتھ ساتھ ہم دونوں کے تعلقات بھی مختلف مراحل سے گزرتے گئے اور ایک اسٹیج ایسی بھی آگئی کہ ان کے خاندان میں بھی مجھے ایک خاص مقام حاصل ہو گیا۔ ان کے خاندان کے رواج کے مطابق اُن کے چاروں بھائیوں میں

سے ہر چھوٹا بھائی اپنے سے بڑے بھائی کو عالی جاہ کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی
اپنے سے بڑے بھائی جسٹس ٹکا جگجیت سنگھ بیدی کو عالی جاہ کہتے ہیں اور کنور لاجندر سنگھ بیدی
جو اُن سے چھوٹے ہیں اُنہیں عالی جاہ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور سب سے چھوٹے بھائی
سُریندر سنگھ بیدی کے لئے تو سارے بھائی 'عالی جاہ' ہیں۔ یہ 'عالی جاہ' والا سلسلہ
بڑا عجیب و غریب ہے۔ جو کوئی ان کے خاندانی چکر سے واقف نہیں انہیں شاید
اکھرتا ہی ہو۔ آخر یہ عالی جاہ کیا ہوا؟

میں یہاں کنور مہندر سنگھ بیدی کی شاعری کے بارے میں بات نہیں کروں گا میں تو
صرف اُن کی انسان دوستی، مروت، فراخدلی اور دوست نوازی کی بات کروں گا۔

وہ دوستوں کے لئے جو کچھ بھی کر سکتے ہوں کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ایک بار
وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ اس کے کسی کام کے لئے ایک بڑے افسر سے ملنے گئے۔ افسر
نے اُن کی بڑی خاطر داری کی لیکن جب انھوں نے اپنے دوست کے کام کے بارے میں کہا
تو وہ بڑے افسر بولے۔

"کنور صاحب یہ بات میرے اصول کے خلاف ہے۔"

کنور صاحب نے جواب دیا۔

"آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے سو دوستوں کو اپنے ایک اصول پر قربان کر سکتے ہیں۔
میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے ایک دوست کی خاطر سو اصول قربان کر سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ واپس آگئے اور اپنے اس دوست سے معافی مانگی جسے وہ ساتھ
لے کر گئے تھے۔

اتنے برس ان کے ساتھ رہنے سے مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ انھوں نے اپنے دوستوں
کی خاطر اپنے کتنے اصول قربان کئے ہیں۔

آج اگر نریش کمار شاد زندہ ہوتا تو میری اس بات کا سب سے بڑا گواہ وہی ہوتا۔
اُس کی خاطر اُنھوں نے کیا کیا نہیں کیا تھا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں گوڑگانوں میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر تھا۔ فریدآباد

کے ایک گرلز اسکول میں ایک ڈرائنگ ماسٹر تھے اور اسی اسکول میں ان کی بیوی پنجابی پڑھاتی تھیں۔ ان دونوں نے اسکول کی پرنسپل کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ میں نے دو ایک بار ڈرائنگ ماسٹر کو سمجھایا بھی لیکن اس نے اپنا رویہ نہیں بدلا۔ چنانچہ میں نے خاوند کو دور ایک اسکول میں اور اس کی بیوی کو اتنے ہی فاصلے پر کسی دوسرے اسکول میں ٹرانسفر کر دیا۔ میری اطلاع یہ تھی کہ ان دونوں نے فرید آباد کے اسکول سے چارج دینے کے بعد نئے اسکولوں میں رپورٹ نہیں کیا تھا۔ اس بات کو قریب قریب ایک ماہ ہو گیا تھا۔ دفتر والوں نے ان دونوں کے خلاف ڈسپلنری کارروائی کرنے کے لئے فائیل مجھے بھیجی تھی جس پر دوسرے ارجنٹ کاموں کی وجہ سے میں کوئی ایکشن نہ لے سکا تھا۔

ایک صبح میں اپنے دفتر میں آیا ہی تھا کہ ڈرائنگ ماسٹر اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا اور میرے سامنے ایک بند لفافہ رکھ دیا۔ لفافے پر میرا ایڈریس لکھا تھا۔ ہینڈ رائٹنگ میں نے پہچان لیا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی کا خط تھا۔ میں نے لفافہ کھولا اور نہایت ہی مختصر خط پڑھا۔ لکھا تھا۔

یہ میاں بیوی اس وقت بڑی پریشانی میں ہیں۔ آنے والے جاڑے کے پیش نظر انہیں اکٹھا کر دیجئے اور ان کی دعائیں حاصل کیجئے۔

خط پڑھ کر میں مسکرا دیا۔

ڈرائنگ ماسٹر نے بڑی جرأت کر کے پوچھا

"کیا لکھا ہے سر۔"

"آپ کے فائدے کی بات ہے۔ آپ جائیے۔"

میں نے وہ فائیل جو دیر سے میرے پاس پینڈنگ پڑی تھی، فائیلوں کے ڈھیر سے نکالی اور میاں بیوی کو فرید آباد سے قریب ایک اسکول میں ٹرانسفر کے آرڈر جاری کر دیئے۔

اس کی بھی ایک بیک گراونڈ ہے۔

جب پروفیشنل ایجوکیشن سروس میں میری سلیکشن ہوئی تو مجھے بحیثیت سرکل سوشل ایجوکیشن

آفیسر کے روہتک میں جوائن کرنا تھا۔ بیدی صاحب شاید ان دنوں سنگرور میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ مجھے روہتک لے کر گئے اور وہاں کے ڈپٹی کمشنر سے ملوانے کے بعد میرے دفتر میں آگئے۔ جب میں جوئننگ رپورٹ دے چکا تو مجھ سے بولے

"ذاکر صاحب ایڈمنسٹریشن میں یہ آپ کی پہلی پوسٹنگ ہے۔ تین باتوں کا دھیان رکھنا۔

"فرمائیے عالی جاہ"

"جہاں تک ہوسکے اپنے کسی ماتحت کی شکایت اپنے سے سینئر افسر کو نہ کیجئے۔ اپنے ہی لیول پر سنبھالئے۔

کسی ماتحت کو چھٹی پر جانے سے نہ روکئے۔

اپنے کسی ماتحت کی کانفیڈنیشنل رپورٹ خراب نہ کیجئے۔

مجھے یہ بتاتے ہوئے بڑی تسکین ہورہی ہے کہ میں نے ان تینوں باتوں کو اپنی لگ بھگ پچیس سال کی ایڈمنسٹریشن سروس میں اپنے سامنے رکھا ہے۔ جہاں تک ہوسکا اپنے کولیگز کی مدد کی ہے۔ اُن کے ذاتی مسئلوں میں بھی اور اُن کے کیریر میں بھی۔

پھر شام کو میں ان کے ساتھ دہلی آگیا اور دیر تک چیمسفورڈ کلب میں ان کے ساتھ رہا اور ان کے شعر بھی سنتا رہا اور وسکی بھی پیتا رہا۔ چیمسفورڈ کلب ان کا دوسرا گھر ہے جہاں وہ شام کو ضرور آتے ہیں اور دیر تک وہاں رہتے ہیں۔ اُن کے ملنے والے جو دن بھر ان کا تعاقب کرتے رہتے ہیں، یہاں آکر اُنہیں گھیر لیتے ہیں۔

کنور مہندر سنگھ بیدی اور ان کے چھوٹے بھائی کنور سریندر سنگھ بیدی کو فلمیں بنانے کا شوق چرایا۔ اس نئے شوق کی بنیاد ڈالنے میں اوم پرکاش مزاحیہ ایکٹر کا ہاتھ تھا۔ نیا نیا شوق، شاعرانہ طبیعت، فلمی دنیا کی جگ مگ کنور صاحب فوراً مائل ہوگئے۔ پکچر پنجابی میں بنانے کا فیصلہ ہوا۔ کہانی کا انتخاب ہوگیا سینریو بھی مکمل ہوگیا۔ اب مجھ سے اصرار کررہے ہیں کہ میں بمبئی ان کے ساتھ چلوں اور سنیل دت کو فلم میں کام کرنے پر راضی کروں۔ میں نے ٹال مٹول کیا تو کہنے لگے۔

"تمہارا بھائی ہے۔ انکار کیسے کرے گا۔"

"یہ اس کے پروفیشن کا معاملہ ہے۔ میں نے کبھی اس میں دخل نہیں دیا۔"

"تو کہہ دو یہ بات تمہارے اصول کے خلاف ہے۔"

"یہ نہیں کہہ سکتا۔"

"تو چلو میرے ساتھ۔"

"اگر سنیل دت نے انکار کر دیا؟"

"تو کسی اور کو منا لیں گے، تم چلو تو سہی۔"

"اور میں اور کنور صاحب بمبئی پہونچ گئے۔ میرین ڈرائیو پر کسی بہت بڑی بلڈنگ میں ٹھہرے، جس کا نام اب مجھے یاد نہیں۔ اگلی صبح ٹیلی فون کر کے میں سنیل دت کے پاس پہونچا۔ پہلے تو وہ میرے اس کے پاس نہ ٹھہرنے پر ناراض ہوا اور پھر جب فلم میں کام کرنے کی بات چلی تو اس نے پنجابی فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔

"بیدی صاحب میرے دوست ہیں، مجھے اسی لئے ساتھ لائے ہیں۔"

"بھائی صاحب یہ میرے پروفیشن کا سوال ہے۔"

"اور میری دوستی کا۔"

"کہانی کس نے لکھی ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"آپ نے سنی ہے؟"

"پوری نہیں یوں ہی خاکہ سا یاد ہے۔"

"میری شرط یہ ہے کہ کہانی آپ دیکھیں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"تو بیدی صاحب سے بات کر لیتے ہیں۔"

"وہ آنے ہی والے ہیں ادھر۔"

اتنے میں بیدی صاحب آ گئے۔

یہ غالباً سنیل دت کی بیدی صاحب سے پہلی غیر رسمی ملاقات تھی۔ فلمی دنیا کی باتیں ہونے لگیں۔ بیدی صاحب نے بتایا کہ وہ بھی پنجابی میں ایک فلم بنانا چاہتے ہیں۔

"ذاکر صاحب نے بنا دیا ہے ؟"

"تو ہماری درخواست منظور ہے۔"

"ذاکر صاحب میرے بھائی ہیں اور آپ کے دوست۔ یہ دونوں رشتے بہت نازک ہیں۔ میں نے دراصل کسی بھی پنجابی فلم میں کام نہیں کیا اب تک۔"

بہت گفتگو نہیں ہوئی اس موضوع پر۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر بیچ بیچ میں پنجابی فلم کا بھی ذکر ہو جاتا۔ جب ہم سنیل دت سے اجازت لینے لگے تو اس نے کہا۔

"مجھے آپ کی آفر منظور ہے۔"

سنیل دت نے مسکرا کر بیدی صاحب کو گلے سے لگا لیا اور پھر مجھے اپنی باہنوں میں لیتے ہوئے بولا۔

"کوئی اور حکم بھائی صاحب؟"

دہلی واپس آکر بیدی صاحب سب کو فخر سے بتاتے رہے اگر ذاکر بمبئی نہ جاتا تو سنیل دت کبھی راضی نہ ہوتا اس پکچر میں کام کرنے کے لئے۔

اور پھر پکچر تیار ہونے کے مراحل طے ہونے لگے۔ اب بیدی صاحب کا اڈہ بمبئی میں جم گیا۔ کبھی کبھی کنور سریندر سنگھ بھی وہاں جاتے اور بیدی صاحب کی مسز بھی جاتیں۔ دونوں دیور بھابھی بہت بور ہوتے۔

پکچر مکمل ہو گئی۔

ٹیکس معاف کرانے کے لئے کچھ سرکاری قسم کے لوگوں کو پکچر دکھانا ضروری تھا۔ ایک رات کنور صاحب اور سریندر سنگھ بیدی میرے گھر آئے۔ بہت تلاش کے بعد پہونچے تھے میرے گھر۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی سریندر سنگھ بیدی بولے

"ذاکر صاحب، عالی جاہ ہیں تو میرے بڑے بھائی مگر کیا کہوں ان کے بارے میں

"کیا ہوا؟"

"آپ کے گھر کا نمبر تو انھیں یاد ہے لیکن سیکٹر یاد نہیں۔ دو گھنٹوں سے ٹکریں مار رہے ہیں۔ کبھی کار ایک سیکٹر میں گھماتے ہیں، کبھی دوسرے سیکٹر میں۔ اب یہ آخری سیکٹر تھا۔ موڑ پر پہونچے تو کہنے لگے اب پہونچ گئے ہیں ذاکر کے گھر۔

اس پر بیدی صاحب کا بھرپور قہقہہ اور پھر یہ سوال

"کچھ پینے کو ہے؟"

"پانی کے علاوہ سب کچھ ہے؟"

"پانی تو مُنہ ہاتھ دھونے کے لئے ہوتا ہے۔ پینے کے لئے تو اور بہت سی چیزیں ہیں۔"

پھر ہم پینے کی ایک آدھ چیز استعمال کرتے رہے اور فلم کی باتیں ہوتی رہیں۔

"کل صبح آٹھ بجے 'جگت' ٹاکیز میں آجائیے۔ "من جیتے جگ جیت" کا شو ہے، ٹیکس معافی کے لئے۔"

" اگلے روز ٹھیک آٹھ بجے میں 'جگت' ٹاکیز میں پہونچ گیا۔ بہت کم لوگوں مدعو تھے ۔ زیادہ تر لوگ پنجاب سرکار کے افسر ہی تھے۔ پکچر شروع ہونے سے پہلے کنور صاحب ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جب پکچر کے کرمی ڈینشیلز سکرین پر آنے لگے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرا نام لٹریری ایڈوائیزر کی حیثیت سے کرمی ڈینسیلز میں موجود تھا۔ اُسی لمحہ کنور صاحب نے میری پیٹھ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا

"فلم کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے۔"

اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنی گیلی آنکھوں کو پونچھ رہے تھے۔

لیکن کنور صاحب فلم کے آدمی نہیں ۔ تین چار فلمیں بنائیں اور نقصان اٹھایا۔ فلمی دنیا کے داؤ پیچ ان کے بس کی بات نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اب انھوں نے فلم بنانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔

ایک بار مشاعروں کا ذکر کرتے ہوئے کنور صاحب نے ایک واقعہ سُنایا۔ بہت پرُانا واقعہ ہے۔ ان دنوں میرا اُن سے تعارف نہیں تھا۔

الہ آباد کا واقعہ تھا۔

ڈی سی ایم کے خاندان میں کوئی شادی تھی۔ شادی کے موقعہ پر ایک مشاعرہ کا بھی اہتمام تھا۔ یہ ذمہ داری کنور صاحب کو سونپی گئی تھی۔ چنانچہ کنور صاحب شاعروں کے ٹولے کو لے کر الہ آباد پہونچ گئے۔ ہوٹل میں ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ سب شاعروں کو الگ الگ کمروں میں ٹھہرایا گیا تھا۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ سبھی شاعر کنور صاحب کے کمرے میں ہی جمع ہوتے تھے۔ چائے پر وہیں، ناشتہ پر بھی وہیں، شام کو بھی وہیں۔ ہوٹل کے بیرہ لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ سردارجی ہی شاعروں کے ٹولے کے لیڈر ہیں۔ شادی کی تقریب کئی روز تک چلی۔ شاعر ہوٹل میں کئی روز تک ٹھہرے۔

جس صبح شاعروں کی روانگی تھی اور شاعر ہوٹل سے باہر جا رہے تھے تو ہوٹل کا ہیڈ بیرہ دوڑتا ہوا کنور صاحب کے پیچھے پیچھے آیا۔

"کیا بات ہے؟" انھوں نے پوچھا

"حضور اپنا ایڈریس لکھ دیجئے۔" ہیڈ بیرے نے کاغذ پنسل آگے کر دیا۔

"ایڈریس کا کیا کروگے؟"

"کبھی شادی غمی کے موقعے پر آپ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

یہ واقعہ سُناتے ہوئے کنور صاحب خوب ہنسے۔

لیکن شادی غمی کے موقعوں پر کنور صاحب کو بلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ دوستوں کے خوشی اور غم کے لمحوں میں خود ہی ان کے پاس پہونچ جاتے ہیں اور برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔

مسوری میں ایک مشاعرہ تھا۔ مجھے کنور صاحب نے مسوری چلنے کے لئے خط لکھا۔ میں ان دنوں کچھ دفتری کاموں میں الجھا ہوا تھا۔ خط لکھا اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ نہ کوئی تقاضا ہُوا۔ میں ویسے بھی مشاعروں کا آدمی نہیں۔ کبھی کبھار ہی مشاعروں میں شرکت کرتا ہوں۔ سوچا کنور صاحب نے میری مجبوری کو سمجھ لیا ہوگا۔

کوئی دس بجے کے قریب کنور صاحب میرے دفتر پہونچ گئے ماچوتھی منزل پر۔ ساحر ہوشیار پوری بھی ساتھ تھے۔

"اب بھی مسوری چلنے سے انکار ہے؟"

"آپ بیٹھئے تو سہی"

"تم جلدی سے اٹھو، دفتر سے چھٹی لو۔ گھر چل کر جو سامان لینا ہے لو اور گاڑی میں بیٹھو"

"لیکن دہلی سے مسوری جانے کا یہ کون سا راستہ ہے؟"

"شاعروں کے شارٹ کٹ یہی ہوتے ہیں" ساحر نے جواب دیا

"آپ کے نخرے سہہ رہے ہیں حضور" وہ بولے

گھنٹہ بھر بعد ہم تینوں مسوری کی طرف روانہ ہو گئے۔ مسوری پہونچے تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ منتظمین میں سے کچھ لوگ جہاں کاریں پارک ہوتی ہیں، اس جگہ موجود تھے۔

"ہمارا ٹھہرنے کا انتظام کہاں ہے؟"

"ہیک مین میں کنور صاحب"

"ہم تو تین آدمی ہیں، ایک اور کمرے کا انتظام کیجئے"

"ساحر صاحب اور ذاکر صاحب کا انتظام دوسرے ہوٹل میں ہے"

"تو میرا انتظام بھی وہیں کرا دیجئے"

"دراصل آج ہیک مین میں مسوری کوئن کا فنکشن ہے۔ ایک کمرہ بھی بڑی مشکل سے ملا ہے"

"آپ ہم سب کا سامان وہیں بھجوا دیں۔ مشاعرے کے بعد دیکھ لیں گے"

اور ہم تینوں کا سامان ہوٹل کے اس کمرے میں پہونچا دیا گیا جو کنور صاحب کے لئے ریزرو تھا۔

مشاعرے کے بعد ہوٹل میں آئے تو مسوری کوین کا فنکشن زوروں پر تھا آدھی رات کب کی گزر چکی تھی اور ہم بھی ہال ہی میں بیٹھ گئے تھے۔

جب ہم ہوٹل کے کمرے میں لوٹ کر آئے تو کمرے کے ایک سنگل پلنگ پر بڑا نفیس بستر لگا تھا۔ بستر ایک تھا اور سونے والے تین تھے۔ صبح کے دو بجنے والے تھے نیند بھی بہت زوروں کی آ رہی تھی۔

"پلنگ پر آپ سو جائیے کیونکہ آپ عمر میں ہم تینوں سے چھوٹے ہیں" کنور صاحب فوراً بولے

"آپ سوئیے کیوں کہ آپ ہم سب میں سب سے بڑے ہیں"

"عالی جاہ، ذاکر کی یہ تجویز ٹھیک ہے"، ساحر نے میری تائید کی۔

"میں آپ دونوں کی سازش میں شریک نہیں ہو سکتا" یہ کہہ کر انھوں نے پلنگ پر بچھا بستر فرش پر پھینک دیا اور پلنگ اٹھا کر کمرے کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں عالی جاہ"

لمحہ بھر میں انھوں نے فرش پر پھینکا بستر پھیلا دیا اور اس پر پسر گئے۔

"آپ لوگ بھی اپنے اپنے بستر کھولئے اور سو جائیے"

ساحر اور میں نے اپنے اپنے بستر کھولے اور فرش پر بچھے قالین پر لگا دیئے۔ جب ہم نے کمرے کی روشنی بجھائی تو تین بج رہے تھے۔

کوئی سات بجے کے قریب بیرہ جب بیڈ ٹی لے کر آیا تھا تو ہمیں اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

یہ ہیں کنور صاحب کی شخصیت کے بنیادی پہلو جنہیں لوگ عالی جاہ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

مجھے کنور صاحب سے ایک شکایت بھی ہے۔

وہ جوش ملیح آبادی کے بہت ہی قریبی دوستوں اور مداحوں میں سے ہیں۔ میں نے ان کی دوستی کے کئی خوبصورت اور نازک پہلو بھی دیکھے ہیں۔ جب وہ پاکستان ہجرت نہیں کر گئے تھے جب بھی جب وہ پاکستان جانے کے بعد بھارت آئے تھے جب بھی۔

جوش صاحب نے ایک خوبصورت کتاب لکھی "یادوں کی برات"، کتاب بحث کا

موضوع بنی رہی دیر تک۔ بہرحال کتاب کے کئی بہت اچھے پہلو بھی ہیں۔

اب کنور صاحب کو بھی سوجھی کہ ایسی ہی کتاب وہ بھی لکھیں۔ چنانچہ اُنھوں نے بھی داغ دی ایک کتاب "یادوں کا جشن"۔ مجھے اُن سے شکایت ہے کہ وہ کتاب کا کوئی دوسرا عنوان بھی رکھ سکتے تھے۔ یہ عنوان تو جوش صاحب کی کتاب کا چربہ لگتا ہے۔ غنیمت ہے کہ کنور صاحب نے "میرے معاشقے" والا باب نہیں شامل کیا اِس میں۔

"خود میرے ساتھ ایک بار ایسا ہوا۔

میری ایک طویل کہانی تھی "دل کے دروازے مضبوط نہیں" محمد طفیل نے اُسے 'نقوش' میں بڑے دھڑلے سے چھاپا۔ کرشن چندر کو یہ کہانی بہت پسند تھی۔ اس نے کہانی کی بڑی تعریف کی۔ کچھ روز کے بعد معلوم ہوا کہ اُس نے ایک کتاب چھاپ دی تھی، عنوان تھا "دل کسی کا دوست نہیں" یار لوگوں نے کہا کہ کرشن نے میری کہانی سے یہ عنوان حاصل کیا ہے۔

بہرحال یہ میری ذاتی رائے ہے۔ کنور صاحب اسے نہیں مانیں گے، میں یہ بھی جانتا ہوں۔

ہماری دوستی کی ایک آخری بات سن لیجئے۔

میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ اپنے کسی ناول کا انتساب کنور صاحب نام کروں۔ پچھلے برس میں نے اپنا ناول "جانی ہوئی رُت" ان کے نام منسوب کیا تو بہت خوش ہوئے۔ سبھی دوستوں سے اس کا ذکر کرتے رہے اور جب اس پر ایوارڈ ملا تو بہت ہی خوش ہوئے۔ اور ایک شام صرف اسی ناول کے نام کر دی۔

جب میں نے چندی گڑھ میں انہیں اس ناول کی ایک کاپی پیش کی تو بولے "اب کونسا ناول لکھ رہے ہو؟

"سمندر، صلیب اور وہ، عالی جاہ!"

"یار تمہاری، کتابوں کے عنوان بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔

میں جواب میں مسکرا دیا۔ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

اور پھر انھوں نے ناول کے پہلے صفحے پر چھپے اپنے نام کو پڑھا اور مجھے سینے سے لگا لیا۔

کنور صاحب نے ناول کے پہلے صفحے پر چھپے اپنے ہی نام کو پڑھا تھا۔ ناول کا ایک بھی صفحہ نہیں پڑھا انھوں نے۔ کیونکہ وہ تو اسی روز ان سے کوئی لے گیا تھا۔ اور انھیں یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کون تھا۔ میں نے بھی یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ناول کی دوسری کاپی انہیں ہرگز نہیں دوں گا۔ جب تک کہ وہ آئندہ کے لئے اپنے آپ کو سدھاریں گے نہیں۔

سیّد شریف الحسن نقوی

کنور مہندر سنگھ بیدی کی انتظامی صلاحیتیں

کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب آزادیٔ وطن سے لگ بھگ تیرہ سال قبل، ان دنوں سرکاری ملازمت میں آئے جب ملک پر غیر ملکی حکمرانوں کا تسلط تھا اور قومی رہنما اس تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ یہ جولائی ۱۹۳۴ء کی بات ہے جب انھوں نے لائل پور میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا عہدہ سنبھالا۔

کنور صاحب تقریباً ۳۴ سال سرکاری ملازمت میں رہے اور آزادیٔ وطن کے بعد بھی بیس اکیس سال ذمہ دارانہ خدمات انجام دیں۔ گویا دو ایسے زمانے ان کے دورانِ ملازمت میں آئے جن کے تقاضے ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے لیکن ان دونوں مختلف المزاج ادوار میں ان کے جن اوصاف نے عوام و خواص دونوں میں محبوب و محترم رکھا، وہ تھے اُن کی خاندانی شرافت و وجاہت، ایمانداری، فرض شناسی، انصاف پسندی، راست گوئی، مستعدی اور ساتھ ہی ساتھ معاملہ فہمی اور انتظامی صلاحیت۔

کنور صاحب رئیس ابن رئیس ہیں۔ ملازمت ان کے لئے حصولِ معاش کا

ذریعہ نہیں تھی "یادوں کا جشن"، میں جو ان کی خود نوشت سوانح عمری ہے، اپنے پہلے تقرری پر یادیں تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب میں اپنی پہلی تقرری پر حاضر ہونے کے لئے لائل پور جانے لگا تو علاقے کے ہزاروں لوگ مجھے دعائیں دے کر رخصت کرنے آئے - اچھا خاصا میلہ لگ گیا۔ دو تین دن تک جشن ہوتے رہے - میرے آرام کے لئے گائے، بھینس، گھوڑی، کار، ملازم ــــ سب کا بڑی احتیاط سے اہتمام کیا گیا۔"

اس تام جھام کے ساتھ کنور صاحب لائل پور وارد ہوئے لیکن جب عہدے کا چارج لینے ضلع کچہری پہونچے اور لائل پور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر اے۔ایس۔ گِل سے ملے تو وہ بڑے تحکمانہ انداز میں پیش آئے جو فطری طور پر کنور صاحب کے لئے ناگواری اور تکدّر کا باعث بنا لیکن مسٹر گِل کی بے رخی کی تلافی سپرنٹنڈنٹ ملک آسانند کے پرتپاک روئے نے کر دی، جن سے کنور صاحب کو چارج لینا تھا۔ چارج لینے کے بعد ان کی جو ذہنی کیفیت ہوئی اس کا اظہار انھوں نے ان لفظوں میں کیا ہے:

"چارج لے کر اس کمرے میں گیا جو میری عدالت کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ وہاں میرا عملہ یعنی ایک پیشکار، ایک اہلمد اور ایک چپراسی میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور ڈائس پر چڑھا۔ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میں ذرا جذباتی سا ہو گیا۔۔ میرے ایک پیشکار، ایک مولوی نما بزرگ تھے میں نے ان سے گذارش کی کہ آپ میرے لئے پہلے دعا کیجئے کہ میں اس کرسی پر بیٹھ کر حق و انصاف کا نام اونچا کروں۔"

آگے چل کر رقم طراز ہیں:

"میں اپنے معبود کو حاضر و ناظر جان کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی

عدالتی زندگی میں جان بوجھ کر کبھی کسی سے ناانصافی نہیں کی۔ سہواً اگر کوئی
غلطی ہو گئی ہو تو ہو گئی ہو ۔ ۔ ۔ سائل بھی اس بات کو جانتے تھے اور ان کی
کوشش یہ ہوا کرتی تھی کہ ان کا مقدمہ میری عدالت میں منتقل ہو جائے"۔

ان کے اس بیان کی وہ سبھی لوگ تائید کریں گے جو کنور صاحب سے ذاتی طور پر واقف ہیں یا جنھوں نے دوسروں سے ان کے بارے میں کچھ سن رکھا ہے۔ میں ان لوگوں میں ہوں جنھیں ان سے ذاتی تعارف کا شرف بھی حاصل ہے اور جنھوں نے دوسروں کی زبان سے ان کے اوصاف حسنہ کا بیان سُنا ہے۔ کنور صاحب کو لوگوں کا کس قدر اعتماد حاصل تھا، اس ضمن میں مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے جو لطف سے خالی نہیں ہے۔ اس واقعے کے راوی جناب مخمور سعیدی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ایک روز کنور صاحب آصف علی روڈ، نئی دہلی کے اپنے کمرۂ ملاقات میں بیٹھے تھے۔ اور ملاقاتیوں سے بات چیت کر رہے تھے کہ ایک باریش بزرگ کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ کنور صاحب سے تخلیئے میں کچھ کہنا چاہتے تھے۔ کنور صاحب اٹھ کر ان کے ساتھ کمرے سے باہر گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد دونوں اندر آئے اور کنور صاحب نے ٹیلی فون آپریٹر سے دِلّی کے ڈپٹی کمشنر کا فون ملانے کو کہا۔ ابھی فون ملا بھی نہیں تھا کہ ایک اور بزرگ ایک نوجوان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور جب دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو دونوں کے چہروں کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ نوجوان کچھ سہما سہما سا تھا۔ نووارد بزرگ نے بھی کنور صاحب سے علیحدگی میں بات کرنی چاہی۔ کنور صاحب نے ان سے بھی باہر جا کر بات کی اور جب وہ ان کے ساتھ دوبارہ کمرے میں آئے تو ان کا چہرہ متبسم تھا۔ انھوں نے ٹیلی فون اپریٹر سے کہا کہ ابھی ڈپٹی کمشنر کا فون نہ ملایئے اور ان دونوں بزرگوں سے کہا کہ آپس میں مصافحہ بھی کیجئے اور معانقہ بھی۔ تھوڑے پس و پیش کے بعد دونوں بغل گیر ہو گئے اور گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

معاملہ یہ تھا کہ پہلے جو بزرگ وارد ہوئے تھے اُن کی صاحب زادی کو دوسرے بزرگ کے صاحب زادے جو سہمے سہمے ان کے ساتھ آئے تھے، بھگا لائے تھے اور والدین

کے علم و اجازت کے بغیر دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک بھی ہو گئے تھے۔ بزرگ اوّل بھی فریاد لے کر کنور صاحب کی خدمت میں آئے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے اس رشتے کو جوان کی نظر میں ناجائز تھا، منسخ کرادیں اور ان کی بیٹی ان کے حوالے کر دی جائے۔ بزرگ دوم نے بھی دادرسی کے لئے کہیں اور جانے کے بجائے کنور صاحب ہی کی "عدالت" کا رُخ کیا حالاں کہ وہ اب کسی عدالتی یا انتظامی منصب پر نہیں تھے۔ ان کا فیصلہ دوٹوک تھا۔ فرمایا جو ہونا تھا، وہ ہو چکا، بہتر ہے کہ فریقین صلح کر لیں۔ اور آخر کار انھوں نے صلح کرادی۔

کنور صاحب کی غیر معمولی ہر دل عزیزی کا ایک سبب ان کے وہ ثقافتی مشاغل بھی رہے، جنھیں بعض کوتاہ بین لوگ "کارے باکاران" سمجھتے ہیں۔ جن دنوں دوسری جنگِ عظیم پورے زور پر تھی، کنور صاحب کو نیشنل وار فرنٹ کے محکمے کا چارج دے کر دِلّی لایا گیا۔ اس محکمے کا مقصد جنگ کے حق میں ہندوستانی رائے عامہ کو ہموار کرنا تھا اور چوں کہ کانگریس اس تائید و حمایت کی مخالف تھی، اس لئے یہ بہت مشکل اور آزمائش میں ڈالنے والی ذمہ داری تھی، جو کنور صاحب کو سونپی گئی۔ خود کنور صاحب بھی اپنے دل میں قومی تحریک کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ لیکن پھر بھی انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کی اور کامیابی کے ساتھ اس سے عہدہ برآ بھی ہوئے۔ اس سلسلے میں ان کا انداز فکر کیا تھا، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے "یادوں کا جشن" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں سرکاری ملازم ضرور تھا، مگر میری ہمدردی انھیں کے ساتھ تھی جو ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ البتہ میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ جنگ جیتنے پر ممکن ہی نہیں، اغلب ہے کہ انگریز ہندوستان کو آزاد کر دیں گے۔"

بہر کیف کنور صاحب نے نیشنل وار فرنٹ کا محکمہ سنبھالا اور اس کا مقصد اولین یہ قرار دیا کہ راجدھانی میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور خیر سگالی کی فضا پیدا کی جائے۔

اس کے لئے انھیں مختلف سیاسی جماعتوں اور سربرآوردہ شہریوں کا تعاون حاصل کرنا تھا۔ کنور صاحب لکھتے ہیں کہ اس مرحلے پر ان کی اردو زبان سے دلچسپی اور ان کا ذوقِ شاعری ان کے کام آیا۔ انھوں نے مشاعروں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا شروع کیا اور اس طرح جلد ہی دِلّی کے عوام اور خواص میں، جن کے لئے وہ بڑی حد تک اجنبی تھے، شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی اور اس طرح وہ اپنے فرضِ منصبی کو بخوبی پورا کر سکے۔

دوسری جنگِ عظیم ختم ہوئی اور اس کے کچھ مدت بعد ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے واقعی آزاد ہو گیا لیکن آزادی کا ایک نتیجہ ملک کی تقسیم کی صورت میں سامنے آیا۔ تقسیم کے ساتھ کشت و خون کا بازار بھی گرم ہوا۔ کنور صاحب کو دوبارہ سٹی مجسٹریٹ کے عہدہ پر دِلّی لایا گیا۔ سیاسی رہنماؤں اور اعلیٰ افسران کے سامنے کنور صاحب نے امن کی بحالی کے لئے جو تجاویز سامنے رکھیں، انھیں سردار پٹیل نے فوراً منظور کر لیا۔ یہ ان کی جانفشانی اور نیک نیتی کا نتیجہ تھا کہ خنجر زنی کی وارداتیں ختم ہو گئیں اور شہر میں امن بحال ہو گیا۔ ان کا یقین کامل ہے کہ مشاعروں اور دیگر تفریحی اجتماعوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تخریب کاری کے بجائے میل و محبّت کے جذبات کو دل میں جگہ دیتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے ان تفریحی مشاغل کو فروغ دیا۔ سردار پٹیل تک شکایت پہونچی مگر بالآخر وہ بھی خیر سگالی کے اس طریقے کے قائل ہو گئے! ۔ اور انھیں ایک فرض شناس، مستعد، معاملہ فہم اور غیر جانبدار افسر قرار دیا گیا۔

کنور صاحب کا عقیدہ ہے کہ اگر لوگ تفریحی مشاغل میں مصروف رہیں تو وہ تخریبی کاموں سے دور رہتے ہیں۔ چنانچہ اُس پُر آشوب دور میں جب لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے کنور صاحب نے مشاعروں کا، مرغوں، تیتروں کی پالیوں کا اور مینڈھوں کو لڑانے کا اہتمام خود اپنی کوٹھی پر کیا۔ خود ان کے الفاظ میں: "مقصد دراصل یہ تھا کہ ہندو مسلم سکھ، عیسائی

سبھی مذاہب کے لوگ پھر سے ایک جگہ اکٹھے ہوں تفریح کریں تاکہ فرقہ وارانہ فسادات نے جو گہرے گھاؤ لگائے تھے، مندمل ہوں۔"

کنور صاحب نے جس وقت یہ تدابیر اختیار کیں ملک ایک ہنگامی دور سے گذر رہا تھا اور فضا بارود کی طرح اشتعال پذیر تھی، ایسی فضا میں بھی یہ تدابیر موثر ثابت ہوئیں۔ ایک طرف عام شہریوں پر ان کی کوششوں کے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے اور ان میں احساس شہریت بیدار ہوا، دوسری طرف حکامِ بالا نے بھی ان کی حکمت عملی کا لوہا مانا۔ اب فضا بالکل بدل چکی ہے پھر بھی اس سلسلے کے تمام واقعات جن کا بیان "یادوں کا جشن" میں آیا ہے، اس لائق ہیں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو اور ہمارا آج کا انتظامیہ چشمِ بصیرت واکر کے ان کا مطالعہ کرے۔

یوسف ناظم

کنور مہندر سنگھ بیدی ایک فاصلے سے

حیدر آباد میں زندہ دلانِ حیدر آباد کی سالانہ کانفرنسوں اور مشاعروں کا باقاعدہ سلسلہ ۱۹۶۵ء سے شروع ہوا دوسری سالانہ کانفرنس کی صدارت راجندر سنگھ بیدی کے ذمے تھی اور مشاعرے کے سربراہ تھے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ــــ بس اسی کانفرنس کے موقعہ پر میری پہلی تفصیلی ملاقات کنور صاحب سے ہوئی ورنہ اس سے پہلے بھی سُرسنگار کے مشاعروں کے سلسلے میں بمبئی میں ان سے نیاز حاصل ہو چکا تھا لیکن مشاعرے کی ملاقات کو ملاقات کہنا ایسا ہی ہے جیسے ٹماٹر کو پھل کہنا۔ مشاعروں میں لوگ ایک دوسرے سے ملتے ضرور ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر بکثرت مسکراتے ہیں۔ اپنے کھانے کے دانت دکھاتے ہیں۔ ہیلو اور ہائے بھی کہتے ہیں۔ شانہ بشانہ چلتے اور زانو بہ زانو بیٹھتے بھی ہیں لیکن ملاقات نہیں کرتے ــــ کنور مہندر سنگھ بیدی، جلسوں اور مشاعروں کے لازمی مضمون ہیں ــــ ہندوستان کے کسی بھی شہر میں کوئی مشاعرہ ہونے دیجئے اس کی روئیداد میں کنور صاحب کا نام ضرور ہوگا ــــ اس کی کیا وجہ ہے۔ اس نکتے پر میں نے پہلے مزاحیہ انداز میں اور بعد میں سنجیدگی سے غور کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا آدمی کسی مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرے تو اس کا منطقی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہ خود کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ جاتا ہے، کہ مشاعرہ کس طرح

"روبعمل" لایا جاتا ہے اور کس طرح نیچے سے اوپر اور اوپر سے مزید اوپر پہنچایا جاتا ہے یہ گر دوسرے لوگ بھی جانتے ہوں گے لیکن اس معاملے میں کنور صاحب 'گرو' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے داؤ پیچ میں وہ داؤ شامل ہے جسے ڈیتھ لاک کہا جاتا ہے لیکن ان کا "ڈیتھ لاک" مشاعرے اور سامعین کے لئے کے لئے جان لیوا نہیں جاں فزا ہوتا ہے ــــ مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو سنھام لے ساقی کا گر، کنور صاحب جانتے ہیں اور ۱۹۶۶ء میں پُر بہار تھے۔ آواز میں کھنک تھی۔ خوش لباس تو ماشاء اللہ وہ اب بھی ہیں لیکن آج سے ۲۰ سال پہلے کی بات ہی اور تھی۔ میں تو سمجھتا ہوں شملہ باندھنے کے معاملے میں کنور صاحب حرفِ آخر ہیں۔ اتنا مسجع و قعقاشملہ ــ کیا مجال اس میں کوئی سکنہ آجائے۔ مہندر سنگھ بیدی کو بیسیوں شعر یاد ہیں اور چالیسیوں لطیفے از بر ہیں۔ لطیفے وہ گڑھتے بھی ہیں۔ برمحل۔ سامعین ان سے بے حد خوش رہتے ہیں خواہ مشاعرے سے وہ کتنے ہی ناراض کیوں نہ ہوں۔ کچھ سامعین تو انتظار میں رہتے ہیں کہ شاعر اپنا کلام ختم کرے تو کنور صاحب کا کمال دیکھیں ــــ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کنور صاحب صرف مشاعرہ سنبھالتے ہیں۔ عنانِ مشاعرہ ضرور ان کے ہاتھ میں رہتی ہے لیکن وہ خود بھی شعر کہتے ہیں اور مشاعرے میں جب اپنا کلام سناتے ہیں بافراط داد حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے حافظے کی حفاظت میں ایسا معلوم ہوتا ہے سیروں بادام اور پستے خرچ کئے ہیں۔ طویل سے طویل نظم انھیں زبانی نہیں مُنہ زبانی یاد رہتی ہے۔ اب اس وقت کا حال تو مجھے نہیں معلوم لیکن حیدر آباد کے جس مشاعرے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت شہ نشین ہی پر ان کے لئے مشروب کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا کہ عین مشاعرے میں جب سوز و گداز آگیا تو ایک کشتی میں دو چائے کی پیالیاں اور ایک کیتلی ان کی خدمت میں پیش کی گئی لیکن اس کیتلی میں چائے نہیں تھی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے جب ایک پیالی میں یہ مشروب منتقل کر کے راجندر سنگھ بیدی کو پیش کیا تو بیدی صاحب نے کہا میں رات میں چائے نہیں پیتا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی بولے میں آپ کو چائے کب پلا رہا ہوں۔ تب تک مہک راجندر سنگھ بیدی کے نتھنوں میں اور بھنک شہ نشین پر بیٹھے ہوئے شاعروں کے کانوں میں پہنچ چکی تھی بلکہ سامعین کی طرف سے بھی استفسار کیا گیا تھا کہ

کیتلی سے آپ کیا پی رہے ہیں اور غالباً کنور صاحب نے جواباً عرض کیا تھا کہ تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو۔ اب یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا تو ایک شعر وارد ہو گیا۔

ظرف جو ہاتھ میں آیا وہی پیمانہ بنا　　　جس جگہ بیٹھ گئے ہم وہیں میخانہ بنا

اگر مشاعرے میں مذکورہ بالا انتظام نہ کیا گیا ہوتا تو کنور صاحب حسب دستور، باقی کا نصف بہتر مشاعرہ کسی اور کے سپرد کر کے "حسبِ دستور" چلے گئے ہوتے۔ رات میں ساڑھے تین گھنٹے تک وہ خشک حالت میں کبھی نہیں بیٹھ سکتے اور خاص طور پر اس وقت جب ان کے کاندھوں پر گرتے شاعروں اور گرتے مصرعوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری ہو۔

ایک مرتبہ ناندیڑ میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ ناندیڑ کی میونسپل کارپوریشن کی طرف سے مشاعرہ تھا۔ حیدرآباد سے شاذ تمکنت (مرحوم) بھی آئے ہوئے تھے۔ بمبئی سے، میں، عزیز قیسی، حسن کمال اور مینا قاضی۔ مشاعرے سے پہلے کنور صاحب نے سب شاعروں کو ناندیڑ کے گوردوارے میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے طلب کیا تھا۔ کوئی دس بارہ شاعر موجود تھے ہم سب کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ سب کے سروں پر صافے باندھے گئے۔ کچھ تحفے بھی عطا ہوئے۔ بڑا روح پرور سماں تھا۔ ناندیڑ کا گوردوارہ، ہندوستان کا سب سے بڑا گوردوارہ ہے۔ میں تو چونکہ مرہٹواڑہ ہی کا رہنے والا ہوں اس لئے اس سے پہلے بھی کئی وقت یہاں آچکا تھا لیکن جن لوگوں کو پہلی مرتبہ (اور وہ بھی اس شان سے) یہاں آنے کا موقعہ ملا ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس ملاقات میں کنور مہندر سنگھ کا الگ ہی روپ سامنے آیا جو غالباً ان کا اصلی روپ ہے۔ وہ بھگتی کے آدمی ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے لوگوں کے رکے ہوئے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کبھی ہچکچاہٹ یا تامل سے کام نہیں لیا۔ کسی ایک یا دو سے نہیں میں نے کتنوں سے یہ بات سُنی ہے کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سفارش کے معاملے میں کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ جوشؔ جب تک ہندوستان میں رہے یہی کرتے رہے۔ ان کا مشغلہ بس اتنا ہی تھا کہ جہاں جہاں تک بھی ان کی رسائی تھی وہاں وہ پہنچ جاتے اور کسی نہ کسی کا کام کروا کے لوٹتے اور لوگ جانتے ہیں کہ ان کی رسائی کہاں کہاں نہیں تھی۔ لیکن ان کے ساتھ گڑبڑ یہ تھی کہ انھیں یاد نہیں رہتا تھا کہ کس معاملے میں وہ کس کی

سفارش پہلے کرچکے ہیں اور وہ ایک ہی 'ممنوعہ جائداد' کے لئے دو دو آدمیوں کی سفارش فرمادیا کرتے تھے۔ شکر ہے کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا حافظہ 'جوش ملیح آبادی کے حافظے سے بہتر ہے۔ (یہ میرا خیال ہے خدا کرے حسبِ معمول ناقص نہ ہو)۔

زندہ دلانِ حیدرآباد سے اُنھیں بڑا شغف ہے جو ایک لحاظ سے معاشقے کی صورت اختیار کرچکا ہے۔ وہ مصطفیٰ کمال ہوں یا مجتبیٰ حسین۔ مصطفیٰ علی بیگ ہوں یا بوگس۔ ان کا عشق 'نیاگرا آبشار کی طرح جاری وساری رہتا ہے۔ جس طریقے سے وہ ان لوگوں سے گلے ملتے ہیں اگر اس کی تصویر کھینچی جائے تو ہمارا سنسر بورڈ یقیناً اس تصویر کی نمائش کو ممنوع قرار دے گا۔ حیدرآباد میں پچھلے سال یعنی ۱۹۸۵ء میں عالمی مزاح کانفرنس ہوئی۔ کنور مہندر سنگھ کچھ کچھ علیل تھے یا مضمحل تھے لیکن بہرحال حیدرآباد آئے۔ اس سال جو مشاعرہ ہوا وہ اردو اور ہندی کا مشترکہ مشاعرہ تھا۔ آندھرا پردیش کے گورنر شنکر دیال شرما نے صدارت کی اور اردو حصّے کی نظامت کنور صاحب نے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا مشاعرہ تھا جس کے دو نظما تھے۔ ایک ہندی کے لئے اور ایک اردو کے لئے۔ مجھے تو یہ مشاعرہ اچھّا ٹورنامنٹ معلوم ہوا۔ جب بھی کنور مہندر سنگھ بیدی کی ٹیم حملے میں یا دفاع میں کمزور پڑتی، کنور صاحب کے جملے ان کی ہمت بندھاتے ـــ لیکن سچ پوچھئے تو خود کنور صاحب کی وہ زندہ دلی تو برقرار ہے لیکن وہ "چہل" اب باقی نہیں ہے جو انہیں "ذاتِ بزرگ" بناتی تھی۔ اب وہ صرف بزرگ ہیں۔ ورنہ انہی بیدی صاحب کو میں نے سرسنگار کے مشاعروں کی نظامت کرتے اس عالم میں دیکھا ہے کہ جب بھی وہ کسی شاعرہ کا تعارف کرنے کھڑے ہوتے تو ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھتے اور اِن کی "ممدوحہ" لٹ کر رہ جاتیں۔

ایک شاعر یا ایک عدد مشاعرہ کو زمین سے خلا میں اور خلا سے آسمان تک پہنچانا کنور صاحب کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کی ہمہ جہتی دلچسپیوں اور کثیر الاصلاع مصروفیات کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب آج سے کئی سال پہلے میں نے اخباروں میں ان کا نام پہلوانی کے مقابلے کے "ممتحن" کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ پہلوانی کے مقابلے کے ممتحن بننے کا شوق انھیں کیوں ہوا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ گھر میں تو انھوں نے اس کی اطلاع دی نہیں ہوگی اور دوست

احباب انھیں روک نہیں سکے ہوں گے ــــ یہ مقابلہ "ہند کیسری" کا مقابلہ تھا اور غالباً چندی گڑھ میں منعقد ہوا تھا۔ دو پہلوانوں کے بیچ عین میدان کارزار میں کھڑے ہونا اور پھر فتح و شکست، کا فیصلہ کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا ــــ ہند کیسری کا خطاب اصل میں ممتحن ہی کو ملنا چاہیئے تھا جان تو اس کی عذاب میں رہتی ہے۔ یہ کام کنور صاحب نے شاید پہلی اور آخری مرتبہ انجام دیا تھا۔ اس سلسلے میں، ان کا نام دوبارہ پڑھنے کو نہیں ملا۔

زندگی کے پچھتر سال اس بات کے لئے بہت کافی ہوتے ہیں کہ آدمی اپنے گرد مخالفین اور دشمنوں کی ایک فوج کھڑی کرلے لیکن کنور مہندر سنگھ بیدی زندگی گزارنے کا فن جانتے ہیں۔ خواہ مخواہ کی دشمنی کی بات اور ہے اور اس کا علاج ممکن نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کنور صاحب کی گرہ میں ہر قسم کا مال موجود رہتا ہے۔ وہ مخدوم محی الدین کی شہرہ آفاق نظم "چاند تاروں کا بن" کے وہ چارہ گر نہیں ہیں جس سے پوچھنا پڑے کے تیری زنبیل میں فلاں نسخہ موجود ہے یا نہیں ـــــ ان کے یہاں ہر قسم کے نسخے بکھرے پڑے ہیں۔

ادھر کئی سالوں سے انھوں نے بمبئی آنا ترک کر دیا۔ اصل میں بمبئی شہر اب کلچرل سے زیادہ پولی ٹیکل شہر ہو گیا ہے۔ مشاعرے یہاں کم ہونے لگے ہیں اور شاید کنور صاحب نے بھی اپنے بھارت درشن کا سلسلہ منقطع کر دیا ہے۔ بہر حال میرا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا وہ اتفاق سے پچھلے دو تین سالوں میں مجھے ہی دلی جانے کا برابر موقع مل گیا اور ہر بار کنور صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ سرسری ہی سہی لیکن کبھی کبھی شبنم بھی پیاس بجھانے کے لئے کافی ہوتی ہے (آدمی کو قناعت پسند ہونا چاہیئے)۔ اب بھی وہ راست قد ہیں۔ ان کے اخلاق حمیدہ نے انھیں کمر خمیدہ نہیں ہونے دیا۔ وہ سب سے جھک کر ملتے ہیں لیکن اتنے نہیں جھکتے کہ جھک ہی جائیں۔ انھیں ہشاش بشاش دیکھ کر کون ہوگا جو اپنے اندر بجلی کا کرنٹ دوڑتا محسوس نہ کرے ــــ یہ کرنٹ اے سی، ڈی سی نہیں ہوتا۔ جے سی ہوتا ہے۔ یعنی جوائے کرنٹ۔

میں نے انہیں قریب سے نہیں دیکھا لیکن عجیب بات ہے کہ کبھی بھی محسوس نہیں ہوا۔

وہ کیوں اس قدر" اپنے "معلوم ہوتے ہیں میں نے اس پر غور بھی نہیں کیا۔ یہ میں نے البتہ دیکھا ہے کہ لوگ اِن کے پاس کھنچے چلے جاتے ہیں۔ ان کے پاس جو کچّا دھاگا ہے وہ اصل میں اس خام مال سے بنا ہوا ہے جس سے بنگلور سلک کی ساڑیاں بنتی ہیں۔

ایک مرتبہ یہ خبر بھی اُڑی تھی کہ کنور مہندر سنگھ بیدی، بمبئی میں ایک فلم بنا رہے ہیں۔ پتہ نہیں یہ خبر، خبر تھی یا افواہ۔ بڑے شہروں میں چونکہ گنجائش زیادہ ہوتی ہے اس لئے افواہوں کے پھلنے پھولنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ انھوں نے بمبئی آنا ترک کر دیا ایک لحاظ سے فائدے میں رہے۔ دلی میں نیکیاں کر کے انھیں دریا میں ڈالنے کی سہولت حاصل نہیں ہے۔ سب نیکیاں محفوظ رہتی ہیں اور ان کا اندراج اس جگہ ہوتا رہتا ہے جہاں کتابت وطباعت کی غلطیوں کا امکان نہیں ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن اس ملک میں لاکھوں لوگ ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن ان کی اپنی زبان اردو ہے۔ کنور صاحب انہی لاکھوں میں سے ایک ہیں بلکہ لاکھوں میں ایک ہیں۔ (آپ کا جی چاہے تو اسے مبالغہ سمجھ لیجئے)۔

میں چاہوں گا کہ اکیسویں صدی کا جو بھی پہلا مشاعرہ ہو اس کی نظامت کنور مہندر سنگھ بیدی کریں۔ اور میں بھی اس میں بحیثیت شاعر شریک رہوں۔

ظفر پیامی
(دیوان بیرندر ناتھ)

ذکر ایک مکمّل انسان کا

نئی دہلی - جنوری ۱۹۴۸ء —— گاندھی جی کی شہادت سے چند روز پہلے کی ایک صبح کا ذکر ہے - امریکی لائف میگزین کی عالمی شہرت کی نامہ نگار فوٹو گرافر مارگریٹ بروک وائیٹ، میری پہلی "باس" اور گرو نے مجھے بتایا —"آج تمہارے راشٹر پتا کے ساتھ میری ڈرائی ڈیٹ، DRY DATE ہے اور تم بھی چلو گے میرے ساتھ - پیارے بڈھے کی شوٹنگ کے لئے" یہ "شوٹنگ" کئی گھنٹے چلتی رہی - لوگ آتے رہے، جاتے رہے - گاندھی جی کی باتیں سنتے رہے، باتیں کرتے رہے اور مارگریٹ تصویریں بناتی رہی - اتنے میں کئی معزز مگر تباہ حال مسلمانوں کا ایک وفد آیا - انھوں نے رو رو کر اپنی بپتا سُنائی - اسی دوران ایک نام "بیدی صاحب، مجسٹریٹ" بار بار سننے میں آیا مگر یہ پتہ نہیں چلا کہ کس سلسلہ میں ان کا ذِکر ہوا ——

کچھ دیر بعد گاندھی جی اور مارگریٹ کی بات چیت شروع ہوئی - باپو نے حسبِ معمول پیار سے مارگریٹ کو "شیطان کی بیٹی" کہہ کر پُکارا - اور اُس نے اُسی پیار بھری مناسبت سے گاندھی جی کو "میرے شیطان باپ" کہہ کر مخاطب کیا۔

اُس وقت ایک سولہ سالہ نوجوان، اخبار نویسی کے صرف خواب دیکھتا ہوا، بنیادی

طور پر صرف کیمرہ بردار گویا "صحافتی چلم بردار تھا۔ مارگریٹ کے کئی کیمرے ٹھیک جگہ پر لگاتے، ٹیپ ریکارڈز درست کرتے ہوئے، یہ تمام چھلیں اور سنجیدہ بات چیت سنتا رہا مارگریٹ نے دہلی اور مشرقی پنجاب کے فسادات سے متعلق ایک آنکھوں دیکھی شکایت کی کہ سکھوں نے مسلمانوں پر زبردست مظالم توڑے ہیں۔ گاندھی جی نے کہا — "مظالم تو وہ شیطان انسانوں پر توڑتے ہیں جو نہ سکھ ہیں۔ نہ ہندو اور نہ مسلمان۔ صرف حیوان ہیں"۔ پھر وہ چپ ہو گئے چند لمحوں بعد بولے — "ابھی ابھی کچھ مسلمان میرے پاس آئے تھے اپنی دکھ بھری کہانی لے کر۔ انہیں کئی مسلمان افسروں سے سخت شکایتیں ہیں کہ وہ ہندوؤں کی چاپلوسی کے لئے مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں مگر وہ بار بار ایک سکھ افسر کی تعریف کر رہے تھے — ایک نوجوان سکھ مجسٹریٹ جو جان پر کھیل کر بھی مسلمانوں کو بچاتا رہا — سو۔ شیطان کی بیٹی — سکھ ظالم نہیں ہوتے۔ صرف شیطان ظالم ہوتے ہیں"۔ گاندھی جی اپنے پوپلے سے منہ سے اتنی پیاری سی ہنسی ہنس دیئے۔ یہ انٹرویو بعد میں امریکی نیشنل براڈ کاسٹنگ کارپوریشن سے نشر ہوا اور غالباً لائف میگزین میں بھی شائع ہوا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی کا نام میں نے اس طرح پہلی بار سُنا۔ شعر کا سحر جگانے والے شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ شیطان کا جنوں توڑنے والے سرکاری افسر کی حیثیت سے۔

برسوں بعد الٰہ آباد یونی ورسٹی میں ایم، اے کرنے پہونچا۔ قبلہ فراقؔ گورکھپوری نے ایک دن ایک خصوصی سیمنار کلاس کے دوران بائرن کی ہمہ گیر شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا — "کنور مہندر سنگھ بیدی کو جانتے ہو؟" میں نے جواب دیا — "نام سُنا ہے۔ ذاتی واقفیت نہیں"۔ بولے "بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ افسر ہیں اور اچھے آدمی"۔ سیمنار یورپ کی رومانی تحریک کے بجائے کنور صاحب پر صرف ہو گیا۔ فراقؔ صاحب دو ہی روز قبل دہلی کے ایک مشاعرے سے لوٹے تھے۔ کنور صاحب کے بارے میں بہت کچھ بتاتے رہے خصوصاً کشتیوں (فری اسٹائیل ونگل پہلی بار ہندوستان میں ہو رہے تھے) میں کنور صاحب کی دلچسپی نے فراقؔ صاحب کو خاصا

متاثر — بلکہ محظوظ کیا تھا۔ کنور صاحب سے متعلق ان کا ایک جملہ تو ساری کلاس کو برسوں یاد رہا ہوگا — وہ بھئی عجیب انسان ہے۔ شاعروں کو پہلوان بنا رہا ہے اور پہلوانوں کو شاعر"۔ اپنے اس پیغمبرانہ جملے" پر خود بھی دل کھول کر ہنسنے کے بعد فراقؔ صاحب نے عام پنجابی شخصیت پر لیکچر دیا کہ اولوعزم پنجابی زندگی کے ہر شعبہ میں دلچسپی لیتا ہے۔ اور اسی لئے ہر فن مولا ہوتے ہوئے بھی کسی میدان میں اولیت حاصل نہیں کر پاتا۔" اِس کی منہ بولتی مثالیں ہیں "آپ کے" (یعنی میرے پنجابی) اقبالؔ اور فیضؔ۔ اسی لئے بائرن کو بھی ہم "پنجابی رومانٹک" کہہ سکتے ہیں۔ فراقؔ صاحب پھر زور سے ہنسے۔

بات بائرن سے شروع ہوئی اور بیدی صاحب سے ہوتی ہوئی اقبالؔ اور فیضؔ کا احاطہ کرتی ہوئی بائرن پر ختم ہوگئی۔ اقبالؔ اور فیضؔ کے بارے میں فراقؔ صاحب کے تجزیئے سے یقیناً اختلاف ہوسکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پنجاب میں اچھی شخصیت کا تصور بنیادی طور پر یہی تھا کہ وُہ "مکمل انسان" ہو یعنی زندگی کی ہمہ گیری سے عشق کرے کسی ایک شوق کا ہو کر نہ رہ جائے۔ یہی تصور سنسکرت ادب "سب رنگ"، اور آریائی تہذیب میں "سولہ کلا سمپورن"، شخصیت کا ہے۔ بیدی صاحب بلاشبہ اسی ہمہ گیر شخصیت اور مکمل انسانیت کی روائیتوں کے آئینہ دار ہیں۔

الہ آباد میں تعلیم کے خاتمے کے بعد ہر نوجوان صحافی کی طرح دِلّی کی گلیوں کی خاک کئی سال تک میرا معمول، مقدر اور خوراک بنی۔ ہر ادبی محفل میں کنور صاحب کا ان دنوں طوطی بولتا ہی تھا۔ مگر کئی اہم سیاسی نشستوں میں بھی ان کا چرچا رہتا۔

بیدی خاندان سے میرے قریبی تعلق کے باعث کنور صاحب "آداب قبائل"، کے تحت میرے بزرگ بھی تھے لیکن ان سے کوئی خاص قرب حاصل نہیں ہوا۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ حفیظ صاحب نے میری بیوی منورما دیوان کو اپنی منہ بولی بیٹی بنا کر مجھے بے پناہ شفقت اور محبّت تو دی، لیکن میں اُس حلقے سے دور ہوگیا جو قبلہ رندان شاعر انقلاب جوؔش ملیح آبادی کا تھا۔ کنور صاحب کے حفیظ صاحب سے بہت پرانے بلکہ خاصے پیارے تعلقات تھے۔ لیکن بعد ——————

میں جوشؔ و حفیظؔ کی شاعرانہ چپقلش کی نذر ہو گئے۔ حفیظ صاحب کے دو دوسرے نہایت ہی عزیز دوست اور شاگرد پنڈت ہری چند اخترؔ اور لالہ دوارکا داس شعلہؔ کنور صاحب کی تعریف ہمیشہ کیا کرتے۔ پنڈت جی سے تو کنور صاحب نے ان کے بعد بھی دوستی کی شاندار روایت نبھائی۔ حفیظؔ صاحب کو یہ سب پسند تھا لیکن "جوش نوازی" بہت ناپسند تھی۔

غالباً ۱۹۶۲ء مارچ کا ذکر ہے حفیظؔ صاحب ہند پاک مشاعرہ کے سلسلہ میں دہلی آئے۔ اُنہی دنوں جوشؔ بھی ہجرت پاکستان کے بعد پہلی بار ہندوستان تشریف لائے تھے اور منجملہ اپنے سینکڑوں مداحوں کے پنڈت نہرو سے بھی انھوں نے نہایت ہی جذباتی ملاقات کی تھی۔

ایک شام حفیظؔ صاحب نے ایک عام افواہ کی صحت جاننے کے لئے مجھ سے پوچھا کہ کیا واقعی جوشؔ ہندستان ہی میں رہ جانے کی کوشش کر رہے ہیں"۔ میں نے جواب دیا۔ "ہاں سنا تو ہے لیکن پنڈت جی کا رویہ معلوم نہیں"۔ کہنے لگے۔ "جوشؔ کا سب سے بڑا ہمدرد دوست پنڈت نہرو نہیں"، وی شنکر نہیں بلکہ کنور مہندر سنگھ بیدی ہے۔ وہ یہ سب کام اپنے آپ کروائے گا"۔

پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "بیٹے بریندر جوشؔ کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ اسے بیدی جیسا دوست ملا۔ قسم خدا کی ایسا دوست نصیبوں والے ہی کو ملتا ہے"۔ حفیظؔ صاحب کو خبط کی حد تک یقین تھا کہ ہندستان میں کنور صاحب کا خلوص و محبت ہی جوشؔ کی سب سے موثر طاقت ہے۔ اسی پر وہ جوش سے رشک کرتے ہوئے بیدی صاحب سے شاکی رہے۔ یہ ہے رائے اس شخص کی جسے کنور صاحب سے شکایت تھی قربت نہیں۔

جوشؔ و حفیظؔ میں گو یا ہزار اختلافات کے باوجود ایک اہم قدر مشترک تھی اور وہ تھی کنور صاحب کی دوستی اور وفاداری میں یقین۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک بزرگ کو اس پر ناز تھا اور دوسرے کو رشک۔

یہ نوخیز دو بڑے شاعروں کا ذکر تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ برصغیر کے دونوں سربراہانِ مملکت بھی بالکل نادانستہ طور پر کنور صاحب سے متعلق اس قدر یکساں رائے رکھتے ہیں کہ اگر سرقہ کا شک نہیں تو توارد کا گمان ضرور ہوتا ہے۔ صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق سے ۱۹۸۳ء میں دہلی میں میں نے دُور درشن کے قومی پروگرام کے لئے انگریزی میں ایک انٹرویو لیا تھا جو پاکستان میں بھی نشر ہوا۔ اس کے دوران ہند پاک تہذیبی تعلقات سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے صدر ضیا نے کہا۔" آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں سیاسی لوگوں کے دوروں سے زیادہ ضروری اور زیادہ مفید ادیبوں، شاعروں اور تہذیبی شخصیتوں کا میل ملاپ ہے۔ ابھی پچھلے دنوں آپ کے ممتاز شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی پاکستان تشریف لائے ہوئے تھے۔ پاکستانی عوام نے جس والہانہ انداز سے ہر جگہ ان کا خیر مقدم کیا اس سے ظاہر تھا کہ وہ ہندستان کے بہترین سفیر ہیں۔"

اس انٹرویو کے ساڑھے تین سال بعد یعنی اگست ۱۹۸۶ء میں اردو ادیبوں کے ایک چھوٹے سے وفد کے ساتھ مجھے بھی صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ کنور صاحب کی جانب دیکھ کر گیانی جی نے فرمایا۔" آپ گرو نانک کی اولاد ہیں، اردو کے شیدائی ہیں اور انسانیت کے پرستار ہیں۔ میرے لئے ان سے محبت کی یہ وجہیں کم نہیں ہیں" پھر کہنے لگے۔ لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ کنور صاحب برصغیر میں جہاں بھی جائیں گے۔ ہندوستان کے بہترین سفیر ثابت ہونگے" دلچسپ بات یہ ہے کہ محترم گیانی جی کو قطعاً علم نہیں تھا کہ صدر ضیا نے چند سال پہلے اپنے انٹرویو میں عین یہی بات کہی تھی۔

سوال یہ ہے کہ بیدی صاحب کی ذات میں وہ کیا ہے کہ اجتماع ضدین میں بھی قدر مشترک بن جاتی ہے؟ اس کا بہترین جواب کنور صاحب سے متعلق خالص دفتری انداز میں لکھے گئے ایک تعارفی نوٹ میں "یادوں کا جشن" میں موجود ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صدر انڈین اسٹائل ریسلنگ ایسوسی ایشن آف انڈیا صدر پنجاب باکسنگ ایسوسی ایشن، صدر چیس ایسوسی ایشن آف دہلی۔ صدر کائیٹ فلائنگ فیڈریشن آف انڈیا۔ صدر یوتھ ریفارمسٹ ایسوسی ایشن، قائم مقام صدر انسانی برادری

(بانی بادشاہ خاں) -چیر مین انڈین لٹریری فارم - آرگنائزنگ سکریٹری XVII بین الاقوامی فری اسٹائل کشتی چیمپین شپ دہلی - ممبر دہلی اسپورٹس کاؤنسل - ممبر آل انڈیا ریڈیو اینڈ ٹی وی اردو ایڈوائزری کمیٹی - ممبر ایر انڈیا ایڈوائزری کمیٹی - ممبر وائلڈ لائف آف پنجاب - ممبر گورننگ کاؤنسل غالب اکیڈمی - ممبر بہادر شاہ ظفر میموریل سوسائیٹی - فاونڈر ممبر انڈو پاک فرینڈشپ پروموشن سوسائیٹی - ٹرسٹی غالب انسٹی ٹیوٹ - سرپرست اعلی یوتھ رائیٹرس ایسوسی ایشن اور بانی ہند پاک پریم سبھا ہیں - یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں کنور صاحب کا دخل نہ ہو۔

تو یہ ہے وہ ہمہ گیر شخصیت جس کی بنا پر لارڈ بائرن پر لیکچر دیتے ہوئے فراق صاحب کو کنور صاحب کا خیال آگیا تھا یہ شخصیت ہے ایک ایسا آئینہ جس میں ظاہر و باطن کی کوئی تمیز نہیں جو پاکستان جاتا ہے تو جس خلوص کے ساتھ وہاں کی مقتدر سیاسی، ادبی، سرکاری شخصیتوں سے ذاتی تعلقات کا ذکر کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ فخر اور پیار کے ساتھ اس پھل فروش کو یاد کرتا ہے جو ان کی طالب علمی کے زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے سامنے خوانچہ لگاتا تھا - مشاہیر ادب وسیاست اور حاکمان وقت سے اپنی سچی جھوٹی قربت کا ذکر تو اکثر شاعر و ادیب کرتے ہیں - مگر شاید ہی کسی صاحبِ قلم نے بھول پن کی حد تک بڑھی ہوئی بے تعلقی کے ساتھ اپنی مصروفیات ــــ اور وہ بھی دورِ مجسٹریٹی میں ــــ کا اس طرح ذکر کیا ہو ــ

"میرے دفتر اور گھر میں ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا جن میں اکثریت شاعروں اور ادیبوں کی ہوا کرتی تھی - پہلوان، بٹیر باز، تیتر باز، مرغ باز بھی آتے تھے - مجھے شروع ہی سے مرغ، تیتر، بٹیر لڑانے کا شوق تھا بلکہ کسی حد تک اس فن میں ماہر سمجھا جاتا تھا - استاد خلیفہ مشورہ کرنے میرے پاس آتے تھے - خوب گہما گہمی رہتی تھی شام کو شعرا سے ملاقات ہوتی - کلام و جام و طعام سے ان کی خدمت کی جاتی "۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں

"غرضیکہ میرے دفتر میں شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، پہلوانوں، تیتر بازوں اور بٹیر بازوں کا مجمع لگا رہتا۔"

لطف یہ ہے کہ بیدی صاحب نہ صرف قاضیٔ شہر دہلی رہے بلکہ ان تمام خوش طبعیوں کے باوجود اس دور کے کامیاب ترین قاضی کہے جا سکتے ہیں۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ان کی کامیابی جس کا اعتراف گاندھی جی کے علاوہ سردار پٹیل، مولانا آزاد اور پنڈت نہرو نے بھی کیا ہے ان کی اسی ہمہ گیر شخصیت کی مرہون منت تھی۔ ایسی مکمل شخصیت جو مینڈھے لڑانے میں اتنا لطف حاصل کرتی ہے جتنا کہ مشاعرے کی نظامت کرنے میں۔ شاید شاعر سے پڑھواتے وقت کنور صاحب نے شاعروں کو پہلوانی کے گُر سکھائے ہوں وہاں تیتروں، بٹیروں اور مینڈھوں سے بھی بیت بازی کروائی ہوگی اور مصرعوں پر گرہیں لگوائی ہوں گی۔ ورزش اور پہلوانی سے بیدی صاحب کے شوق کو دیکھتے ہوئے اردو ادب کا ایک عظیم نام ذہن میں آتا ہے اور وہ ہے شیخ امام بخش ناسخ کا۔ لطف یہ ہے کہ استاد ناسخ کا آبائی تعلق بھی اسی خطۂ پنجاب سے تھا جو بیدی صاحب کا وطن ہے۔

"اہم یہ نہیں کہ انسان کیا کرتا ہے بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ انسان جو کام بھی کرے اس میں حرفِ آخر ثابت ہو"، فرانسیسی ادیب والٹیر کا یہ قول شاید بیدی صاحب ہی کے لئے لکھا گیا۔

اب رہی بات ان کے "افسرانہ" جلال کی تو اس کا ذکر باپو کی زبان سے پہلے ہی ہو چکا ہے لیکن ایک واقعہ بیدی صاحب سے خود سن لیجئے ۱۹۴۸ء کے اوائل اور ۱۹۴۷ء کے اواخر میں مسلم دشمن فسادات کا ذکر کرتے ہوئے یاد دلاتے ہیں کہ ایک روز سردار پٹیل کی صدارت میں انتظامیہ شہر کے اعلیٰ افسروں کی ایک میٹنگ ہوئی کہ فسادات پر کیسے قابو پایا جائے۔ اس میں بیدی صاحب نے کہا کہ — اگر دہلی شہر کا نظم و نسق صحیح معنوں میں ایک ہفتے کے لئے میرے حوالے کر دیا جائے تو میں ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ خنجر زنی کی وارداتیں بند ہو جائیں گی۔ اس پر سردار پٹیل نے صاحبزادہ خورشید، ڈی۔سی رندھاوا اور ڈی۔آئی۔جی سے کہہ دیا کہ جس طرح سے بیدی صاحب چاہیں اسی طرح

سے تمام انتظام کیا جائے۔ میں میٹنگ ختم ہوتے ہی کوتوالی آگیا۔ ڈی آئی جی سے کہا کہ مجھے
پچاس آدمی پولیس کے دیئے جائیں جو سفید کپڑوں میں ہوں لیکن جن کی جیب میں پستول ہو۔
اس کے بعد میں نے پریس کانفرنس بلائی اور اس میں یہ بیان دیا کہ پانچ سو سفید کپڑوں
والے پولیس کے آدمیوں کو مسلمانوں کا بھیس بدلوا کر پستولوں سے مسلح کر کے شہر کی گلیوں
میں گشت کرنے پر مامور کر دیا گیا اور انہیں حکم دے دیا گیا ہے کہ اگر انہیں کہیں یہ شک
گزرے کہ کوئی ان پر حملہ کرنے کی نیت رکھتا ہے تو اس پر گولی چلا دیں۔ ان دنوں رات
رات بھر نعرے لگاکرتے تھے یہاں تک کہ لوگوں کی نیند حرام ہوگئی تھی۔ میں نے پبلسٹی وین
میں بیٹھ کر سارے شہر کا چکر لگایا اور اعلان کیا کہ اگر رات کے وقت کہیں سے کوئی نعرہ
اٹھا تو میں اس مکان کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ یہ بھی اعلان کیا کہ لوگ اپنے اپنے
محلوں اور گلیوں میں پہرہ دیں۔ اگر کسی جگہ خنجر زنی کی واردات ہوگئی تو میں ارد گرد
کے جتنے مکان والے ہیں سب کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دوں گا۔ یہ سارا کام شام کے
چھ سات بجے تک ختم ہوگیا اور میں کوتوالی لوٹ آیا۔ ابھی مجھے کوتوالی پہنچے آدھ گھنٹہ ہی
ہوا ہوگا کہ ٹیلی فون آیا کہ گلی مرغان کے نکڑ پر ایک آدمی کو چھرا مارا گیا ہے مگر اسے معمولی سی
خراش آئی ہے میں فوراً کافی تعداد میں نفری لے کر وہاں پہنچا اور وہیں موقعہ پر بیٹھ کر
ارد گرد کے گھروں کی فہرست بنائی اور ہر گھر میں جو کنبے کا مالک تھا اسے گرفتار کر لیا۔
تقریباً ڈیڑھ سو آدمی اس طرح گرفتار ہوئے۔ ان میں سے کئی تو میرے واقف کار ہی
نہیں بلکہ ملنے والوں میں سے تھے۔ دگمبر پرشاد گوہر کے سسرال والے بھی ان میں تھے۔
گوہر صاحب میرے سامنے آئے کہ انہیں چھوڑ دیجئے۔ میں نے کہا کہ گوہر صاحب کل صبح
آپ کے سسرال والوں کے ہاں حاضر ہو کر ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لوں گا لیکن اس وقت
شہر کے امن کا سوال ہے۔ آپ میرے ساتھ تعاون کیجئے۔ چنانچہ سب لوگ رات کو
کوتوالی میں رہے۔ اس شام کی یہ خنجر زنی آخری خنجر زنی تھی۔ اس کے بعد کوئی اس
قسم کی واردات نہیں ہوئی۔ رات کے نعرے بھی ختم ہو گئے۔ لوگوں میں خود اعتمادی
لوٹ آئی۔ وہ لوگ جو ہر وقت خوف کے مارے گھروں میں گھسے رہتے تھے، گلی محلوں میں

نکلے ایک دوسرے سے میل جول بڑھایا اور فضا خدا کے فضل سے ہموار ہونا شروع ہو گئی۔"

مجھے یقین ہے کہ یہی نسخہ اگر آج بھی فساد زدہ اور دہشت زدہ علاقوں میں اپنایا جائے تو نتیجہ وہی ہو گا جو جنوری ۱۹۴۸ء کی دہلی میں دیکھا گیا۔ کیا اب بھی یہ سوال غور طلب ہے کہ بیدی صاحب جب دہلی سے تبدیل ہوئے تو مسلمانوں کے ان گنت وفد گاندھی جی، مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کے پاس یہ فریاد لے کر کیوں آئے کہ انہیں تبدیل نہ کیا جائے؟

ایک اور واقعہ میں نے اپنے مربّی اور دوست جسٹس راجندر سچر سابق چیف جسٹس دہلی ہائیکورٹ سے سُنا ہے اِس سے پتہ چلتا ہے کہ بیدی صاحب واحد سرکاری افسر تھے جن کے لئے مولانا آزاد نے بھی کسی سے یعنی اس وقت کے وزیر اعلیٰ شری بھیم سین سچر (جسٹس سچر کے والد) سے سفارش کی تھی۔ انھیں یا تو دہلی سے تبدیل نہ کیا جائے یا پھر اگر یہ سرکاری قاعدوں کے مطابق ناگزیر ہے تو دہلی کے قریب ہی رکھا جائے۔ چنانچہ وہ گوڑ گانواں کے ڈپٹی کمشنر تعینات کئے گئے۔

بیدی صاحب کی شاعرانہ حیثیت پر پہلے ہی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لئے اس سے میں احتراز کروں گا لیکن خوبصورت نثر نگاری، بے باک، بے لاگ اور دوٹوک اندازِ بیان اور خدا لگتی بات کا ایک نمونہ ضرور پیش کرنا چاہوں گا مشتے از خروارے ملاحظہ ہو مجھے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ بیدی صاحب شعر کے نہیں نثر کے بھی دھنی ہیں، وہ صرف اسی نثر کے بادشاہ نہیں جو مشاعروں کی نظامت کے وقت "نازل" کرتے ہیں بلکہ اس نثر کے بادشاہ بھی ہیں جس سے یادگار کتابیں بنتی ہیں اور ادب کی پہچان ہوتی ہے۔ "یادوں کے جشن" میں شراب خوری کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"شراب کے بارے میں صرف ایک بات اور کہنا چاہوں گا اور وہ یہ کہ ہماری تمام مذہبی کتابوں میں شراب کی تشبیہہ دیجاتی ہے مثلاً قرآن کریم میں "شرابِ طہور" کا ذکر ہے، وید پرانوں میں "رام نام کی مَدِرا" پینے کی تلقین کی جاتی ہے۔ انجیل میں "ڈیوائن وائن" کا تذکرہ ہے۔ ہمارے ہاں گوروگرنتھ

صاحب میں بھی "نام خماری" کی بات کی گئی ہے - اگر یہ چیز اس قدر مکروہ ہے تو اس
کا نام تک کسی شکل میں بھی ہماری مذہبی کتابوں میں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ مذہبی
کتابوں میں یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ رام نام کا دودھ پیئیں۔ واہِ گرو کے نام
کا کڑھا پرشاد کھائیں یا یاد اللہ کی بریانی نوش فرمائیں یا مسیحی کردار کا عشقی
شربت چکھیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شراب بذات خود بری شئے نہیں
ہے - کم ظرف شراب نوش اسے بدنام کر دیتے ہیں۔ بقول شاعر ؎

"مَئے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است بلکہ مے شوت صحبتِ ناداں بدنام

"میں نے شراب کے بارے میں اپنا تمام نظریہ صرف ایک شعر میں عرض کر دیا
ہے اور وہ یہ ہے کہ ؎

"تو پی کے لطف اٹھانا ہے یا بہکتا ہے اُٹھا کہ شیشے میں ایک دیو بھی پری بھی ہے

"اب ہم اس شیشے میں سے دیو نکالتے ہیں یا پری اپنے اپنے ظرف اور بساط
کی بات ہے"

شوخئ بیان اور طہارتِ ایمان کا اس سے بہتر امتزاج اور وہ بھی شراب کے
موضوع پر اردو نثر میں مشکل ہی سے ملے گا۔

طوالت کے خوف سے کچھ زیادہ نہ کہتے ہوئے محض اسی پر اکتفا کروں گا کہ کنور
صاحب کی شخصیت کا سب سے زیادہ خوبصورت پہلو یہی ہے کہ انھوں نے ایک ہمہ گیر زندگی
بسر کی ہے اور کر رہے ہیں انھوں نے ہر رنگ میں بہار دیکھی ہے اور بہار کو ہر رنگ سے
پر بہار کیا ہے۔ عین یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شعر سے لے کر پہلوانی تک سب اکھاڑے جیتے
مگر اس طرح کہ شرافت ہر جگہ غالب رہی۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی عیش ایسا نہ ہوگا جو کنور صاحب
سے ناآشنا رہا ہو یا جسے انھوں روا نہ رکھا ہو لیکن "یادوں کا جشن" میں انھوں نے جوش
صاحب کی "یادوں کا برات" کی مانند ناگفتنی کو گفتنی اور ناکردنی کو کردنی بنا کر پیش نہیں
کیا۔ انھوں نے کسی ایک مقام پر بھی اپنی ان "فتوحاتِ" خلوت کا ہلکا سا اشارہ تک
نہیں دیا جن کے تصور ہی سے بار لوگ ہوس، حرص اور حسرت کی ان گنت انگیٹھیوں کا خیالی

ایندھن فراہم کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا حسن اور حقیقت کے پیمانے سے ناپ کر کیا لیکن جو بھی لکھا شرافت کے معیار سے گرنے نہیں دیا۔ کرنے اور سوچنے میں وہ رند اور شاعر رہے اور لکھنے میں جج اور قاضی۔ "بھوگی" اور "یوگی" کی دونوں حیثیتیں انھوں نے اپنائی اور برتی ہیں۔ لہٰذا کامیابی لازم تھی۔"

روسی ادیب میکسم گورکی کا مشہور مقولہ ہے کہ "زندگی جلنے کے لئے ہے یہ تم پر منحصر ہے کہ تم انگیٹھی کا ایندھن بنتے ہو یا شب تاریک کی شمع"۔ کنور صاحب کی شمع ہر رنگ جلتی رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ جلتی رہے گی۔

لیکن حمد کا یہ خوگر مجبور ہے کہ چلتے چلتے دو گستاخیاں کر دے۔ پہلی تو یہ کہ شکار کا شوق نہ مجھے اپنے باپ دادا کا پسند تھا اور نہ کنور صاحب کا۔ دوسری یہ کہ بیدی صاحب کا یہ دعوٰی کہ وہ ۷۷ سال کے ہو گئے ہیں۔ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ مگر شکار کے بارے میں یہ سوچ کر کافی اطمینان ہوتا ہے کہ بیدی صاحب اب شیر و غزالی اور کبوتر اور حمام کا شکار نہیں کرتے بلکہ اب وہ "قلب و نظر" کچھ اس طرح سے شکار کر رہے ہیں کہ شکار دعا کرتا رہتا ہے شکار ہونے کی۔

رہی بات ۷۷ سالہ عمر کے دعوے کی تو وہ شاید اس لئے کیا جا رہا ہے کہ ہم ایسے "بزرگوں" کو مرعوب کیا جا سکے، ورنہ جس شان اور جس رفتار سے بیدی صاحب چشم بد دور جوان ہو رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایک ڈائمنڈ جوبلی تو کیا، ابھی کئی پلیٹینم جوبلیاں اُن کی منائی جائیں گی۔

پروفیسر قمر رئیس

بیدی صاحب۔ آدمی اور انسان

بیدی صاحب اردو ادب کی ان چند شخصیتوں میں ہیں جنھوں نے بڑی بھری پُری زندگی گُزاری ہے۔ انھوں نے زندگی کے رنگارنگ شگوفوں سے بھونرے کی طرح رس پیا ہے اور اُس رس کو صحت بخش شہد میں ڈھال کر دوسروں کو بخش دیا ہے۔ جن حضرات کی نظر سے ان کی آپ بیتی "یادوں کا جشن" گزری ہے اُن سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ زندگی کے ہر مشغلہ اور ہر تجربہ کی لذتوں سے کسی جھجک کے بغیر انھوں نے کام و دہن کو شاد کام کیا ہے۔ وہ سیر و سیاحت ہو یا شیروں کا شکار، بادہ پرستی ہو یا ناز نینوں سے پیار۔ شعر و شاعری کی رنگین محفلیں ہوں یا زندہ دلوں کی بزمِ مزاح۔ پہلوانوں کی کشتیاں ہوں یا سابق راجوں مہاراجوں کی خرمستیاں الغرض بچپن سے پچھتر سال کی عمر تک ہزاروں قسم کے ہیجان آفریں اور ہوشربا تجربوں سے وہ گزرے ہیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے کسی تجربے سے پریشان نہیں ہیں بلکہ خوش اور مطمئن ہیں کہ اِن تجربوں ہی نے ان کی زندگی کو مالدار اور پُر وقار بنایا ہے۔ انھوں نے اپنے تجربوں سے زندگی کا عرفان اور دوسروں کے تجربوں سے عبرت حاصل کی ہے۔ لیکن یہ ان کی زندگی کا بشری پہلو ہے۔ اگر رواجی اخلاقی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو اس میں لغزشیں بھی نظر آئیں گی اور آلودگیاں بھی۔ بیدی صاحب نے کبھی پارسا یا فرشتہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ان کی بڑائی اس

میں ہے کہ وہ اپنی "لغزشوں" پر شرمانے کے بجائے ان پر فخر کرتے ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ قابل فخر اُن کی زندگی کا وہ پہلو ہے جہاں انھوں نے بشر سے انسان بننے کی ریاضت کی ہے۔ مادی لذتوں کے ساتھ ساتھ روحانی مسرتوں سے ہم آغوش ہونے کی جدّوجہد کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے ایک ایسے مسلک کو اپنے افعال و کردار کا رہنما بنانے کی تگ و دو کی ہے جو انسانیت یا انسان دوستی کی ارفع ترین قدروں سے ہم آہنگ ہو۔ جس میں انسان خود غرضی، مصلحت کوشی، رعونت، خوف اور لالچ کی تمام ترغیبات سے بلند ہو کر عاجزی، دردمندی اور انسان کی خدمت گزاری کو ہی مقصودِ حیات جانتا ہے۔ میں نے بار بار کہا ہے کہ بیدی صاحب نے اس منصب تک پہنچنے کے لئے بڑے جتن کئے ہیں۔ اِس لئے کہ جس بڑے جاگیردار گھرانہ سے اُن کا تعلق ہے اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت جس نہج پر ہوئی اس میں ایک عوام دوست عشق پیشہ، زندہ دل شاعر ہونے کے بجائے ایک بے رحم زمیندار یا سفاک حاکم بننے کے امکانات زیادہ تھے۔ بے شک وہ ایک بڑے زمیندار اور حاکم بھی رہے۔ دولت اور قوت (POWER) جو انسان کو حیوان بناتی ہے انھیں میسر تھی اور اس کے بعض مُضر اثرات بھی ان کی شخصیت میں دیکھے جا سکتے ہیں، لیکن مجموعی طور پر کسی بھی دور میں انھوں نے دولت اور قوت کے نشہ کو اپنی انسانی دردمندی پر غالب نہیں ہونے دیا۔ اور اگر دونوں میں کشمکش ہوئی تو جیت ہمیشہ دردمندی کی ہوئی۔ "آپ بیتی" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"جب ملازمت میں تھا تو کوئی سائل بھی اگر مجھ سے ملے بغیر لوٹ جاتا تھا تو مجھے بے حد تکلیف ہوتی تھی بلکہ بعض اوقات تو اپنی موٹر یا جیپ بھیج کر اس کو بلواتا تھا تاکہ اگر میرے بس کی کوئی بات ہو تو اس کی مدد کروں۔ اگر کسی اور دفتر سے متعلق کوئی کام ہوتا تھا تو سائل کو اپنے پاس بٹھا لیتا تھا اور اُس کی فائل وہیں منگوا لیتا تھا تاکہ وہ رشوت خور اور شکم پرور کلرکوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔" ص ۱۹۹

یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ اب سے کوئی اٹھائیس سال پہلے بیدی صاحب کی شخصیت سے میرا اولین تعارف میرے ایک ہم وطن شاعر، بسمل شاہجہاں پوری صاحب کے ذریعہ ہوا۔

جو شاید اُس زمانے میں بیدی صاحب کے باڈی گارڈ تھے یارہ چکے تھے۔ وہ بیدی صاحب کی رِندی اور عاشقی دونوں کی سخت مذمت کرتے تھے لیکن انھوں نے بلامبالغہ بیدی صاحب کی درد مندی اور انسانی ہمدردی کے سینکڑوں واقعات سنائے۔ ۱۹۴۷ء کے پُر آشوب زمانے میں کسی طرح انھوں نے مُسلمانوں کی مدد کی۔ انھیں متعصب اور فرقہ پرست لوگوں کے چنگل سے بچایا۔ نوکریاں دلوائیں۔ پاکستان بھجوایا۔ اسی طرح کے ان گنت واقعات بسمل سعیدی مرحوم اور دوسرے بزرگوں نے بھی سنائے۔ لیکن بیدی صاحب نے اپنی آپ بیتی میں اس طرح کے واقعات کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ ان کی شخصیت اس نمائشی اخلاق سے بہت دور ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مجھے ان لوگوں سے بے حد نفرت ہے جو شراب کو بُرا سمجھتے ہیں لیکن جو شراب خوری سے کہیں زیادہ بری باتوں کی طرف دھیان نہیں دیتے مکر و ریا دروغ گوئی، بدنیتی بدکرداری، دھوکہ دینا، رِشوت وغیرہ ایسی بُرائیاں ہیں جو قوم اور ملک کا نہ صِرف کردار بگاڑتی ہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر ملک و قوم کو بدنام بھی کرتی ہیں۔" ص ۱۹۷

ان کی اِس وسیع المشربی اور انسان دوستی کے نقوش ان کی شاعری میں بھی بکھرے ہوئے ہیں۔

ہم تھے فقط فرشتہ ہی بننے پہ مطمئن
یہ ہے خدا کی دین کہ انساں بنا دیا

رحمت نے سر خشر گلے جن کو لگا یا
اے زاہد خود بیں وہ گنہگار ہمیں تھے

یوں تو انسان زمانے میں ہیں لاکھوں لیکن
وہی انسان ہے جو انسان کے کام آتا ہے

کسی نے ہنس کے پکارا تو آنکھ بھر آئی
دکھی دلوں کی طبیعت کسی کو کیا معلوم

نہ کہو عرض مدعا کے لئے
مجھ کو انساں سے آدمی نہ کرو

یہ اخلاقی حسیت جو بیدی صاحب کی شخصیت اور شاعری دونوں میں رچی بسی ہے محض سطحی نہیں ہے۔ اس کی جڑیں گہری ہیں۔ اس کی تربیت میں جہاں دوسرے عوامل شامل رہے ہیں وہاں اردو شاعری کی سرکش اور سیکولر روایات کا حصہ بھی رہا ہے۔

جھکا سکے گا خوف کیا ہمیں صلیب و دار کا
ہمیں تو ہیں جو موت کو حیات کہتے آئے ہیں

جبر و ظلم کی قوتوں کے سامنے بے کج کلاہی اور جرأت انکار اردو شاعری کی روایت کا بڑا جاندار حصہ رہا ہے۔ اور اس کے مظاہر بیدی صاحب کے یہاں بھی کم نہیں ہیں۔ وہ غزل کے شاعر ہیں اور غزل میں بھی کلاسیکی اسلوب کو عزیز رکھتے ہیں اِس لئے ان کے سیاسی اور سماجی شعور کی جھلکیاں اُن کے اشعار میں قدیم رموز و علائم کے لباس میں ہی ملتی ہیں۔

در زنداں اگر کھُلا بھی تو کیا
ہم سے ٹوٹی نہ پاؤں کی زنجیر

یہ بجا کہ گردشِ وقت ہے ابھی تیز گردشِ جام سے
ترے رند پھر بھی ہیں مطمئن ترے میکدے کے نظام سے

بیدی صاحب کو اس حقیقت کا احساس ہے کہ جس 'جمہوری نظام' میں سرمایہ داری کے فروغ کے لئے دروازے کھُلے ہوں وہاں بقول اقبال جمہوریت دیو استبداد بن جاتی ہے۔ وہاں وہی سیاسی جماعتیں برسرِ اقتدار آتی ہیں جن کی سرپرستی سرمایہ دار اور صنعت کار کرتے ہیں۔ بیدی صاحب اپنی آپ بیتی میں بڑے تلخ لہجہ میں اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں۔

"... صنعت کاروں کے پاس لاکھوں کروڑوں کا کالا دھن ہے جو ہندوستان
میں اور باہر کے ملکوں میں چھپا رکھا ہے۔ ان کا "کاروبار" باقاعدہ چل رہا ہے
.... اگر واقعی امیری اور غریبی کا امتیاز مٹانا مقصود تھا تو برلا، ٹاٹا، ڈالمیا
سنگھانیا وغیرہ کی تمام آمدنی سرکار غریبوں کے لئے لے لیتی اور ان کی مناسب
تنخواہیں مقرر کر دیتی تاکہ یہ لوگ اس سے زیادہ نہ لے سکیں اور باقی روپیہ
غریبوں کی امداد میں خرچ کیا جا سکے۔ لیکن ایسا ہوتا بھی کیسے اور کیوں؟
لوک سبھا اور ودھان سبھاؤں کے چناؤوں میں کھربوں روپیہ جو خرچ ہوتا
ہے وہ کہاں سے آتا؟.... ایسے وقتوں میں صنعت کاروں کے علاوہ کون کھربوں
روپیہ چندہ دے سکتا ہے۔ اس لئے اس سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو کون
سی حکومت ذبح کر کے کوتاہ اندیشی کا مظاہرہ کر سکتی ہے" ص۲۹

بیدی صاحب کسی ماہر سیاسیات کی طرح نہیں ایک عوام دوست ادیب کی حیثیت
سے ہندوستان کی سیاست اور جمہوریت کی عوام دشمنی کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں ——
اس طرح کی حق گوئی اور جرأت گفتار کے نمونے ان کی آپ بیتی کے دوسرے ابواب میں
بھی ملتے ہیں۔

بیدی صاحب کی زندگی اور شاعری میں بشریت کے تقاضوں اور انسانیت کے مطالبوں
دونوں کا احترام ملتا ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ کہیں کہیں ان دونوں میں کشمکش بھی ہوتی ہے لیکن
بیدی صاحب اِسے تصادم میں ڈھلنے نہیں دیتے۔ مثلاً عشق کا جذبہ ان کے یہاں ایک عام
عاشق کی رنگین واردات کی صورت میں ملتا ہے اور وہ بھی حضرت جوش کی طرح ایک
کامیاب عاشق کے نشاط آگیں لمحوں کو ہی یاد رکھتے ہیں۔ ان کا فلسفۂ حیات بھی اس کی
تائید کرتا ہے۔

مطربا گیت، ساقیا ساغر
زندگی لوٹ کر نہیں آتی

وہ اصنام خیالی نہیں بلکہ اصنامِ حقیقی کی پرستش کرتے ہیں اور ان سے اپنی معاملت

کو بڑے لطیف شعری پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔

وہ وصل تو کیا ہجر کے شایاں بھی نہیں ہے
رک جائے جو اقرار کو انکار سمجھ کر

تُو بھی وجہ سکون نہ تھا کل تک
آج تجھ بن قرار ہے ائے دوست

یہ ہوتی ہے بڑی بے باک و قاتل
نگاہِ شرمگیں ہم جانتے ہیں

عشق کے اس نشاطیہ رنگ کے دوش بدوش بیدی صاحب کی شاعری میں عشق کا ایک ارفع (SUBLIME) تصوّر بھی ملتا ہے۔ جو اپنی ہمہ گیری کے باعث ایک تہذیبی قدر کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس کا تعلق محض اعصاب کے ہیجان سے نہیں وجدان سے ہے۔ یہ زندگی کی مسرتیں ہی نہیں اس کا عرفان بھی بخشتا ہے۔ یہ انسانیت کے اعلیٰ نصب العین کی طرف آدمی کی رہنمائی کرتا ہے۔ اسے ایک ایسی متحرک قوّت عطا کرتا ہے جو زندگی کی معنویت کا ادراک بخشتی ہے۔

ائے ناصحِ مشفق یہ محبت ہے محبت
ہر بات سمجھ لوگے یہ اک بار سمجھ کر

یہ عشق زندگی کی آگہی ہی نہیں بخشتا اس کے رموز بھی کھولتا ہے اس کے ہزار شیوہ حسن کو آشکارا کرتا ہے۔ بیدی صاحب نے ایک شعر میں 'مشعلِ نظر' کی ترکیب سے اس پیچیدہ اور نازک خیال کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔

عشق ہے مشعلِ نظر ورنہ
زندگی کیا ہے اک اندھیری رات

عشق کا سودا صرف دلِ دردمند ہی کرتا ہے۔ وہی اس جنس گراں کی قیمت

کو پہچانتا ہے۔ اور اس کے بخشے ہوئے سوزِ دروں کی حیات افروزی کو سمجھتا ہے۔
عشق کے اس داخلی اور اخلاقی پہلو کی ترجمانی کرنے والے اشعار بیدی صاحب کی غزلوں میں اکثر مل جاتے ہیں جو ان کی رچی ہوئی شخصیت اور روشن فکر کی شناخت میں مدد دیتے ہیں۔

یہ مانا عشق اک جنس گراں ہے
اسی سے گرمئ بازار بھی ہے

یہ دیارِ عشق ہے اس میں سحر
بستیاں کم کم ہیں، ویرانے بہت

حسن اور عشق ملیں مل کے خدا بن جائیں
گر ہوس تفرقہ پردازنہ ہونے پائے

ہزار دیدۂ تر نے بہا دئے دریا
جو آگ دل میں لگی ہے اسے بجھا نہ سکے

بیدی صاحب کی شخصیت میں وسیع المربی، حق پرستی اور رواداری کی قدریں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ میرا خیال یہ تھا کہ ان کی زندگی میں مذہب کا کوئی دخل نہیں ہے لیکن ایک واقعہ نے مجھے چونکا دیا۔ ایک بار مغرب کے بعد میں نے دیکھا کہ بیدی صاحب ایک لان میں تنہا ٹہل رہے ہیں۔ مجھے ایک معاملہ میں ان سے بات کرنا تھی۔ یہ موقع غنیمت جانا اور لان میں ان کے ساتھ ٹہلتے ہوئے بات چھیڑ دی۔ لیکن چند ثانیوں بعد مجھے احساس ہوا کہ بیدی صاحب پورے استغراق سے کوئی جپ کر رہے ہیں اور میری بات نہیں سن رہے ہیں۔ میں فوراً ان کو تنہا چھوڑ کر چلا آیا۔
بعد میں بیدی صاحب ملے تو مجھ سے معذرت کی حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔

اس واقعے سے مجھ پر یہ حقیقت کھُلی کہ وہ ایک سچّے مذہبی انسان ہیں۔ دوسرے مذاہب کا جیسا اور جتنا احترام وہ کرتے ہیں اس میں نمائش کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح اپنے روزمرّہ کے مشغلوں اور رویوں میں وہ لوگوں کو یہ احساس نہیں ہونے دیتے کہ وہ ایک مذہبی انسان ہیں۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی میں بڑی بے باکی سے لکھا ہے۔

"جب بھی کوئی مذہب کو درمیان میں لاکر بات کرتا ہے تو مجھے ناگوار گزرتا ہے اور میں اس قدر صاف گوئی سے کام لیتا ہوں اس پر میرے ہم مذہب یا دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والے کبھی کبھی ناخوش بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں مذہب دین دھرم پنتھ سب کو ایک ذاتی اثاثہ سمجھتا ہوں جسے نمائش کے لئے منظرِ عام پر لانا کسی صورت میں بھی مجھے پسند نہیں۔" ص ۱۹۲ء

مذہب کا یہ تصوّر اور زندگی میں اس کی عمل آوری ہی صحیح معنوں میں ایک سیکولر سماج کے قیام کی ضمانت ہو سکتی ہے۔ ورنہ آج ہمارا معاشرہ جس شدید بحران سے گزر رہا ہے اس کا اصل سبب مذہب یا مذہبی عقائد کی طرف مراجعت نہیں بلکہ مذہب کی نمایش اس کی تجارت اور سیاست ہے۔ اس لحاظ سے مذہب کے تئیں بیدی صاحب کا رویہ ایک مثالی انسان رویہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ ذاتی یا غیر ذاتی مفادات کے لئے مذہب اور مذہبی جذبات کے استحصال سے نفرت کرتے ہیں۔ مذہب کی نمایش کو بھی وہ ایک طرح کی ریاکاری جانتے ہیں یہ تصور اردو شاعری کی فکری روایت کا ایک حصّہ رہا ہے۔ لیکن بیدی صاحب نے اِسے صرف شاعری میں نہیں بلکہ اپنی عملی زندگی سے ہم آہنگ بنا کر پیش کیا ہے۔

اردو زبان سے بیدی صاحب کی بے لاگ محبّت اور وفاداری کا ایک سبب شاید یہ بھی ہے کہ اس زبان کے بنیادی جمہوری اور سیکولر کردار سے ان کی شخصیت سے مطابقت رکھتی ہے۔ بیدی صاحب کی ذات اِس کی بہترین قدروں کی امین و محافظ ہے اور اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہیں ہوگا کہ عصرِ حاضر میں اُن کی شخصیت اردو زبان کی سادگی، شیرینی، رواداری، وسیع المشربی، اور انسان دوستی کی علامت بن گئی ہے۔

پروفیسر عُنوان چشتی

دینداری اور صنم پرستی کا پیکر

خواجہ احمد فاروقی صاحب نے مومن کے سلسلے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ جو دین داری اور صنم پرستی اس کی زندگی میں تھی، وہی اس کی شاعری کا طرّہ امتیاز ہے۔ یہی بات کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ دین داری اور صنم پرستی کے تصورات کو کسی قدر متعین کر لیا جائے۔ اگر دین داری کو مذہبی رسوم تک محدود نہ رکھا جائے اور اس کا دائرہ خدا پرستی اور انسان دوستی تک وسیع کر لیا جائے تو سحر صاحب بلاشبہ دین دار ہیں۔ اسی طرح صنم پرستی کے زمرے میں اگر ذوقِ جمال کی ہر جہت کو شامل کر لیا جائے تو سحر صاحب کی صنم پرستی کا تصور واضح ہو جاتا ہے۔ سحر صاحب کی شخصیت دین داری اور صنم پرستی کا دلکش پیکر ہے۔ دنیا میں اشخاص بہت ہیں مگر شخصیتیں کم ہیں۔ شخصیتیں بھی متعدد اقسام کی ہوتی ہیں۔ ہر شخصیت اپنے فکر و عمل اور ان کے اثرات سے پہچانی جاتی ہے۔ سحر صاحب کی شخصیت کا خارجی پہلو بھی قابلِ توجہ ہے۔ میں نے ۱۹۶۸ء میں ایک مضمون میں ان کی ظاہری شخصیت کی دلربائی پر اس طرح اظہارِ خیال کیا تھا۔

"سحر صاحب کا بھرا بھرا اور گداز جسم نبز دراز قد اُن کی مردانہ شخصیت کا آئینہ دار ہے لمبی ناک، بڑا سر، کشادہ پیشانی اور ہلالی ابروئیں، حسن صورت

اور وجاہت کی دلیل ہیں۔ بڑی بڑی اُبھری ہوئی غلافی آنکھیں قوتِ کہربائی کا مخزن معلوم ہوتی ہیں آنکھوں کی شربتی پتلیاں اور سُرخ ڈورے ان کی ذہانت اور طباعی کا مظہر ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُن کی آنکھوں کی پُر اسرار چمک تسخیرِ قلوب کا طلسم معلوم ہوتی ہے۔ سحرؔ صاحب کی شخصیت میں اُن کی آنکھوں کے اعجاز کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا"۔۔۔۔۔۔"چوڑا چکلہ سینہ بھرے بھرے گال اور گالوں پر خاص انداز کی ریش اُن کی شخصیت کے مردانہ حسن میں اضافہ کرتی ہے۔ ان کا رنگ اگرچہ کھلتا ہوا نہیں ہے، گندمی ہے۔ پھر بھی سحرؔ صاحب کے بانکپن میں اضافہ کرتا ہے۔ سحرؔ صاحب کی عمر ساٹھ برس سے اوپر ہے مگر اُن کا انگ انگ جوان ہے۔ کسے کسائے جسم، چہرے کی شادابی، رفتار کے وقار اور اُن کی قوتِ کار کے پیشِ نظر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ضعیف ہیں۔ اُن کی شخصیت کے مردانہ بانکپن میں اگر اُن کے خضاب آلود سیاہ بالوں کو شامل کر کے دیکھا جائے تو ان کی گریز پا جوانی پر نوجوانوں کو رشک آنے لگتا ہے" (خیر سے اب سحرؔ صاحب نے خضاب لگانا چھوڑ دیا ہے اور چہرے پر ریش مبارک کی سپیدی صبح کی کرنوں کی طرح رقص کرتی ہے)۔۔۔۔۔۔"سحرؔ صاحب وضع قطع اور پوشاک کے نقطۂ نظر سے خالص ہندوستانی ہیں۔ کھدّر کا سفید کرتا۔ اُس میں سفید بٹن، سفید چوڑی دار پاجامہ اور کسی ہلکے رنگ کی پگڑی اُن کا مرغوب لباس ہے۔ پوشاک کا دودھیا رنگ ان کی امن پسندی، طبیعت کی سادگی اور صلح کل مشرب کی علامت ہے۔ سحرؔ صاحب کی پگڑی کے پیچ وخم میں مرصّع سازی نہیں ہوتی۔ سادگی ہوتی ہے۔ انہیں نظرِ بد سے بچانے کے لئے پگڑی اور پیشانی کے بیچ ایک گہرے رنگ کی سیاہ پٹی جھانکتی رہتی ہے"۔۔۔۔۔۔

"سحرؔ صاحب بولتے نہیں موتی رولتے ہیں۔ اُن کی آواز کا جادو دل کو موہ لیتا ہے۔ اُن کے لہجے کا خلوص دل کے سوئے ہوئے جذبوں کو جگاتا ہے۔ گفتگو کا فن بات بات پر سحرؔ صاحب کے نطق کے بوسے لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے چھوٹے بڑے، امیر،

غریب، شریف، رذیل، مخلص، مکّار۔ حاکم اور محکوم ہر طرح کے لوگ اُن کی بزم میں آتے اور "گوہرِ مقصود" سے دامن کو بھر کر واپس جاتے ہیں۔ اگر دلداری و دلدہی بذلہ سنجی اور مزاج گوئی کو معیارِ گفتگو مان لیا جائے تو سحؔر صاحب کا ہر لفظ اس کسوٹی پر کھرا اترتا ہے۔"

یادش بخیر یہ میں نے سطور اٹھارہ سال قبل تحریر کی تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ تحریر آج بھی ان کے ہو بہو قلمی چہرے کی تشکیل کرتی ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ وقت نے ان کی شخصیت میں خروش کی جگہ ٹھہراؤ پیدا کر دیا ہے۔ رہی ان کی شخصیت کی پروقار دلکشی، وہ اپنی جگہ موجود ہے۔

میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ سحؔر صاحب بولتے نہیں موتی رولتے ہیں۔ ان کے لب و لہجہ اور آواز کے پیچ و خم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نادرِ دیرِ دو رنگ ہے۔ اس میں دو سُر صاف سنائی دیتے ہیں۔ آواز میں ایک سُر مہین شیریں اور سریلا ہے۔ جس کا تعلق ان کی تخلیقی اور داخلی زندگی سے ہے۔ دوسرا سُر گمبھیر، گرج دار اور پھیلا ہوا ہے۔ جس کا تعلق ان کی طبقاتی اور خارجی زندگی سے ہے۔ گفتگو میں دونوں سُروں کا تناسب موقع و محل کے اعتبار سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ جو اُن کی ذہانت اور موقع شناسی کا بہترین ثبوت ہے۔ بزمِ یاراں اور حلقہ رنداں میں لہجہ کا وہ انداز نمایاں ہوتا ہے۔ جس میں دلنوازی لطافت اور شیرینی ہوتی ہے۔ دوسرے شدید لمحوں میں وہ انداز ظاہر ہوتا ہے جس میں تحکم، گرج اور توانائی ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر سحؔر صاحب کا لب و لہجہ پر وقار اور شگفتہ ہوتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی نشہ کی ترنگ میں یا مشاعروں میں شگفتگی کی حدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اور ان کے فقرے نامحرم علاقوں کے شجر ہائے ممنوعہ کو چھو لیتے ہیں۔

بنیادی طور پر سحؔر صاحب مجلسی شخصیت کے حامل ہیں۔ گفتگو کا فن جانتے ہیں۔ یہ فن خطابت سے زیادہ نجی صحبتوں اور مشاعروں کی نظامت میں نمایاں ہوتا ہے۔ میں نے انھیں "محفل رنداں" میں تو کچھ کہتے ہوئے نہیں سُنا۔ البتہ بعض دوسری صحبتوں اور مشاعروں میں سُنا ہے اور خوب سُنا ہے۔ آصف علی روڈ پر دہلی آٹو موبائلز کے شوروم

میں مدتوں اُن کی نشست گاہ رہی ہے - وہاں صبح ۱۱ بجے سے ایک بجے تک دربار لگتا تھا۔ طرح طرح کے لوگ آتے - اپنی اپنی بولیاں بولتے اور سحر صاحب سب کی دلدہی کرتے - سحر صاحب کے پاس آنے والوں میں محض ضرورت مند ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ مختلف قسم کے لوگ ہوتے تھے - جن میں پتنگ باز، کتوبر باز، شکاری، پہلوان، شاعر، ادیب غرض ہر طرح کے لوگ ہوتے - سحر صاحب ہر شخص سے اس طرح ٹوٹ کر گفتگو کرتے گویا سب سے زیادہ اُسی کو چاہتے ہیں - یہیں میری ملاقاتیں بہت سے شعراء سے بار بار ہوتی ہیں - جن میں ساحر ہوشیار پوری، رام کرشن مضطر، عزیز وارثی، امیر آغا وغیرہ شامل ہیں - شاعرات میں جمیلہ بانو اور برکھا رانی وغیرہ شامل ہیں - سحر صاحب کی گفتگو مشاعروں کی نظامت میں زیادہ شوخ ہو جاتی ہے - وہ سامعین کا دل جیتنے کے لئے شوخ مزاح سے کام لیتے ہیں - ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے کہ سحر صاحب اور انور صابری دونوں ایک مشاعرہ میں موجود تھے - مشاعرہ کا رنگ پھیکا پڑنے لگا تھا - اور لوگ اونگھنے لگے تھے - سحر صاحب نے سامعین کی بے کیفی کو محسوس کر لیا اور یوں گویا ہوئے

"حضرات

بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ دیوبند کی وجہ تسمیہ کیا ہے ؟

دیوبند دو لفظوں سے مرکب ہے دیو اور بند

یعنی وہ جگہ جہاں دیو بند ہے

اب میں اُس "دیو" کو پیش کرتا ہوں، جس کی وجہ سے دیوبند، دیوبند کہلاتا ہے

اس تمہید کے بعد اعلان کیا

آئیے علامہ انور صابری دیوبندی

انور صابری کا اپنی جگہ سے اٹھنا تھا کہ ان کی ہیئت کو دیکھ کر اور سحر صاحب کے جملہ کی بلاغت کو سمجھ کر سامعین چیخ پڑے - اور ہنستے ہنستے بے اختیار ہو گئے - مشاعرہ ایک بار پھر کھل اٹھا اور انور صابری کی آواز کانوں میں رس گھولنے لگی - ساری بے کیفی دُور ہو گئی -

ایسا ہی ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ علامہ انور صابری سیاسی لوگوں کی موجودگی میں اپنی حب الوطنی کا اظہار کرتے ہوئے جیل جانے کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک بار میرے وطن قصبہ بنگلور ضلع سہارنپور میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ سحر صاحب نظامت اور مہاویر تیاگی وزیر دفاع صدارت کر رہے تھے۔ انور صابری صاحب کو زحمتِ کلام دی گئی۔ وہ ڈائس پر تشریف فرما تھے ہی۔ فوراً قلندرانہ شان کے ساتھ مائک پر آگئے اور صدرِ جلسہ کو مخاطب فرماتے ہوئے کہا

صدرِ محترم

آپ کو یاد ہوگا کہ میں اور آپ فلاں جیل میں اکٹھے نظر بند تھے

سحر صاحب رہا نہ گیا۔ انھوں نے برجستہ فرمایا

انور صابری صاحب آپ ٹھیک فرما رہے ہیں کہ آپ اور صاحبِ صدر ایک ہی جیل میں نظر بند رہے ہیں۔ مگر ــــــ دونوں کے جرم کی نوعیت الگ الگ رہی ہوگی۔

یہ سننا تھا کہ مشاعرہ میں قہقہوں کا سیلاب آگیا۔ انور صابری صاحب بہت جزبز ہوئے جوابی حملہ بھی کیا۔ مگر سحر صاحب کی بذلہ سنج طبیعت اپنا کام کر گئی۔ جن لوگوں نے سحر صاحب کو دیکھا اور سُنا ہے، اس قسم کے صدہا واقعات سنا سکتے ہیں۔ جس سے ان کی ذہانت طباعی اور حسِ مزاح کا ثبوت ملتا ہے۔

سحر صاحب بنیادی طور پر ایک مخلص، درد مند اور وسیع القلب انسان ہیں۔ ان کے اخلاص اور درد مندی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اردو زبان اور ادب کی بے لوث خدمت کی ہے۔ کبھی مشاعرہ کے نام پر ایک پیسہ تک لینا گوارہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ اکثر مہمانوں کی تواضع پر خاصی رقم خرچ کرتے رہے ہیں۔ ان کے دفتر میں ہر روز احباب اور ضرورت مند آتے۔ وہ سب کی مزاج پرسی کرتے۔ ٹھنڈے اور گرم سے تواضع کرتے۔ اگرچہ وہ خود چائے نہیں پیتے لیکن ملاقاتیوں کی تواضع چائے اور کافی سے کرتے۔ اگر کوئی ٹھنڈا پینا چاہتا تو اُس کو جوس یا لیمن پلواتے۔ بعض من چلے شراب کی فرمائش کر بیٹھتے۔

ان کو شراب پلواتے اور چلتے ہوئے ایک آدھ بوتل بھی اس کے ساتھ کر دیتے۔ میں ایسے کئی شاعروں سے واقف ہوں جو سحر صاحب کو محض اس لیے "عالی جاہ" اور "حضورِ والا" کہتے کہ انھیں سحر صاحب سے شراب پینی ہے یا مشاعرہ کے دعوت نامے حاصل کرنے کے لئے سفارش کرانی ہے۔ سحر صاحب کو اکثر مشاعروں کے دعوت نامے آتے ہیں۔ مشاعروں میں شرکت کے لیے ان کی ایک ہی شرط ہوتی ہے کہ ان کے ۴، ۵ شاعر دوستوں کو مدعو کیا جائے۔ چنانچہ وہ خود کوئی رقم نہیں لیتے اور ان شاعر دوستوں کو بازار کے بھاؤ سے زیادہ رقم دلوا دیتے ہیں۔ دراصل اس انداز سے وہ کئی لوگوں کی مالی مدد کرتے ہیں۔ اور کبھی لفظِ احسان زبان پر نہیں لاتے۔

سحر صاحب ایک کلاسیکی انداز کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کو ان کے مزاج، ماحول مشاعروں اور ان نجی صحبتوں نے متاثر کیا ہے، جن کی وہ جان رہے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں کلاسیکی نظم و ضبط، جذبے کا وفور اور لب و لہجہ کی سادگی ملتی ہے۔ ان کی شاعری کے افق پر مشترکہ تہذیب کی اقدار کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ بظاہر انھوں نے گُل و بلبل اور جام و مینا کی شاعری کی ہے۔ لیکن دراصل انھوں نے اپنے افکار کو مانوس اسلوب اور لفظیات میں ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اگر ایک طرف ان کے افکار پر روحانی دھند چھائی ہوئی ہے تو دوسری طرف انسانی دردمندی، مساوات، اتحاد، بقائے باہم، عظمتِ انسانی اور روحانی ارتقاع کی چھوٹ بھی پڑتی ہے۔ انھیں اجزا سے ان کی شاعری کا خمیر تیار ہوا ہے۔ اور ایک ایسا کیف مرکّب بن گیا ہے۔ جو آج کے وحشت زدہ انسانوں کو چند لمحوں کے لیے کیف و سکون کی دولت عطا کرتا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا کہ سحر صاحب کی شاعری میں انسان دوستی کا رنگ کافی شوخ ہے۔ انھوں نے عظمتِ انسانی کا نہ صرف یہ کہ اقرار کیا ہے بلکہ اس کو اپنی شاعری میں ایک اہم قدر کی حیثیت سے سمویا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کائنات میں انسان کی حیثیت کلیدی نوعیت کی ہے۔ یہ اپنی حدوں میں محشر خیال بھی ہے اور عالمِ اصغر بھی۔ اس لیے کوئی باشعور فنکار انسان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ سحر صاحب نے بھی انسانی

عظمت کا احساس اپنے انداز سے کیا ہے۔ انھوں نے انسانوں کے درد و داغ، ذوق وجستجو کرب ونشاط اور سکون وانتشار کو اپنی ذات کے حوالے سے پیش کیا ہے —— اس کے علاوہ انھوں نے وحدتِ انسانی اور وحدتِ کائنات کو خاص اہمیت دی ہے۔ سحرؔ صاحب انسانوں کو ایک کُل تصور کرتے ہیں۔ انھیں خانوں میں تقسیم کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے یہاں بنیادی حیثیت انسان کی ہے۔ اس کا مسلک، مذہب اور نظریے کی نہیں —— ان کی شاعری سے خالص ہندوستانی تہذیب اور معاشرت کی مہک بھی آتی ہے۔ ان کی شاعری کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری ایک کھُلی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ اور حدِ نگاہ تک روشنیوں اور رنگوں کا رقص سا ہو رہا ہے۔ ایک مئے اور نشاط کا عالم ہے۔ انسان اور انسان ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔ محبّت برس رہی ہے اور اخلاص کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ اگر کسی شاعر کے یہاں یہ اسلوبِ حیات ہو اور اس کا اظہار اس کی شاعری میں بھی ہو تو اس کے "فکر وفن" کو اردو تہذیب کا گلدستہ کہنا درست نہیں تو اور کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

کون سنتا ہے اِس زمانے میں —— عرضِ احوال واقعی نہ کرو

یوں تو انسان زمانے میں ہیں لاکھوں لیکن —— وہی انساں ہے جو انسان کے کام آتا ہے

ہم نے وہ وقت بھی دیکھا ہے محبّت میں کہ جب —— کوئی شکوہ نہ رہا تنگیٔ داماں کے سوا

ہم نے عہدِ وفا نباہ دیا —— اب تجھے اختیار ہے اے دوست

اک عمر اور دے کہ تجھے یاد کر سکیں —— یہ زندگی تو وقفِ غمِ کائنات ہے

دیکھ کر اُس نگاہ کا عالم —— لاکھ عالم نگاہ سے گزر گئے

جس میں دل کو سکون حاصل ہو —— وہ گھڑی عمر بھر نہیں آتی

ہمیں سمجھانے والے خود ذرا دل چیر کر دیکھیں —— در کعبہ اگر وا ہو تو بتخانہ نکلتا ہے

متاعِ اہلِ محبّت کسی کو کیا معلوم —— یہ دو دلوں کی امانت کسی کو کیا معلوم

یہ کس غریب کا دل بجھ گیا محفل میں —— چراغ جلتے ہیں اور روشنی نہیں ہوتی

ممکن ہے کہ اک روز تری زلف بھی چھولیں — وہ ہاتھ جو مصروفِ گریباں ہی رہے ہیں

ہزار دیدۂ تر نے بجھا دئے دریا — جو آگ دل میں لگی ہے اُسے بجھا نہ سکے

واقعہ یہ ہے کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی شخصیت ایک سدا بہار شخصیت ہے۔ جس میں انسانی اقدار کے بہت سے جلوے بے نقاب ہیں۔ انھوں نے اپنے بارے میں کیا خوب کہا ہے۔

میکدے میں وہ بے نصیب کسے
جو سحرؔ کا مقام ہے ساقی

ڈاکٹر کامل قریشی

کنور صاحب اور ان کے پسندیدہ مشاغل اور دلچسپیاں

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی ذات تہذیب و ثقافت، فکر و فن، شعر و سخن، رندی و پاکبازی، سیاست و سماج، انتظام و اہتمام اور مجلس سازی کی دنیا میں کسی تعارف و تعریف کی محتاج نہیں، شرافت نسبی کے اعتبار سے وہ گرو نانک کی خاندانی عظمت کا روشن چراغ ہیں، آداب و اخلاق اور شائستگی کے اعلیٰ نمونے اس نسبت خاص سے ان میں جلوہ گر نظر آتے ہیں، علم و ادب کے آبدار موتیوں سے اُن کی شخصیت آئینہ دکھائی دیتی ہے فکر و فن اور شعر و سخن کی خدمت کرتے ہوئے اُنھیں نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا اور یہ اوصاف اُن کی زندگی کا ایک ایسا حصّہ بن گئے ہیں جن سے الگ کر کے انھیں دیکھا نہیں جا سکتا، رندی و پاکبازی اُن کے یہاں ایک ایسے حسنِ تضاد کی صنف بن کر ابھرتی ہیں جو اپنی مثال آپ ہے، روحانیت و تصوّف کی دولت کے لیئے اُن کو اپنے گھر سے باہر جانا نہیں پڑا، اِس ماحول کے سائے میں وہ پیدا ہوئے، پلے بڑھے پروان چڑھے، دنیا کے ذاتی مشاہدات و تجربات نے ان میں اس قدر بصیرت اور گہری سوجھ بوجھ پیدا کی کہ وہ جہاں رہے سربلند رہے اور وہ آج تک جہانِ علم و ادب سے بھی داد حاصل کر رہے ہیں۔

کنور صاحب کے خاندان کے لوگ بھی بہت سے شوقوں مشغلوں اور تفریحوں کے دلدادہ اور دیوانے تھے اِنھیں شکار کا شوق جنون کی حد تک تھا، کنور صاحب کو یہ شوق وراثتی طور پر مِلا۔ کنور صاحب کے خاندان کے تمام ہی افراد مختلف چرند پرند اور درند کا شکار بڑی گہری دِلچسپی اور خاص انتظام و اہتمام کے ساتھ کھیلتے تھے، اِن جانوروں میں ہرن سے لے کر شیر اور باز سے لے کر شِکرا تک سب شامل تھے اس سلسلے میں کنور صاحب بیان کرتے ہیں:

"شِکار کا شوق ہمارے خاندان میں پشتوں سے ہے، شکار کرنا ہمارے خون میں رچا ہوا ہے یہاں تک کہ ہمارے خاندان کے بچّے ہوش سنبھالتے ہی بندوق کی مانگ کرتے ہیں۔"

شیر کے شکار میں مہارت اُن کو اپنے والد، تایا چچا اور بڑے بھائی سے ورثے میں مِلی تھی۔ باز کے شکار میں اُن کے والد چیمپین تھے جنھوں نے اُس کو ایک فن کا درجہ دیا تھا اور اس طرح ملک و بیرون ملک اس میں اس قدر شہرت پائی کہ دُور دور سے باز کے عاشق شکاری کنور صاحب کے والد سے ہی رجوع کرتے تھے کنور صاحب نے اس سلسلے میں ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"ہمارا خاندان ہند و پاکستان میں باز کے شکار کے لیے مشہور ہے یہاں تک کہ سعودی عرب کے شہزادگان جب بھارت آئے تو انھوں نے آنے سے پہلے ہی مجھ سے رابطہ قائم کیا۔"

آج بھی وہ نئے شکاریوں کو شکار کے داؤ پیچ بتاتے۔ شکاروں کی خوبی بیان کرتے شکاریوں سے دِلچسپ گفتگو میں مصروف نظر آتے ہیں۔ گاہے گاہے اعلیٰ درجے کے شہریوں کے ساتھ بلاکوں اور مشہور شکار گاہوں میں شکار کو بھی جاتے ہیں اُن کا یہ شوق آج بھی زندہ ہے، وہ جتنے ماہر شکاری ہیں اتنے ہی اچھّے خوش خوراک ہونے کے سبب بہتر سے بہتر شکار کے مختلف لذیذ کھانوں کا شوق بھی رکھتے ہیں، میں نے خود بھی کنور صاحب کو حضرت استاد بیخود دہلوی کی حیات تک (غالبًا ۵۳-۱۹۵۲ء میں) اُن کی خدمت میں بڑے مزے لے کر شکار کے مختلف قصّے بیان کرتے اور بیخود صاحب حضرت داغ دہلوی

کی معیت ــــــ میں رہ کر شکار کھیلنے کے واقعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے دیکھا اور سُنا ہے۔ شکار آج بھی اُن کے پسندیدہ شوقوں میں سرِ فہرست ہے، اُن کو وائلڈ لائف آف پنجاب کے ممبر ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔

پہلوانی بھی کنور صاحب کا جدّی شوق ہے، کسرت، ورزش اور یوگا اُن کے خاندان میں بہترین و پسندیدہ مشاغل میں شامل ہیں، اُن کے والد تایا، چچا اور بھائی بھی چونکہ خاندانی روایات کے اعتبار سے پہلوانی کے رسیا تھے اس لیے انھیں کشتیاں لڑنے کشتیاں کرانے، پہلوانوں کو تربیت دینے اور اُن کی سرپرستی کرنے کے علاوہ دنگل کرانے کا بھی بے پناہ شوق تھا، ان دنگلوں میں مشہور پہلوان کشتیاں لڑنے آتے تھے۔ اس دنگل کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نُورا کشتی (خُفیہ سمجھوتہ کر کے کشتی لڑنا) نہیں ہوتی تھی صرف کانٹا کشتی ہی اس دنگل کا دستور تھا۔ جیتنے والے پہلوانوں کو کنور صاحب کے والد انعامات دے کر اُن کی ہمّت افزائی کرتے تھے....

انھوں نے جوانی کے زمانے میں اپنے اکھاڑے کے پہلوانوں سے زور بھی کیے ہیں کُشتیاں لڑی ہیں، کُشتیاں لڑائی ہیں، دنگلوں کا انعقاد کیا ہے مقابلے کرائے ہیں منتظم بنے ہیں، منصف رہے ہیں، پہلوانوں کی سرپرستی کی ہے، آج بھی جب کبھی اُن سے ملنے جائیے وہ دو چار پہلوانوں میں گِھرے رہتے ہیں۔

کنور صاحب انڈین اسٹائل ریسلنگ ایسوسی ایشن آف انڈیا کے صدر، پنجاب باکسنگ ایسوسی ایشن کے جہاں صدر رہیں وہاں آرگنائزنگ سکریٹری ۱۷، ویں بین الاقوامی فری اسٹائل کشتی چیمپین شپ دہلی کی عزّت بھی انھیں حاصل رہی ہے۔ علاوہ عزیں دہلی اسپورٹس کاؤنسل کے ممبر کے طور پر، جو کچھ بھی پہلوانوں کی بہبود کے لیے کر سکتے ہیں آج تک کرتے چلے آ رہے ہیں۔

کنور صاحب کو پہلوانی کے علاوہ کبڈّی سے بھی بچپن سے ہی گہرا شغف رہا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے کبڈی کے بڑے زبردست مقابلے ہوتے تھے، دہلی میں میں نے خود ہوش سنبھالتے ہی دیکھا ہے کہ شہر دہلی میں بھی بہت سی ٹیمیں تھیں جن کے کئی کئی روز تک مقابلے

ہوتے تھے، یہ مقابلے رام لیلا میدان (شاہ جی کا تالاب) کشمیری گیٹ (نکلسن گارڈن) اور نئی عید گاہ (جھنڈے والان) میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ منعقد کرائے جاتے تھے۔
کنور صاحب کی ملازمت کا دور جنگِ عظیم فانی کا زمانہ تھا اور نیشنل وار فرنٹ کے دہلی میں انچارج کے طور پر اُن کو بہت سے فرائض سے عہدہ برا ہونا پڑتا تھا ان میں عوام سے رابطہ آپسی اتحاد و اتفاق، باہمی یگانگت و یکجہتی اور امن و انتظام کا کام سرفہرست تھا۔

دُنیا کے کھیلوں میں شطرنج کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے، ہندوستان میں تو قدیم ہی سے شطرنج کا کھیل کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے اس کا شوق شہنشاہوں، بادشاہوں راجوں، مہاراجوں، نوابوں، رئیسوں، امیروں اور یہاں تک کہ شوقین غریبوں کو بھی رہا ہے کنور صاحب کو چندے یہ شوق بھی ہے اور وہ اپنی زندگی میں جہاں بڑے بڑے شاطرانِ فن سے ٹکرائے ہیں وہاں شطرنج کے کھلاڑیوں سے بھی انھوں نے خوب زور آزمائی کی ہے۔
اپنی ملازمت کے زمانے میں انھیں دہلی کے اُن حضرات کے ہم صحبت رہنے کے بیشتر مواقع ملے تھے جنھیں شطرنج کا بے انتہا شوق تھا، ان میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے ان کے ساتھ کنور صاحب کی نشست و برخاست ہوتی۔ مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال رہتا۔ نت نئے موضوعات پر گفتگو کی جاتی، اس طرح شوق کا شوق اور کام کا کام ہو جاتا شطرنج سے یہ دلچسپی کنور صاحب کو آج تک ہے وہ اب بھی شطرنج کھیلتے ہیں اس کے میچ کراتے ہیں اور اُن کی سرپرستی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ دہلی کی شطرنج ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں۔

پتنگ بازی برّصغیر ہند و پاک کے باشندوں کا ایک محبوب مشغلہ ہے مغلیہ دورِ حکومت کے بعد بھی نوابانِ اودھ، رام پور، حیدر آباد اور دوسری بہت سی ریاستوں کے شہزادوں اور امراء اور رئیسوں وغیرہ نے جہاں پتنگ لڑانے کی نئی نئی باریکیاں، انوکھی چالیں، نرالے طریقے بانکے انداز اور تعجب خیز داؤ پیچ نکالے ہوئے ہیں۔ وہاں اس کی تقسیم لڑانا، ڈھیل دینا، رُخ لگانا، ہتھے پر سے اکھڑنا، کنّے کٹ جانا، ڈور مارنا، قلعہ کھلا دینا، چکّر دینا، چکرانا وال چپو ہونا، کھینچ کرنا، ٹھمکیاں چومنا اور کنکوے نے بازی کرنا بھی ایسی ایجاد کی ہوئی ہے کہ سُن کر لطف آجاتا ہے۔

بچپن سے ہی کنور صاحب کو اس شغل سے کافی دلچسپی تھی، انھوں نے پتنگ بازی کے اس مقابلے کے لیئے استادانِ فن کی صحبت میں رہے اور اس فن کے ماہروں کی اس قدر سرپرستی کی کہ وہ آج پورے ملک کے پتنگ بازوں کی انجمن کائٹ ورکنگ فیڈریشن کے صدر ہیں، یہی نہیں کہ کنور صاحب نے مذکورہ فنون کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بنا کر ان کی ترقی کے لیے کام کیا، ان کے علاوہ بھی ہمارے ملک میں اور بہت سے شوق اور مشغلے موجود ہیں جن پر اُن کی محبت بھری نظر رہی ہے۔ ان میں محرم، دسہرہ اور دوسرے بہت سے موقعوں پر پیش کیئے جانے والے پٹہ بازی کے کھیل اور ان کے مقابلے اور فینسنگ گیمز شامل ہیں، پٹہ کے ان کھیلوں میں تلوار بازی، نیزہ زنی، بانک، بیرنیٹی، بنوٹ اور لکڑی وغیرہ کے مقابلے بطور خاص ہوتے ہیں۔

جب ان کو اپنے دورِ ملازمت میں دلّی کی خدمت کا موقع ملا تو انھوں نے دلّی کے مختلف بٹیر بازی کے اکھاڑوں، اس کے فنکاروں اور خلیفاؤں سے بھی گہرا رابطہ پیدا کر کے اُن کی سرپرستی کی۔ ان کی تنظیم، تعمیر و ترقی کی باقاعدہ صورتیں پیدا کیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ فن زندہ رہا۔ کنور صاحب آج بھی بٹیر بازی سے متعلق کئی انجمنوں سے اس طرح وابستہ ہیں اور ان کی سرپرستی کرتے ہیں۔

غرضیکہ شطرنج سے لے کر شعر اور بٹیر بازی سے لے کر لطیفے بازی تک جتنی شریفانہ بازیاں ہو سکتی ہیں کنور صاحب ان سب کے دلدادہ اور سب کی خدمت پر آمادہ رہتے ہیں۔ ان بازیوں میں ایک بہت بڑی بازی یعنی عشق بازی کا تو ذکر رہ ہی گیا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کنور صاحب جیسا حسن پرست زندگی میں کبھی اس سے محروم رہا ہو گا جوانی ہی کیا زندگی کے کسی نہ کسی دور میں یہ بازی بھی اُن کی دلچسپی کا مرکز ضرور بنی ہوگی۔ دوستوں میں سے کچھ کے عشق کی پردہ داری "یادوں کے جشن" میں ہی کر دی ہے لیکن اپنے حادثۂ عشق و محبّت کی داستاں کو صاف بچا گئے تاہم دل یہ ہرگز نہیں مانتا کہ اُن جیسا عاشق مزاج شاہد باز رنگین طبیعت، نفاست پسند، جمال دوست، صنف نازک کو عزیز تر رکھنے والا بھر، شاعر اور غزل کا شاعر عشق بازی سے کیسے بچا رہ سکتا ہے۔ وہ اپنی زندگی

ہیں ضرور عاشق و معشوق صفت بن کر رہے ہونگے ورنہ انکے اسقدر گہرے تجربات، عورت کی نفسیات محبّت کے لطیف و نازک احساسات اور عاشقانہ جذبات کی بھنانات بھی کیوں ملتی ہے۔ یہ ساری باتیں اُن کی شاعری میں بکھری نظر آتی ہیں۔

کنور صاحب نے "یادوں کے جشن" میں اپنی شاعری کے آغاز کا بیان بھی کیا ہے اُن کے قول کے مطابق اُنھیں ساہی وال (پنجاب) کے گورنمنٹ پرائمری اسکول میں ایک مولوی عبدالحمید اردو پڑھاتے تھے جو نہایت مشفق و مہربان استاد تھے، کنور صاحب اُن سے بہت متاثر تھے اور کسی مہذّب، شائستہ اور اردو تہذیب کے علمبردار استاد سے کنور صاحب کا یہ پہلا سانحہ تھا جس نے کنور صاحب کو اردو سے محبّت کی طرف راغب کیا جب وہ چیفس کالج لاہور آئے تو یہاں بھی اُنھیں ایک اور معلم مولوی کرامت اللہ اور دوسرے استاد ہیڈ ماسٹر سید جلال الدین حیدر سے سابقہ ہوا، ان میں جلال الدین حیدر شاعر تھے، اس کالج میں شعر و شاعری سے دلچسپی انھیں کے دم سے قائم تھی۔ حیدر صاحب کبھی کبھی طرحیٔ مصرعہ دے کر مشاعرے کراتے تھے اور طلباء میں اچھے شعر کہنے والوں کو انعام بھی دے کر ان کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ اس ماحول میں کنور صاحب کو بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا اور اُن کے بیان کے مطابق انھوں نے مصرعہ طرح پر جو پہلا شعر کہا وہ یہ تھا۔

ذرا ہشیار رہنا دیکھنا دھوکہ نہ کھا جانا
حسینوں نے چھپایا آستینوں میں مار ہوتا ہے

۱۹۲۰ء میں جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے تو اُن کے ہم مذاق طلبا میں دیوان کیشنو داس عاقلؔ، رفیق بدرؔ اور کمال احمد طالبؔ کی صحبتوں میں اُن کے دن گزرے اور ان کے اس شوقِ شاعری کو مزید تقویت ملی۔ ۱۹۳۷ء میں جب گورنر پنجاب نے اُنھیں پی۔سی۔ ایس میں نامزد کیا اور اُن کا تقرر لائل پور میں ہوا تو یہیں سے اُن کے دورِ ملازمت کا آغاز ہوگیا۔ لائل پور سے ان کا تبادلہ رہتک ہوا، رہتک دہلی کے قریب ہونے کی وجہ سے اُن کا دلّی آنا جانا کثرت سے ہونے لگا اور یہاں کی محفلوں، افراد اور اہم شخصیتوں سے میل جول بڑھتا گیا، مقدر میں چونکہ دہلی کی خدمت لکھی تھی اس لئے اُن کا تبادلہ جون ۱۹۴۲ء

میں دہلی ہوگیا۔ دہلی میں تبادلے کے بعد نیشنل وار فرنٹ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے اور شہر کے دوسرے انتظامات کو انجام دینے کے لیے اُنھیں دہلی کی اہم و برگزیدہ ہستیوں، ہر مکتب خیال کے لوگوں اور جملہ علوم وفنون سے متعلق افراد میں کثرت کے ساتھ گھلنے ملنے کے مواقع ہاتھ آئے اُن کے اس دور کے معزز اور نامور احباب میں یوں تو بہت سے حضرات کے نام لیے جا سکتے ہیں لیکن خواجہ محمد شفیع دہلوی، خواجہ حسن نظامی، خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن، سردار بہادر سنگھ دھوبیا، مولانا ناصر جلالی، رائے بہادر لاڈلی پرشاد پیتا لعل جوہری، رائے بہادر ہریش جوہری، حاجی حافظ ظہور الدین، راؤ صاحب چودھری امراؤ سنگھ، علامہ گوپی ناتھ امن لکھنوی، سرشنکر لال اور لالہ مرلی دھر ساز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس دور کے مشہور ادبا اور شعرا میں استاد بیخود دہلوی، استاد مائل دہلوی، شاہد احمد دہلوی، شکیل بدایونی، جمیل الدین عالی، مجاز لکھنوی تخشب جارچوی صابر دہلوی، فیض جھنجھانوی، حکیم کیف، حبیب اشعر، نہال سیوہاروی، عاصی نظامی، آغا شاعر قزلباش، سید محمد جعفری، ظریف دہلوی حیدر علی دہلوی اور ماہر القادری کے نام بطور خاص لیے جا سکتے ہیں۔

دلّی کی ان فضاؤں میں کنور صاحب کے دوسرے مشاغل کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی پروان چڑھنے کے بیشتر مواقع مل رہے تھے، نیشنل وار فرنٹ، اپنے اغراض و مقاصد کی تشہیر و اشاعت کے لیے ہفتہ بھر کے پروگراموں کا بھی اہتمام کرتا تھا جس کے تحت دیگر دلچسپیوں کے علاوہ ہر روز ادبی پروگراموں میں مشاعرہ، کوی سمیلن اور کوی دربار بھی منعقد کیے جاتے تھے۔

انھیں بہت سے مشاعرے منعقد کرنے، شعر پڑھنے اور خواجہ محمد شفیع دہلوی کے زیر اثر مشاعروں کی نظامت کرنے اور یہاں تک کہ صدارت کرنے اور اپنی اردو دوستی، ادب نوازی و علم پروری کی وجہ سے وہ مقبولیت ملی کہ بقول اُن کے چاہنے والوں کے علاوہ حاسدوں کا بھی ایک گروہ پیدا ہوگیا جس کا یہ الزام تھا کہ کنور صاحب خود شعر نہیں کہتے

کسی سے کہلوا کر مشاعروں میں پڑھتے ہیں اس پر وپیگنڈے بازی میں دہلی کے دو پرانے پوسٹر باز خاص طور پر پیش پیش تھے، اپنے خلاف اس پروپیگنڈے کو بڑھتا ہوا دیکھ کر کنور صاحب نے اپنی کوٹھی واقع بولے وارڈ روڈ تیس ہزاری پر ایک بزم خاص کا اہتمام کیا جس میں تقریباً دو سو مہمان شریک ہوئے۔ خاطر تواضع کے بعد کنور صاحب نے اس نشست کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کیوں نہ فی البدیہہ مشاعروں کی داغ بیل ڈالی جائے اور اسی بزم میں جبکہ ارباب کمال بڑی تعداد میں ہیں ایک مصرع طرح دیکر فی البدیہہ شعر کہنے کی درخواست کی جائے۔ اس بزم میں نخشب جارچوی، شکیل بدایونی، ماہر القادری، خواجہ محمد شفیع جیسی ہستیوں نے اس کی تائید کی، فوراً ایک مصرع موزوں کرنا تھا لوگوں نے ایک ایک کر کے نت نئے بہانوں کے ساتھ کوٹھی پر سے کھسکنا شروع کر دیا اور دو سو میں سے صرف چالیس پچاس لوگ رہ گئے فی البدیہہ شعر کہے گئے اور دوسرے شعراء کے علاوہ کنور صاحب نے بھی شعر کہے اور پڑھے اور داد پائی اور ثابت کر دیا کہ حاسد کاذب ہیں۔

اہلِ دہلی کی خواہش پر ایک بار پھر اکتوبر ۱۹۴۷ء کے ہولناک دنوں میں کنور صاحب کو دہلی کے امن و انتظام کو دیکھنے کے لیے سِٹی مجسٹریٹ کے طور پر مقرر کیا گیا انھوں نے اپنے اثر و رسوخ، حکمتِ عملی اور ایک تجربہ کار سینیئر افسر کے طور پر دلّی کو مزید قتل و غارت گری اور تباہی سے بچانے میں خاص رول ادا کیا۔ کنور صاحب کی پہلی تقرری ۱۹۴۴ء کا زمانہ اگر دہلی کا دورِ بہار کہا جائے تو یہ دور دورِ خزاں سے کم نہ تھا، گویا کنور صاحب نے دہلی کے اتار چڑھاؤ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ دلّی والوں کے ساتھ وہ مسکرائے ہنسے اور روئے بھی۔ انھوں نے دلّی کے ہندو مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق ملی جلی محفلوں مشترکہ نشست و برخاست، دعوتوں و ضیافتوں کو بھی دیکھا انھیں ہم نوالہ و ہم پیالہ اور شیر و شکر بھی پایا اور پھر حالات بدلتے ہی ایک دوسرے کے خون کا پیاسا، ایک دوسرے کا دشمن اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہوئے بھی دیکھا لیکن وہ سب کو حافظ کا یہ پیغام دیتے رہے۔

حافظ گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

انھوں نے یادوں کا جشن میں دہلی سے اپنے قلبی لگاؤ کی وجوہات پر گہری روشنی ڈالی ہے اور اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ اپنی بات یہاں ختم کرتے ہیں۔

"دہلی ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا...... دہلی میں پُر مذاق اور مزاح کی صحبت میسّر تھی اور آخری بات یہ تھی کہ یہاں چھوٹے بڑے کا امتیاز نہ تھا۔"

لب لباب اس بات کا یہ ہے کہ کنور صاحب نے ۱۹۶۷ء سے اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کلچرل دلچسپیوں اور گوناگوں مشاغل کا مرکز دہلی کو بنایا ہوا ہے، اور دہلی کے مختلف ثقافتی اداروں سے کسی نہ کسی شکل میں گہری وابستگی رکھتے ہوئے بہت سے علمی وسماجی اور کلچرل انجمنوں کے سرپرست، صدر، ممبر اور اعزازی عہدہ دار کے طور پر بارہ مہینے کسی نہ کسی خدمت کو انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اِن انجمنوں میں وہ انسانی و آفاقی قدروں کے علمبردار کے طور پر بادشاہ خاں کی قائم کی ہوئی انسانی برادری کے قائم مقام صدر ہیں ــــــــــ انڈو پاک فرینڈشپ پرموشن سوسائٹی کے فاؤنڈر ممبر ہیں۔ یوتھ رائٹرز ایسوسی ایشن کے سرپرست اعلیٰ ہیں، ہند و پاک پریم سبھا کے بانی ہیں اور آل انڈیا ریڈیو اینڈ ٹی، وی اردو ایڈوائزری کمیٹی کے رکن ہونے کے علاوہ گورننگ کونسل غالب اکادمی کے ممبر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ٹرسٹی، بہادر شاہ ظفر میموریل سوسائٹی کے ممبر، چیرمین انڈین لٹریری فارم اور اردو اکادمی دہلی کے رکن ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی دوسری انجمنوں، اداروں، سنستھاؤں سے اُن کا کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق ہے۔

جہاں تک کنور صاحب کی شاعری کا تعلق ہے وہ نہ دقیق مضامین بیان کرتے ہیں نہ مشکل ترکیبوں کا استعمال ان کی عادت ہے، اُنھیں غیر ضروری منطق بوجھل اور اکتا دینے والی تشبیہیں بے جا لفظوں کی ٹھونس ٹھانس اور بھرتی کے اشعار کا شوق نہیں ہے اُن کے یہاں نہایت سادہ آسان، صاف سُتھری اور عام فہم زبان کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ ان کی شاعری خالص کلاسیکی انداز میں رچی ہے، وہ عشق کے روایتی بیان، ہجر و فراق کی داستانیں وفا و جفا کے قصّے بیان نہیں کرتے، اُن کے یہاں حیات و موت کی تلخیاں اس کی صداقتیں، لطیف و نازک باتیں اور زمانے کے سرد و گرم کے نقوش وغیرہ سبھی کچھ

موجود ہے۔

طلوع سحر کنور صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جس کی اشاعت جنوری سنہ ۱۹۶۲ء میں ہوئی تھی اب یہ نایاب ہے صرف ہارڈنگ میونسپل پبلک لائبریری دہلی سے ہی دستیاب ہو سکتا ہے اس کا انتساب کنور صاحب کے گہرے دوست آنجہانی پنڈت ہری چند اختر کے نام ہے۔ کنور صاحب نے احوالِ واقعی کے ذیل میں اپنے ہم صحبتوں بسمل سعیدی، نریش کمار شاد، گوپال متل، ساحر ہوشیار پوری اور مخمور سعیدی کا اس لیئے شکریہ ادا کیا ہے کہ انھوں نے طلوعِ سحر کے انتخاب کی کتابت طباعت اور دوسری زیب وزینت میں کنور صاحب کو تعاون دیا تھا ملک کی ادب نواز اور اردو دوست شخصیتوں سابق چیف کمشنر دِلّی شنکر پرشاد اور مرکزی حکومت کے ایک سابق اعلیٰ افسر شری وی شنکر کا شکریہ بھی اس لیئے ادا کیا تھا کہ وہ کنور صاحب کے سرپرست اور علم وادب کے سچّے خادم تھے۔

"طلوع سحر" اپنے نام کے اعتبار سے واقعی سحر کی شاعری کا طلوع ہے یہ تمام تر غزل کے اشعار پر مشتمل ہے اس میں آغاز سے سنہ ۱۹۶۲ء کے زمانے تک کا کلام شامل کیا گیا ہے اس میں آغاز سے سنہ ۱۹۶۲ء کے زمانے تک کا کام شامل کیا گیا ہے اس کے مطالعے سے سب سے پہلے تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ کنور صاحب کی سب سے پسندیدہ صنفِ شاعری غزل ہے، اُن کا گہرا رشتہ دِلّی والوں اور بالخصوص داغ اسکول سے زیادہ رہا جس کی جھلک اُن کے کلام میں غالب طور پر ملتی ہے۔ اس پر تو کہیں سے روشنی نہیں پڑتی کہ انھوں نے باضابطہ اپنا کلام کسی کو دکھایا ہے، حالات یہ بتاتے ہیں کہ وہ شروع ہی سے خودرو پھول کی طرح رہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ فیض جھنجھانوی اور چند دوسرے اساتذہ سے بھی کبھی کبھی اُنھیں مشورۂ سخن کا موقعہ ملا۔

کنور صاحب نے طلوع سحر کے بعد بھی غزلوں کے علاوہ بہت سی نظمیں اور کچھ دیگر کلام بھی کہا ہے لیکن غزل کو ان کی محبوب صنفِ سخن کا درجہ حاصل ہے وہ کہتے ہیں،

کبھی نالاں، کبھی خنداں کبھی گریاں ہو کر
ہم نے دیکھا ہے بہرحال غزل خواں ہو کر

غزل سن کر سحر کی اُس نے شوخی سے کہا ہنس کر
کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا معلوم ہوتی ہے

سوزِ الفت کی بدولت زندۂ جاوید ہوں
حسن کام آئے نہ آئے عشق کام آ ہی گیا

مایوس محبت ہے تو کر اور محبت
کہتے ہیں جسے عشق مرض بھی ہے دوا بھی

سجدہ و عشق میں ہے فرق اتنا
بندگی یہ ہے وہ خدائی ہے

کنور صاحب کے یہاں زندگی کے شدید تجربات اور گہرے مشاہدات کا عکس بھی کچھ اس صورت میں ملتا ہے کہ اُن کی واقعیت کی شہادت دینی پڑتی ہے ملاحظہ ہو۔

تا بہ کے شکوۂ فراق سحر
زندگی مستقل جدائی ہے

خزاں کے بعد چمن میں بہار آئی ہے
کہ موت بھی تو ضروری ہے زندگی کے لئے

ہر نفس آخری نفس ہے سحر
زندگی ایک مرگِ پیہم ہے

ان کے کلام میں دورِ حاضر کے حالات و واقعات کا عکس بھی بہت جگہ واضح طور پر نظر آتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ وہ وقت کے نبض شناس بھی ہیں مثلاً:

کسی ایک آدھ میکش سے خطا کچھ ہوگئی ہوگی
مگر کیوں میکدے کا میکدہ بدنام ہے ساقی

یہ بجا کہ گردشِ وقت ہے ابھی تیز گردشِ جام سے
ترے رند پھر بھی ہیں مطمئن ترے میکدے کے نظام سے

کنور صاحب کو زندگی بھر ایسے انسان کی تلاش رہی جسے انسانیت کے لیئے ایک آدرش ایک آئیڈیل اور ایک بے مثال نمونہ کہا جاتا ہے طلوع سحر میں بار بار اس کا ذکر مندرجہ ذیل انداز سے ملتا ہے ملاحظہ ہو۔

آدمی کل خدا سے ڈرتا تھا
اب خدا آدمی سے ڈرتا ہے

کڑوڑوں سال سے یوں تو ہے آدمی کا وجود
نگاہ اب بھی ترستی ہے آدمی کے لیئے

آدمی کا کچھ اعتبار نہیں
تم سحرؔ سے بھی دوستی نہ کرو

کنور صاحب مذہبی رواداری باہمی خلوص اور آپسی دوستی میں زیادہ یقین رکھتے ہیں اسی کو انسان اور انسانیت کی معراج مانتے ہیں اسی پر کامل ہیں اور اسی پر عمل آوری کی تلقین کرتے چلے آئے ہیں نمونہ ملاحظہ ہو۔

دیر و حرم کو چھوڑ بھی آگے نظر بڑھا
حد نظر ہے وسعتِ کون و مکان سے دور

حرم سے جو خلوص تھا وہی ہے دہر سے سحر
جبیں وہی ہے کیا ہوا جو آستاں بدل گیا

تجھ سے ہی آباد سحرؔ ہے مسجد بھی مے خانہ بھی
میرا دل اے شیخ و برہمن کعبہ بھی بت خانہ بھی

کنور صاحب کو زندگی میں تلخ و ترش حالات سے سابقہ بہت بار پڑا اس کی جھلک اُن کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس کس ادا سے خود کو زمانے کی تلخیوں، برائیوں اور مکر و فریب سے بچا پائے۔

جب نگہبان ہے خدا اس کا
پھر سحرؔ کب کسی سے ڈرتا ہے

نہ کینے نے نہ بغض و دشمنی نے
ہمیں مارا فریب دوستی نے
کون کسی کے دکھ کا ساتھی
اپنے آنسو اپنا دامن

کلامِ سحر میں رنگِ تصوّف اور شرب و شراب سے متعلق اشعار کی بھی کمی نہیں، تصوّف انھیں خاندانی ورثہ میں ملا اور وحدانیت کے تصوّر کی آمیزش نے اس میں کچھ اور ہی کیف و سرور پیدا کر دیا۔

یہ تم جانو کیوں مختار ہو تم
سنو ہم سے کہ کیوں مجبور ہیں ہم
تیری رحمت نے سنبھالا روزِ محشر ورنہ
ہم تو کچھ لائے نہ تھے دامنِ عصیاں کے سوا
گھٹا ہے باغ ہے مے ہے سحر ہے جام ہے ساقی
اب اس کے بعد جو کچھ ہے وہ تیرا کام ہے ساقی
تیری آنکھوں کی مستی کو سیہ مستی جو کہتے ہیں
تیری آنکھوں کی مستی میں سحر کی شام ہے ساقی
سحر جو نیک بندے ہیں خدا کے
وہ خود پیتے ہیں اوروں کو پلا کر
مطرباگیت ساقیا لا جام
زندگی لوٹ کر نہیں آتی
موسم گل ہوا گھٹا برسات
مے کشوں کے لئے پیام آیا
روک دے گردشیں زمانے کی
تیرے ہاتھوں میں جام ہے ساقی

مذکورہ مضامین سے قطع نظر کنور صاحب نے روایت کے زیر اثر ہی سہی لیکن بڑی خوبی کے ساتھ بہت سی حقیقتوں کو اپنے اشعار میں استعمال کر کے اپنے قادر الکلام ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے، اشعار ملاحظہ ہوں جن میں مذکورہ سب باتیں موجود ہیں۔

شوخیٔ شباب ناز تبسّم حیا کے ساتھ
دل لے لیا ہے آپ نے کس کس ادا کے ساتھ

اداسی، سرد آہیں کرب، حسرت درد مجبوری
محبّت تلخیوں کا ایک شیریں نام ہے ساقی

یک رنگی و یک سوئی، یک جہتی و یک جاتی
کہتے ہیں جنوں جس کو ہے اصل میں دانائی

لگا کے لالے یہ لے تو آیا ہوں شیخ صاحب کو میکدے تک
اگر یہ دو گھونٹ آج پی لیں ملے گا مجھ کو ثواب آدھا

کنور صاحب کے کلام کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں کم و بیش تمام مضامین بیان کئے ہیں اور وہ بھی بڑے حسین و لطیف پیرایۂ بیان کے ساتھ اور اس کا خود ان کو بھی احساس ہے:

وہ کہتے ہیں ۔ ترے اندازِ بیاں کا بھی سحر کیا کہنا
غیر غالبؔ کا تو انداز بیاں اور سہی

غزلوں، نظموں اور کچھ دوسری اصناف میں کہنے کے علاوہ کنور صاحب نے رباعیاں بھی کہی ہیں، مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے اس لئے صرف ایک قطعہ اور ایک رُباعی پر اکتفا کر کے ہم بات ختم کرنا مناسب سمجھیں گے۔

قطعہ

طور و موسیٰ، آتشِ نمرود، گلزار خلیل
باغ رضواں، حور و غلماں، حوض کوثر سلسبیل
یہ سبھی کچھ ہے مگر سچ تو یہ ہے میرے پرورد گار
کچھ مرا حُسنِ عقیدت کچھ تری ذات جلیل

رباعی

دل بغض و حسد سے کبھی رنجور نہ کر
یہ نورِ خدا ہے اسے بے نور نہ کر
نا اہل، کمینہ کی خوشامد سے اگر
جنّت بھی ملے تجھ کو تو منظور نہ کر

آخر میں یہ عرض کرتے ہوئے کہ کنور صاحب کا شاعری میں کیا مقام قائم کیا جا سکتا ہے اور انھیں اردو شاعروں کے کس زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے اس کا فیصلہ جہاں کلام سحر کے گہرے مطالعے سے ممکن ہے وہاں ارباب نقد و نظر کی گرانقدر رائے پر موقوف ہے۔

کنور صاحب کے مشاغل کی داستان بغیر اُن کے اشعار کا مطالعہ چاہے ہم کتنی ہی تنہائی میں کیوں نہ کریں دِل یہ کہے بغیر نہیں رہتا کہ ؎

یہ گفتگو، یہ لطف یہ رنگینیاں سحرؔ
تم سے ملے کہ ہم بھری محفل میں آ گئے

فکر تونسوی

ہمزاد سے گفتگو

فکر تونسوی۔ میرے پیارے ہمزاد! کیا تم دروغ بیانی کر سکتے ہو؟

ہمزاد ۔ میرے مقدر میں یہ کہاں؟ یہ بیش بہا دولت تو آپ ایسے دانش وروں کے نصیب میں ہے۔

فکر ۔ میرے نصیب میں تو تم بھی ہو۔ سوچا تھا، میری صحبت کا کچھ نہ کچھ اثر تو پڑا ہوگا۔

ہمزاد۔ پڑا ہے مگر اُس صدق وصفا کا، جو آپ کی شخصیت کے دبیز، گہرے پردوں میں چھپی رہتی ہے۔ موقع محل ملتے ہی میرے ذریعے اس کا اظہار ہو ہی جاتا ہے۔ مگر آپ مجھ سے پوچھنا کیا چاہتے ہیں۔

فکر ۔ تم قبلہ کنور مہندر سنگھ بیدی کو جانتے ہو۔

ہمزاد۔ جاننے کی بات بعد میں۔ پہلے بیدی صاحب کے ساتھ آپ نے جو لفظ قبلہ لگایا ہے، اسے کاٹ دیجئے۔

فکر ۔ نہیں، بیدی صاحب اس کا بُرا مانیں گے۔

ہمزاد۔ نہیں مانیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مرنجاں مرنج شخصیت ہیں۔ اور پھر دور بین بھی۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ یہ لفظ قبلہ، شرفا پرانے زمانے میں، شرفا کی خاطر شرفا کی طرف

سے استعمال کیا جاتا تھا، احترام اور عقیدت کے طور پر۔ لیکن آج کل جس زمانے سے آپ اور بیدی صاحب گزر رہے ہیں۔ اس میں قبلہ لفظ کا فقط رسمی مفہوم باقی رہ گیا ہے۔ معنوی مفہوم کو وہ حضرات ہضم کر گئے ہیں۔ جو ہضم کرنے کے باوجود اپنے آپ کو شرفا کہے جا رہے ہیں۔ عقیدت و احترام تک کرتے ہیں مگر یوں جیسے عقیدت و احترام پلاسٹک کا خوبصورت، ہفت رنگ کھلونا ہو۔

فکر ۔ تمہارا مطلب ہے، دورِ جدید میں شرفا کا وجود عنقا ہو گیا ہے۔ مگر میں تو اب بھی بیدی صاحب کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ لفظ قبلہ ہٹا بھی دوں۔ ہٹنے کے باوجود وہ قبلہ رہیں گے۔ بذاتِ خود الفاظ کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ شخصیت کی وقعت ہوتی ہے۔ جو الفاظ کو معنی عطا کرتی ہے۔

ہمزاد ۔ میرا خیال ہے کہ یہاں آپ نے دروغ بیانی سے اقرار کیا۔ میرا دعویٰ یہ ہے اور کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ کہ اصلی شرفا اب رہے ہی کہاں ہیں۔ ایک آدھ بیدی صاحب یا چند ایک اور۔ بیدی صاحب کو ماضی کے شرفا کی باقیات میں شمار کیجئے۔ ماضی کی کچھ اعلیٰ اور نفیس قدریں بھی تھیں جنہیں نجانے کیوں؟ بیدی صاحب ابھی تک اپنے اندر زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ نعرے بازی کے مردم کش دور میں بھی اپنے آپ کو زندہ رکھنا، ایک معجزہ ہے۔

فکر ۔ معجزے کی تشریح چاہوں گا۔

ہمزاد ۔ معجزہ یوں کہ جیسے آپ نے مارکسی جدلیات کو اپنا لازوال عقیدہ بنا لیا ہے ۔ اور گذشتہ تیس برس سے نہ آپ اس عقیدے سے رہائی پا سکے۔ نہ عقیدہ آپ سے رہائی پا سکا۔ ورنہ کئی مارکسی جدلیات کے عقیدے کے مدعی، سرمایہ دارانہ شکنجے میں پھنس گئے۔ اور بزعم خود خوش و خرم رہ رہے ہیں۔ اُن کے لیے وہ عقیدہ یوں تھا، جیسے تو، نہیں اور سہی، اور نہیں، اور سہی۔ مگر یہ آپ کا معجزہ ہے۔ کہ جس ایمان کو اپنایا اسے آخری دم تک اپنے اندر زندہ رکھا۔

فکر ۔ آخری دم تو ابھی آیا نہیں، ممکن ہے، آخری دم پر پلٹ جاؤں۔

ہمزاد ۔ مگر نہیں، آخری دم پر آپ کیا خاک مسلمان ہوں گے۔ آپ کی کیفیت تو یہ ہے کہ جیسے کہتے ہیں۔ کہ جو چالیس برس سے پہلے کیمونسٹ نہیں، وہ بے وقوف ہے اور چالیس برس کے بعد جو کمیونسٹ ہے وہ بھی بے وقوف ہے، مگر آپ کا معجزہ یا ٹریجڈی یہ ہے۔ کہ آپ دونوں قسم کی بے وقوفیوں کو بھگتا رہے ہیں۔

فکر ۔ ہمزاد میاں! آپ ہنسی مذاق میں مت ٹالئے۔ کہ میں آپ سے بیدی صاحب کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں۔ آپ نے میرا تذکرہ خواہ مخواہ بیچ میں گھسیڑ دیا۔

ہمزاد ۔ فکر میاں! آپ خواہ مخواہ نہیں آئے۔ آپ میں اور بیدی صاحب میں ایک اشتراک ہے، ایمان ایک ہے، راستے مختلف ہیں۔ بیدی صاحب ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو بیک وقت بڑا بھی تھا اور چھوٹا بھی۔ بیدی صاحب نے اُس خاندان میں تربیت پائی ہے جہاں انسان دوستی سرفراز رہی۔ معاشرہ انہیں اس لئے بڑا نہیں سمجھتا تھا۔ کہ ان کے پاس زر و سیم فراواں تھا۔ یا ان کے خاندان کے افراد بڑے بڑے بلند پایہ سرکاری عہدوں کے مالک تھے۔ بلکہ ان کا بلند ان کی وہ بلند پایہ اخلاقی قدریں تھیں۔ جن کی بدولت وہ ہر بنی نوع انسان کے ساتھ شائستگی سے پیش آتے تھے۔ انسان چاہے چھوٹا بھنگی چمار ہو یا کلرک یا کلکٹر۔ بیدی صاحب کے خاندان کے افراد کے مُنہ سے کبھی کسی کے بارے میں ایسا ناشائستہ لفظ نہیں نکلتا تھا۔ جس سے انسانیت مجروح ہو۔ ہاں ایسی شائستگی اور اخلاقی قدروں میں جب پرورش پائی۔ تو وہی بیدی صاحب کا بھی ایمان ٹھہرا۔ اور وہ اسی ایمان کے بل بوتے پر۔ ہر جگہ، ہر مجلس میں قابلِ احترام سمجھے جاتے ہیں۔ جب وہ ڈپٹی کمشنر تھے تو ہر دکھی اور حاجت مند کی تکلیف رفع کرنے میں انھیں مسرت ملتی تھی۔

فکر ۔ مسرت نے ان کی صحت پر خاصا اثر کیا ہوگا۔

ہمزاد ۔ صحت تو ان کی ماشاء اللہ ویسے بھی کافی قابلِ رشک ہے۔ مگر کچھ زیادہ قابلِ رشک بننے کے لیئے روزانہ صبح کی سیر میلوں تک کرتے ہیں۔ صبح کی سیر پر آپ بھی جایا کرتے تھے اور راستے میں وہ بڑے خوش گوار لہجے میں آپ سے گفتگو بھی کرتے تھے۔ اور

اطلاعاً عرض ہے، برامت مانئے گا۔ آپ تھک ہار کر صبح کی سیر ملتوی کر بیٹھے، مگر بیدی صاحب نے ابھی تک آداب سحر گاہی ترک نہیں کی۔ حالانکہ وہ آپ سے کئی سال زیادہ عمر کے ہیں۔ مگر آپ گوشہ نشینی ہیں اور وہ مجلسی ہیں۔

فکر ۔ آپ مجھے نادم کر دیجئے اور میں نادم ہو جاؤں گا۔ مگر لگتا ہے، بیدی صاحب بہت سی مجلسوں میں بڑی پُر وقار طرز ادا سے موجود ہوتے ہیں۔ تو اس کی وجہ ان کی خوش صحتی کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔

ہمزاد ہاں، بجا فرمایا مجلس اُنہیں خوش خرمی بھی عطا کرتی ہے اور خوش صحتی بھی۔ اور میرے خیال میں اس کی اہم وجہ اردو زبان کا فیض ہے۔ اس زبان سے انہیں جنوں کی حد تک عشق ہے۔ جس محفل میں اردو ادیب اور اردو ادب کا ذوق رکھنے والے موجود ہوں بیدی صاحب وہاں جاکر جیسے کھل اٹھتے ہیں۔ نہ صرف خود کھل اٹھتے ہیں بلکہ اپنی سوچ کی شگفتگی سے پوری محفل کو کِھل کھلا دیتے ہیں۔

فکر ۔ کیا اردو محفلوں کو شگفتگی اور زندگی عطا کئے جانا بھی ان کے ایمان میں شامل ہے ؟

ہمزاد ۔ ایمان ہوگا، مگر ایمان پر یہ اُن کا احسان نہیں۔ بلکہ اردو شعر و ادب کو ایک طرح کی شائستہ تہذیب سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ماحول کی بد قسمتی سے اردو زبان کو کئی کربناک محرومیوں کا شکار ہونا پڑا مگر بیدی صاحب کبھی کربناک نہیں ہوئے۔ جب بھی اور جہاں بھی مناسب اور موزوں موقع ملتا ہے بلکہ مواقع کو خود بھی موزوں بنانے کا فن انہیں آتا ہے لہذا اردو تہذیب میں سانسوں کی خوشبوئیں قائم رکھنے کے لئے بیدی صاحب کا دم غنیمت ہے۔ اگرچہ اغیار تو اس تہذیب کو ملیامیٹ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ مگر جونہی بیدی صاحب سامنے آئے، اغیار دُم دبا کر بھاگے۔

فکر ۔ کہیں آپ کا یہ مطلب تو نہیں کہ اُردو تہذیب اس وقت تک زندہ رہے گی۔ جب تک بیدی صاحب زندہ رہیں گے۔

ہمزاد ۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ بیدی صاحب لاکھوں برس زندہ رہیں گے۔ ان کی تازگی، پُر وقار مسکراہٹ، اور مسلسل چہل پہل تو یہی ظاہر کرتی ہے۔

فکر - ان فقروں میں ہماری محبت اور احترام زیادہ کار فرما نظر آتا ہے۔

ہمزاد - نہیں مجھے ان کا ہنگامہ خیز ماضی زیادہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اُف! وہ اردو تہذیب اور اس تہذیب کی کئی بلند پایہ اور تابناک شخصیتوں کے ساتھ کتنی ہی محفلوں اور مجلسوں میں سے گزرے ہیں۔ کہ ان کا وہ یادگار ماضی اور اب پھر یادگار حال بھی، ان کی شائستگی اور ہمدمی کے باعث واقعی لاکھوں برسوں سے بھی کئی لاکھ برس زیادہ بھاری ہے۔ مجھے تو اُن کا جہانِ فانی سے گزرنا کچھ مشکل نظر آتا ہے۔

فکر - مگر بیدی صاحب کے کچھ مخالف بھی ضرور ہوں گے۔

ہمزاد - مخالفت تو زندگی کی علامت بھی ہے اور تقاضا بھی۔ مگر یہ طلسم میں نے اکثر و بیشتر دیکھا ہے کہ ع

تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

فکر - معاف کیجئے، میرے خیال میں تو یہ مصرع ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق عرض کیا گیا تھا، بیدی صاحب کے متعلق نہیں۔

ہمزاد - اور آپ بھی معاف کیجئے! باری تعالیٰ کی اپنی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ کہ اُسے زمین پر کچھ ایسی ذاتیں بھی ارسال کرنا پڑتی ہیں۔ جو خود باری تعالیٰ نہ ہوں مگر اس کا عکس جمیل ضرور ہوں۔ بلکہ عکس جلال بھی۔ تاکہ وہ اُس کی مخلوق میں اس کے عکس میں وہ جلوے منعکس کر سکیں۔ جنہیں مخلوق اپنی کارکردگیوں سے غلیظ کر چکی ہو۔ آپ جانتے ہیں کہ بیدی صاحب مختلف مقامات پر بطور بیوروکریٹ تعینات کئے گئے تھے۔ اور اس تعیناتی میں باری تعالیٰ کی رضا شامل تھی۔

فکر - رضا تھی یا نہیں۔ مگر میں بیوروکریٹس کو معاشرے کا دشمن نمبر ایک سمجھتا رہا ہوں۔ دشمن نمبر ایک نہیں تو دشمن نمبر دو ضرور ہیں۔ جنھوں نے سماج میں گندگی پھیلا رکھی ہے۔ بیدی صاحب اس ہمہ گیر گندگی سے بچ نہیں سکتے۔

ہمزاد - شاید آپ بھی بجا فرماتے ہیں۔ لیکن پیارے! کچھ استثنیات بھی ہوتی ہیں۔ ارسطو نے یا شاید ایسے ہی کسی فلاسفر نے ایک مرتبہ کہا تھا ـــــ بادشاہ وہی کامران

ہوتا ہے جو نیک نفس بھی ہو اور بہادر بھی ہو۔ بیدی صاحب میں بھی کچھ ایسی ہی بادشاہت کار فرما تھی۔ وہ مختلف شہروں میں حکومتی کاروبار کے تلخ فرائض سرانجام دیتے رہے۔ کہیں سٹی مجسٹریٹ، کہیں مال افسر اور کہیں ڈپٹی کمشنر۔ اور اس زمانے میں جب معاشرہ اپنے آپ کو بگاڑنے پر تلا ہوا تھا۔ مگر وہ جو نیک نفس اور بہادری ان کے باطن میں تھی۔ وہ باری تعالیٰ کی دین تھی۔ اُف! وہ ان حکومتی فرائض کے دوران ہزاروں جاں گسل واقعات میں سے گزرے۔ مگر ہمیشہ ہنستے ہوئے گزرے پیشانی پر آنچ تک نہیں آنے دی۔

فکر ۔ تعریف وتحسین کچھ زیادہ ہوگئی۔ قدرے کم ہونی چاہیئے۔ بہرکیف وہ انسان ہیں، خدا تو نہیں ہیں۔

ہمزاد ۔ خدا بننے کا دعویٰ انھوں نے کبھی نہیں کیا۔ مگر خدا کی مخلوق میں وہ ہر انسان کو بابرکتی عطا کرنے کی خصلت رکھتے ہیں۔ مخلوق کئی محرومیوں، بدبختیوں، مضحکہ خیزیوں حتیٰ کہ شیطنت تک کا شکار رہتی ہے اور رہی ہے۔ مگر اس کے باوجود خلق خدا کی حتی الوسیع خدمت کرنا ان کا شیوہ رہا ہے ـــــ یہ اور بات ہے کہ جو انسان اس خدمت کے اہل ثابت نہ ہو سکے۔ بیدی صاحب خاموش ہو گئے اگرچہ خاموشی میں بھی یہ سوچتے رہے بلکہ دعا کرتے رہے۔ کہ خدا پھر بھی ان کا بھلا کرے۔

فکر ۔ مگر ایک بیوروکریٹ کے لئے بگڑتے معاشرے سے "نبٹتے" رہنا کافی مشکل کام ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے۔ بیدی صاحب بھی اس کی تصدیق کریں گے۔

ہمزاد ۔ تصدیق؟ میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کہ جب خود ان سے کوئی گستاخی ہوئی۔ تو اسٹیج پر معذرت طلب کر لی۔

فکر ۔ بیوروکریٹ کبھی معذرت طلب نہیں کرتے۔ وہ اسے اپنا ہیٹا پن سمجھتے ہیں۔

ہمزاد ۔ آپ شاید دورِ حاضر کے بیشتر بیوروکریٹس کی باتیں کر رہے ہیں۔ مگر بیدی صاحب بیوروکریٹ ہونے کے باوجود بیوروکریٹ نہیں تھے۔ اور یہ بیوروکریسی کی ٹریجڈی ہے کہ ان کے درمیان ایک ایسا انسان بیوروکریٹ بن گیا۔ جو ہندو، مسلمان، سکھ،

عیسائی سنھوں کے مذہبوں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا تھا، صدق وصفا کی نگاہ۔
ارے صاحب! وہ تو ایک چور اور ڈاکو کے درمیان بھی انسانیت کے گوشے ڈھونڈ لیتا تھا۔

فکر - جادوگری کرتا ہوگا۔

ہمزاد وہ ماہر نفسیات تھا، معاشرے کے غصّے، حسد، نفرت، خودغرضی کی تہوں میں پہنچ کر فیصلے کرتا تھا۔ کیوں کہ وہ نیک نفس بھی تھا اور بادشاہ بھی۔ اور ان دونوں کا ایک ساتھ جمع ہونا اگر جادوگری ہے تو بیدی صاحب واقعی جادوگر تھے۔

فکر - مگر اس جادوگری اور ماہر نفسیات کے باوجود کبھی کبھی مایوس بھی تو ہوتے ہوں گے۔

ہمزاد - کیوں نہیں ہوتے۔؟ مگر صبر وقناعت کی دولت ان میں بے پناہ ہے۔ خوش دلی اور خوش گفتاری کی بدولت اس مایوسی کا کبھی اظہار نہیں ہونے دیتے۔

فکر - مگر مایوسی کوئی معمولی طاقت نہیں ہوتی۔ آسانی سے دبتی بھی نہیں۔

ہمزاد - دب سکتی ہے۔ کیوں کہ ان کے پاس ایک کارآمد ہتھیار ہے۔

فکر کونسا؟

ہمزاد - اردو شاعری۔ شعرا کی مجالس، اور شعر کے توسط سے وہ اپنی اس یاسیت کا اظہار کر دیتے ہیں۔

فکر - ہاں، البتہ شعریت ایک اعلیٰ صنف ہے۔ مگر میں نے اسے ترک کر دیا ہے۔

ہمزاد - جبھی تو آپ جلدی یاسیت کا شکار ہو گئے۔ جب کہ بیدی صاحب میں آج بھی ستّر سال کی عمر میں بھی تر و تازگی ہے۔ ان کا ایک شعر سنئے۔

پھول کے برسانے والے بیٹھے ہیں مُنہ ڈھانپ کے اپنا
اب تو دیکھا یہ جاتا ہے کانٹے کون چبھو سکتا ہے

ذہین نقوی

غریب نواز۔ کنور صاحب

حضرت باباگورونانک دیوجی کی سترہؔ ویں پشت کے منور چراغ، سربابا کھیم سنگھ جی بیدی کے پوتے اور بابا ہردت سنگھ جی بیدی کے فرزند کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ شرافت نسبی کے ساتھ بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ وہ ایک ملنسار اور مرنجاں مرنج انسان ہونے کے ساتھ ساتھ وحدانیت کے پرستار، امن و آشتی اور اخوت و محبت کے پیکر ہیں۔ دوست نوازی اور دل نوازی کے باعث وہ اپنی ذات میں ایک انجمن کا درجہ رکھتے ہیں اور 'وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے'، اس قول کی پوری تفسیر ہیں۔ ان میں سادگی بھی ہے اور رنگینی بھی اور اُن کے اندازِ عمل میں ایک مخصوص طرحداری نظر آتی ہے۔ انسان دوستی اور احترامِ آدمیت ان کا شعار ہے۔ اُردو کے آفاقی شاعر مرزا غالب کی طرح صلحِ کُل ان کا مسلک ہے۔ ملی جلی تہذیب اور اردو ثقافت کا وہ ایک پروقار نمونہ ہیں جس پر بجا طور پر ناز کیا جا سکتا ہے۔

طرح طرح کے مسائل اور حالات کے نشیب و فراز کے باوجود دل داری و پاسداری کے ساتھ ان کی دنیا میں حُسنِ عمل کے پھول کھلتے رہتے ہیں اور ان سے مل کر ذوق و شوق کی بھینی بھینی خوشبو کا احساس ہوتا ہے۔ ہر طبقہ اور ہر مکتبۂ فکر کے لوگ

ان کا احترام کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی سب کے ساتھ عزّت و رواداری سے پیش آتے ہیں۔

اُن کے شب و روز، اُن کی اپنی نجی مصروفیات اور ذاتی دلچسپیوں کے علاوہ خدمتِ خلق کی خاطر ـــــ سماجی فلاح، شعر وادب کی ترویج، مشاعروں، محفلوں اور جلسوں کے انعقاد، ان کی ترتیب وتنظیم یا نظامت وصدارت، مختلف کھیلوں اور فنون سے دلچسپی، مستحق لوگوں کی حوصلہ افزائی، حاجت مندوں کی ممکنہ حد تک حاجت براری اور مختلف ادبی، سماجی، فلاحی، اور مذہبی اداروں کی سرگرمیوں میں شرکت کے لیئے وقف ہیں اور بلا تفریقِ مذہب وعقیدہ حتی الامکان سب کی خدمت کے لیئے مستعد رہنے کے ساتھ "جیو اور جینے دو" کے اصول پر کاربند ہیں۔

عقیدہ کی پختگی اور پابندِ وضع سکھ ہوتے ہوئے بھی سیکولرازم پر یقین، اُن میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ زمانہ کی رفتار اور تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے باہمی رشتوں اور یگانگت کی پائداری کے لیئے شوشل ازم کے حامی ہیں۔ مساوات اور خوش گوار سماجی ماحول کے لیئے جمہوریت پسند ہیں اور ملک کو عدل وانصاف اور یکجہتی سے مالا مال دیکھنے کے آرزومند ہیں نیز قومی بیداری اور سیاسی شعور کو ملک کی بہتری اور جمہوریت کی بقا کے لیئے از بس ضروری خیال کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ جس طرح ہمارا ملک مختلف نسلوں، تہذیبوں، عقیدوں اور زبانوں کے فرق کے باوصف ماضی کی تہذیبی توانائیوں اور دورِ جدید کی ترقی پسندانہ سرگرمیوں، ترقیاتی منصوبہ بندیوں اور امن پسندی کے رجحانات پر عمل پیرا ہونے کے باعث مذاہب نظریات، اور ثقافت ومعاشرت کے دل افروز تنوع کے ساتھ خوش نظم کیفیات، اور اعلیٰ قدروں کا ایک دلکش مرکز نظر آتا ہے۔ اسی طرح "یادوں کا جشن" کے مصنف مشہور شاعر وادیب، خوش سلیقہ منتظم اور ہند و پاک دوستی کے علمبردار کنور صاحب بہت سی دشواریوں اور مشکلات کے ہوتے ہوئے بھی باہمی اعتماد کے لیئے اثر آفریں خیالات، فرقہ واریت کے استیصال کے لیئے بامقصد اقدامات اور وطن دوستی و قومی استحکام سے متعلق کاموں

میں شریک رہتے ہیں اور شعری تخلیقات اور تقریروں کے ذریعہ مذہبی اجتماعات، ادبی جلسوں مشاعروں، کلچرل پروگراموں اور کبھی کبھی سیاسی اسٹیج سے بھی ملک کی تعمیر و ترقی اور ہم آہنگی کے لیئے سعی کرتے ہیں۔ اُن کی گفتگو مختصر مگر دل نشین ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وطن سے محبت اور وطن کی سالمیت انھیں بے حد عزیز ہے۔ وہ اپنے فطری میلان، ذہنی رغبت اور شعور و ولولہ کے اعتبار سے ایک قابلِ دید تنوع کے حامل ہیں۔ اس باب میں فکر و تصور اور اُفتادِ طبع کے طور پر مرزا غالبؔ کا یہ شعر اُن پر صادق آتا ہے ؎

وہی اک بات ہے جو یاں نفس، واں نکہت گُل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے میری رنگیں نوائی کا

جہاں تک کنور صاحب کے عام مزاج اور اخلاق کا تعلق ہے وہ لڑکپن سے ہی بھولے، نرم مزاج، خوش باش، خوش گفتار، سہولت پسند، ناگوار باتوں کو برداشت کرنے والے اور غصّہ کو پی جانے والے رہے ہیں۔ نہایت مالدار، جاگیردار خاندان کے چشم و چراغ ہونے کی وجہ سے اُن کی ابتدائی زندگی ہر چند کہ بہت ناز و نعم اور عیش و عشرت میں گزری لیکن مذہبی ماحول اور اچھی تعلیم و تربیت کے باعث وہ ان برائیوں سے بڑی حد تک محفوظ رہے جو بالعموم متمول گھرانوں کے بچوّں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

چھوٹوں کے ساتھ وہ شفقت فرماتے ہیں اور بزرگوں کی واجب تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ اس اصول پر بچپن سے ہی وہ عمل پیرا ہیں اس لیے کہ انھوں نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی سلوک کرتے ہوئے دیکھا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ دوست ہو یا دشمن کسی کو وہ ایذا نہیں پہونچاتے۔ ہر معاملہ میں افہام و تفہیم کو ترجیح دیتے ہیں۔ فطری طور پر وہ دوستی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ محبّت اور بے تکلفی سے پیش آتے ہیں اور ان کی محفل میں لطیف طنز و مزاح سے بھی خوب خوب کام لیتے ہیں۔ دلچسپ واقعات اور لطائف بڑے شوق سے سُناتے ہیں۔ دوستوں کے دکھ درد میں بھی شریک رہتے ہیں اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ دوستی میں کسی طرح فرق نہ آئے۔ دوستوں پر بقول

مرزا غالبؔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ؎

؎ 'کرتے ہیں محبّت تو گزرتا ہے گمان اور'

مذہب کے سلسلے میں کنور صاحب راسخ العقیدہ ہیں۔ انھیں خدا کے وجود پر مکمل اعتقاد و اعتماد ہے۔ انھیں یقین ہے کہ کوئی قوت ایسی ہے جو کائنات کے تمام نظام کو چلا رہی ہے اور وہ خدا ہے جس کے وجود کو تسلیم کرنے میں عقل اور عقیدت دونوں سے مدد لینی پڑتی ہے اور اس کے وجود پر کامل یقین ہی مذہب کی اساس ہے۔ جہاں تک خدا کے جود و کرم کا تعلق ہے اس پر اہلِ عرفان و ایمان تو در کنار، بے سواد افراد بھی اعتماد رکھتے ہیں۔

دل کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے مگر کنور صاحب کی شکل سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اُن کو جمالِ مذہب سے کس قدر محبّت ہے کہ جس پر حسنِ صورت کو نثار کر دیا ہے۔ ان کے عقیدہ اور مذہب پسندی کے بارے میں جناب رئیس امروہوی نے لکھا ہے "وہ اپنے جدِّ بزرگ بابا گورو نانک جی کی طرح ہمہ اوست کے ترجمان، ہمہ از اوست کے راز داں، وحدالوجود کے مسلک پر عامل اور ہر مذہب و ملت کے مُحِب اور محبوب ہیں۔"

اسلام سے کنور صاحب کو محبّت ہے۔ رسولِ اکرم سے اُنھیں عقیدت ہے۔ حضرت علیؓ کے ثنا خواں ہیں۔ حضرت امام حسینؓ کے پرستار ہیں۔ مہاتما گوتم بُدھ اور شری رام چندر جی کا انہیں بے حد احترام ہے۔ شری کرشن جی کی گیتا سے وہ فیض حاصل کرتے ہیں اور حضرت عیسیٰ مسیح کے صبر و استقلال سے درس لیتے ہیں۔ ان مذہبی پیشواؤں کے سلسلے میں وہ فرماتے ہیں ؎

؎ مردانِ پاکباز تھے عابد تھے نیک تھے نانک مسیح کرشن محمدؐ سب ایک تھے

سکھ ہونے پر کنور صاحب کو فخر ہے لیکن اس کے ساتھ دوسرے مذاہب کی نسبت وہ اسلام سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے قریب رہنے کا انھیں زیادہ موقع ملا۔ اس کے علاوہ اُن کا خیال ہے کہ سکھوں او مسلمانوں کے عقائد بھی بہت ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً سکھ بھی مسلمانوں کی طرح موحد ہیں۔ بت پرستی کو حرام

جانتے ہیں اور توکل کے مسئلہ پر محکم اعتقاد رکھتے ہیں۔

اسلام کی عظیم شخصیتوں میں کنور صاحب مولائے کائنات حضرت علیؓ کا ذکر بڑے افتخار سے کرتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ علم و دانش، صبر و شجاعت اور ایثار و قربانی میں وہ حضرت علیؓ اور حضرت امام حسین ہی لاثانی ہیں۔ ہر مشکل اور ہر مقابلے میں وہ حضرت علیؓ کو یاد کرتے تھے۔ اس عقیدت میں وہ مرزا غالبؔ کے ہم خیال ہیں (قدرے ترمیم کے ساتھ) ؎

؎ اُس سے اُلفت ہے مجھے میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے گنبدِ بے در کھُلا

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے سلسلے میں کنور صاحب بہت کشادہ دل ہیں۔ تمام مذاہب کی قدر کرتے ہیں اور دوسروں کی دل آزاری، کو گناہ جانتے ہیں۔ مذہب اور وطن کے معاملے میں وہ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ اس شعر پر پورا یقین رکھتے ہیں ؎

؎ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستان ہمارا

اخلاق اور آداب سے آراستہ، کنور صاحب کی شخصیت بڑی پہلو دار ہے اور حالات و زمانہ کے تغیرُ و تبدُل کے ساتھ ان کی دلچسپیاں اور مشاغل بھی مختلف اور متضاد قسم کے رہے ہیں لیکن ان کی وضع قطع، ان کے عقیدے، ان کے لباس اُن کی گفتگو، اُن کی نشست و برخاست، اہم شخصیتوں سے روابط، احباب سے تعلقات، ملاقات کے لئے آنے والوں سے حسنِ سلوک اور ان کی طبیعت اور قول و فعل میں وضع داری برابر قائم رہی ہے اور ان کی شخصیت کا یہ پہلو بہت دل آویز ہے۔ انھیں زندگی سے پیار رہا ہے اور شرافتِ قلبی کے ساتھ زندہ دلی پوری شان کے ساتھ ان میں نمایاں ہے جو فی الواقع بہت متاثر کرتی ہے اور طرح یقینی طور پر میل محبت میں اضافہ ہوتا ہے جو عقل کا نصف حصہ

سمجھا جاتا ہے۔

یہاں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ پالنے والا اُن خدمت کرنے والوں کی قدر کرتا ہے جو ستایش کی تمنا اور صلہ کی پروا کئے بغیر فیض رساں ہوں۔ اس طرح کی خدمتِ خلق کو عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی ایک توفیق ایزدی ہے کہ کنور صاحب کو حاکمانہ دور میں بھی اور ریٹائر ہوئے کے بعد بھی اہلِ حاجت مجبورِ غرض، اور طالب شفارش، غرض ہر قسم کے لوگوں کی خدمت کرنے کا کے بہت سے مواقع ملے اور یہ سلسلہ اب بھی برابر جاری ہے۔ کنور صاحب اپنی بساط کے مطابق دوسروں کی بھلائی میں پیش پیش رہتے ہیں اور جو خدمت ممکن ہو سکتی ہے، دل سے کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی کام اس نوعیت کا ہوتا ہے جو وہ نہیں کر پاتے یا کسی کام میں کوئی کمی رہ جاتی ہے تو انہیں بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ اُن کی دلی ہمدردی اور مخلصانہ جذبۂ خدمت کے باعث اکثر طالبان امداد و اعانت انھیں غریب نواز کنور صاحب کہتے ہیں۔

ڈاکٹر شارب ردولوی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کے شخصی مرثیے

اُردو میں شخصی مرثیہ نگاری کی روائت بہت قدیم ہے۔ تقریباً ہر زمانے میں شعراء نے اپنے عزیزوں دوستوں اور اہم ادبی و تاریخی شخصیتوں کے انتقال پر مرثئے لکھے ہیں۔ یہ مرثیئے مرنے والے کی علمی، ادبی اور تاریخی اہمیت شاعر سے تعلقِ خاطر کے بیان اور اظہارِ غم کے لئے لکھے گئے ہیں، لیکن صنف مرثیہ گوئی میں انہیں وہ اہمیت نہ حاصل ہو سکی جو تمام دہائیوں کو ہے، اس کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔

پہلا یہ کہ ان مرثیوں میں عام طور پر غم کے اظہار کی سطح ذاتی ہوتی ہے اور اگر ذاتی نہیں بھی ہے تو وہ کوئی گہرا یا دیرپا اثر نہیں چھوڑتے۔ جس طرح رفتہ رفتہ وقت کے صفحے پر اُس شخص کی تصویر دھندلی ہوتی جاتی ہے، اس مرثیے کا اثر بھی ختم ہوتا جاتا ہے۔ غم کا معاملہ بہت نفسیاتی ہے۔ اس کا تمام تر انحصار تعلقات کی نوعیت اور قربت پر ہے، جو جتنا قریب ہے اور جس سے جتنے گہرے تعلقات ہیں۔ اُس کے انتقال کا اتنا ہی گہرا اور دیرپا اثر ہوگا۔ اگر کسی شخص سے ذاتی مراسم یا اُس کی علمی و ادبی یا سیاسی و قومی خدمات سے براہِ راست یا نظریاتی تعلق نہیں ہے تو اس کا غم ایک اچھے انسان کے کم ہو جانے کی سطح سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ اس لئے ایسی نظموں کا اثر ایک خاص حلقے اور ایک خاص زمانے تک محدود رہتا ہے۔ اُس کے علاوہ اپنی ذاتی نوعیت کی وجہ سے عام طور پر یہ مرثیئے اظہارِ تعزیت سے آگے نہیں بڑھتے۔

دوسرے ادبی اظہار کا معاملہ ہے۔ شخصی مرثیے بالعموم وقتی اظہارِ جذبات اور فوری تعزیت کے لئے لکھے جاتے ہیں، اس لئے ان میں اظہار و بیان کے حسن کی طرف توجہ کم دی جاتی ہے۔ اُسکے علاوہ

ایسی نظموں میں عام طور پر واقعہ یا سانحہ تخلیقی تجربہ نہیں پاتا اور جب تک کوئی واقعہ تخلیقی تجربے کی شکل نہ اختیار کرلے اس میں وہ اثر پیدا نہیں ہوتا جو اُسے اپنے زمانے یا عہد کے بعد بھی زندہ رکھ سکے۔

عارفؔ کا انتقال غالبؔ کے لئے قطعی طور پر ایک ذاتی سانحہ تھا لیکن انہوں نے جس انداز سے عارفؔ کا مرثیہ لکھا وہ صرف ذاتی اظہارِ غم نہیں تھا بلکہ تخلیقی تجربہ تھا، جس نے عارف کو جوانمرگی کی علامت بنادیا۔ آج کسی نوجوان کے مرنے کی خبر سُنائی دے، فوراً یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارفؔ
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور،

اسی طرح اقبالؔ کے لئے اُن کی والدہ کا انتقال ایک ذاتی نقصان اور کمی کی بات تھی لیکن اُن کا مرثیہ، والدۂ مرحومہ کی یاد میں، ایسی نظم ہے، جس کے پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ انگلیاں نظم کے اوراق نہیں پلٹ رہی ہیں بلکہ فلسفۂ حیات و ممات اور رموزِ کائنات کے ورق پلٹ رہی ہیں۔

وہ شخصی مراثی جو عزیزوں کے انتقال کے بجائے کسی بڑی ادبی یا سماجی شخصیت کے انتقال پر لکھے گئے، اُن کی بھی یہی نوعیت ہے۔ حالیؔ کا مرثیہ غالبؔ، اقبالؔ کا مرثیہ داغؔ، چکبستؔ کا مرثیہ گوپال کرشن گوکھلے، بال گنگادھر تلک، بشن نرائن درؔ، یا بعد کے شعراء میں مجازؔ کا مرثیہ گاندھی جی وغیرہ اردو کے بہترین شخصی مراثی ہیں۔ اُن میں نہ صرف یہ کہ مرنے والے کی شخصیت کی جامع تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ اور اُن کے انتقال سے ادب، سماج یا ملک کی قومی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا، وہ پوری فنی مہارت اور اثر انگیزی کے ساتھ سامنے آتا ہے بلکہ اظہار میں اُن کا تخلیقی تجربہ شامل ہے۔ جس کی وجہ سے ایک زمانہ گذر جانے کے باوجود اپنے حسن اور اثر انگیزی کی وجہ سے یہ نظمیں اردو شاعری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

اُردو کے شخصی مراثی کی روایت کو آگے بڑھانے میں عصر حاضر کے شعراء نے بھی اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ جن میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا نام بہت اہمیت رکھتا ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے کون ایسا شخص ہوگا جو واقف نہ ہو اور اگر واقعی ایسا کوئی شخص ہے تو اُس کے لئے یہی کہنا پڑے گا ؎

افسوس! تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ایسے خلیق، مخلص، محسن اور وضع دار انسان ہیں کہ آج کے کاروباری دور میں ان جیسا کوئی شخص ملنا مشکل ہے۔ وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ دوسروں کے جذبات کے احترام، انکساری، مذہبی رواداری اور خاکساری ہیں وہ درویش اور کسی مشکل میں مدد، بخشش و عطا اور تواضع میں حاتم سے کم نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف شاعر کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک مخلص و محسن اور درویش صفت انسان کی حیثیت سے بھی ہر حلقے اور طبقے میں مقبول ہیں، اُن کے تعلقات کا حلقہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں شاعر، ادیب، صوفی، سیاست داں، سفیر اور حکام ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ مثلاً اُن میں ایک طرف جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، مجاز، ساغر نظامی اور بسمل سعیدی ٹونکی وغیرہ اور دوسری طرف پنڈت نہرو، اندرا گاندھی، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، مولوی عبدالحق اور دوسرے سماجی و قومی رہنماؤں کے نام نظر آتے ہیں۔ اسی تعلق اور قربت کی وجہ اپنے عہد کی بیشتر شخصیتوں کے انتقال پر انہوں نے تعزیتی نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کی خوبی یہ ہے کہ اُن میں صرف رسمی تعزیت یا وقتی جذبے کا اظہار نہیں ہے بلکہ اُن کی خدمات اور ادبی و قومی اہمیت کا پُر اثر اعتراف ملتا ہے۔

پنڈت نہرو ہمارے ملک کے پہلے وزیر اعظم ہی نہیں تھے بلکہ اپنے تدبّر، دور بینی، وسیع النظری، کشادہ دلی، حسنِ اخلاق اور وضع داری میں آپ اپنی مثال تھے۔ وہ اپنے عہد کے مقبول ترین رہنما تھے۔ وہ ایک ہی وقت میں بہترین مدبّر، بہترین ادیب اور اعلیٰ تہذیبی اقدار کے سرپرست تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے انھیں قریب سے دیکھا تھا۔ اُن کے انتقال سے ملک و قوم کو جو نقصان ہوا اس کو اسی شدّت سے انہوں نے محسوس کیا۔ اُن کے انتقال پر انہوں نے جو مرثیہ لکھا ہے وہ اُن کی دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ اُس کے چند بند ملاحظہ کیجیے ؎

زینتِ دشت و دمن رونقِ پروانہ گیا — جس پہ ذی ہوش بھی قرباں تھے وہ دیوانہ گیا
شیشہ و ساغر و مے ساقی و پیمانہ گیا — وائے تقدیر کہ میخانے کا میخانہ گیا
رند و زاہد کے لئے مرکزِ ایمان تھا وہ
وہ فرشتوں سے بھی بڑھ کر تھا کہ انسان تھا وہ

مبنعِ نور، چراغِ رخِ زیبا نہ رہا — جانِ دل، جانِ نظر، جانِ تمنا نہ رہا

الم و رنج کا صد حیف مداوا نہ رہا — جس کے بیمار سبھی تھے، وہ مسیحا نہ رہا،

زخمِ دل، چاکِ جگر جا کے دکھائیں کس کو

قصۂ درد سنائیں تو سنائیں کس کو

امنِ عالم کے پجاری غمِ دوراں کے نقیب — تیرے دامن میں سکوں پاتے تھے محتاج و غریب

نہ کوئی تیرا مقابل نہ کوئی تیرا رقیب — کس نے پایا یہ مقدر، یہ ستارہ، یہ نصیب

سب میں رہتا تھا مگر سب سے جدا لگتا تھا

اور بت ہوں گے مگر تو تو خدا لگتا تھا،

ہندوستان کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے اور دنیا کے سیاسی و اقتصادی نقشے میں کتنی ہی اہمیت کیوں نہ اختیار کرلے، پنڈت نہرو کو فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ ایک عظیم دانشور اور امنِ عالم کے پیغامبر تھے۔ ایسے لوگ کم ہوں گے جو دنیا کے مدبروں اور دانشوروں میں بھی مقبول ہوں اور عوام کے دلوں پر بھی راج کرتے ہوں۔ پنڈت نہرو اِن میں سے ایک تھے جس کا اظہار کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے اِن الفاظ میں کیا ہے ؎

یہ تیرا کوہ ہمالہ، یہ تیرے گنگ و جمن — یہ تیرے باغ یہ چشمے یہ تیرے سرو سمن

یہ تیرے کھیت یہ دہقاں یہ تیری دشت و دمن — سب میں رقصاں تھا ترا پیکر تیری حبِّ وطن

یوں تو کہنے کو ترے سر پہ کوئی تاج نہ تھا

کون سا دل تھا مگر جس پہ ترا راج نہ تھا،

ملک کی آزادی کی جدوجہد میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمات تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں لیکن اُن کا ایک بڑا کارنامہ جدید ہندوستان میں تعلیم کو نیا رُخ دینا ہے، جسے کوئی شخص فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ ایک بے غرض اور بے لوث انسان تھے جو زندگی کے آخری لمحہ تک ملک و قوم کی خدمت میں لگے رہے۔ تعلیمی مسائل پر اُن کی نگاہ جتنی گہری تھی، اس سے اگر پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا تو ہم اب تک اس روایتی تعلیم کے شکار نہ رہتے جسے انگریزوں نے اپنے مقاصد کے تحت رائج کیا تھا۔ اُن کے انتقال پر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، نے جو مرثیہ لکھا وہ ذاکر صاحب کی اہمیت ہی نہیں بلکہ اُن سے اُن کی قربت کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً اُن کے یہ بند دیکھئے ؎

ہم نشیں کس سے کہیں، کیا کہیں اف نہ دل — اب تو آباد نہ ہوگا کبھی ویرانۂ دل،

اَب تو خالی ہی رہے گا یہ صنم خانۂ دل	اب نہ ساقی ہے نہ میکش ہے نہ میخانۂ دل

پائے رفتن ہی نہیں منزلِ مقصود کہاں

سر بہ سجدہ جو رہیں کعبۂ مسجود کہاں !

منبع علم و ہنر صاحب کردار گیا	رونقِ بزم عمل گرمیٔ بازار گیا

دہر سے جنسِ محبت کا خریدار گیا	جس کے مطلوب بھی تھے وہ طلبگار گیا

طالب خیر تھا وہ طالب آزار نہ تھا

گُل یہ وہ گُل تھا کہ جس گل کا کوئی خار نہ تھا

ڈاکٹر ذاکر حسین کا انتقال اچانک قلبی دورے سے ہوا جو دوستوں، عزیزوں، عقیدت مندوں اور ملک و قوم کے لئے بہت تکلیف دہ حادثہ تھا۔ اس حادثے کی طرف سحر نے ایک بند میں اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

عمر بھر تو نے تو ہر ایک کی دل داری کی !

تیرے دل نے مگر نہ تجھ سے وفاداری کی

اس مرثیے کے آخری بند سے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور ذاکر صاحب کے گہرے تعلقات کا اظہار ہوتا ہے، اس لئے اس میں اُن کے دل کا درد سمٹ آیا ہے ؎

جانے والے تجھے ہم یاد کریں گے پیہم	کون ہے جس کو نہیں تجھ سے بچھڑ جانے کا غم

مشعلِ راہ بنے گا ترا ہر نقش قدم	تجھ سے تھا مہر و مروت کا زمانے میں بھرم

گل و بلبل ہی نہیں سارا چمن روتا ہے

"او کھلے" والے تجھے سارا وطن روتا ہے !

شعرا میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے تعلقات یوں تو سب ہی سے بہت اچھے تعلقات تھے، لیکن جگر مرادآبادی اور جوش ملیح آبادی سے اُن کے تعلقات کی نوعیت مختلف تھی۔ یہاں احترام و عقیدت کے ساتھ ہم پیالہ و ہم نوالہ ہوتے کا رشتہ بھی تھا۔ سحر کا ذکر میں نے پہلی بار جگر صاحب سے ہی سے سنا تھا۔ جوش ملیح آبادی کے انتقال پر سحر نے جو مرثیہ لکھا وہ اُن کے شخصی مراثی میں بہت اہم ہے۔ یہ مرثیہ صرف گیارہ بند پر مشتمل ہے لیکن ان گیارہ بند میں انہوں نے جوش کی پوری شخصیت کو الفاظ میں ڈھالنے

کی کوشش کی ہے۔

جوش ملیح آبادی اپنے زمانے کے مقبول ترین شاعروں میں تھے۔ انہیں الفاظ کا سب سے بڑا بنّاض مانا جاتا ہے۔ انھوں نے جس کثرت اور شدّت سے مختلف تراکیب، الفاظ اور اُن کے مترادفات کو استعمال کیا ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ اُن کی نظمیں پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ کا ایک سیلاب ہے جو اُمڈا چلا آرہا ہے۔ وہ ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نفیس انسان، بہترین گفتگو کرنے والے بے حد مخلص بلکہ دوستوں کے لئے شاخِ گُل کی طرح نرم تھے۔ شام کو اندازِ گل افشانی گفتار اور دیکھنے کے قابل ہوتا ــــ اِن محفلِ یاراں میں جوش کچھ اور ہی نظر آتے ــــ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ایسی انگنت محفلوں میں اُن کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ شروع میں اس کا ذکر آچکا ہے کہ مرثیے کا سارا معاملہ قربت کا معاملہ ہے۔ مرنے والے سے جتنی زیادہ قربت ہوگی، مرثیے میں اتنا ہی اثر ہوگا۔ سحر کے شخصی مراثی میں اس لحاظ سے جوش کا مرثیہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ اثر اور خاص کیفیت کا حامل ہے ؎

روحِ چمن وہ جانِ بہاراں نہیں رہا | وہ کج کلاہ محفلِ یاراں نہیں رہا
پیرِ مغانِ بادہ گساراں نہیں رہا | وہ شہر یارِ شہرِ نگاراں نہیں رہا
یوں اُٹھ گیا کہ بزم میں اب زندگی نہیں
ہم دل جلا رہے ہیں مگر روشنی نہیں

میٹھے وہ بول بولنے والا چلا گیا | موتی خرد کے رولنے والا چلا گیا
زلفوں کے پیچ کھولنے والا چلا گیا | وہ بوئے گل کا تولنے والا چلا گیا
اس کا شعور اس کا سلیقہ کہاں سے لائیں
اس کا وہ طور اس کا طریقہ کہاں سے لائیں

سحر نے ہر بند میں جوش کے مزاج، شخصیت اور اہمیت کی جو تصویر کشی کی ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے انہوں نے جوش کو، 'بونوں' میں مردِ دراز قد، کہہ کر مختصر ترین الفاظ میں کردار نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ اُن کا یہ بند ملاحظہ کیجئے ؎

وہ جاہ و جلال وہ چہرہ وہ خال و خد | نے خائفِ نتائج و انجام و نہنگ و بد

ذہن رسا کا کوئی تعین نہ کوئی حد　　　بولوں کے درمیان وہ مردِ دراز قد
لاکھوں میں ایک فرد، عجیب و غریب تھا
اس تہ نشیں کا اوج ثریا نصیب تھا

شبنم، شمیم پھول کی پتی رباب و چنگ　　　فولاد موم جذبۂ ایثار کوہِ سنگ،
اخلاص، حلم سادگی قوسِ قزح کا رنگ　　　کاشی کی صبح شامِ اودھ فوجِ آب گنگ
ان سب کے امتزاج سے پیدا ہوا تھا جوشؔ
کس شان سے وطن میں ہویدا ہوا تھا جوشؔ

جوشؔ کے انتقال کے بعد پاکستان کے ایک شاعر نے اُن کے بارے میں بعض سخت اور نازیبا کلمات کا استعمال کیا تھا۔ جس پر بہت سے لوگوں نے افسوس کا اظہار کیا لیکن اس واقعے پر سحرؔ نے جس شدّت سے اس مرثیے کے ایک بند میں اظہار کیا ہے، وہ اُن کی عقیدت و محبت کی علامت ہے ؎

صد حیف طعنہ زن ہیں غلامانِ خانہ زاد　　　جن کے قصیدے اب بھی ہیں افرنگیوں کو یاد
احساسِ کمتری نے عنایت کیا عناد　　　دیجئے ستم ظریفیٔ اہلِ حسن کی داد
زاغ و زغن بھی بولیاں بولنے لگے!
شاہین جو اُڑ گیا تو یہ منھ کھولنے لگے

اس وقت کنور مہندر سنگھ بیدی کے تمام شخصی مراثی پیشِ نظر نہیں ہیں لیکن ان چند مراثی سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے جس کے بارے میں مرثیہ لکھا ہے وہ پورے خلوص اور دل کی گہرائی سے لکھا ہے، اور اسی لئے وہ دل پر اثر کرتا ہے۔ اُن کے شخصی مراثی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تمام مرثیے مسدس کی ہیئت میں لکھے ہیں۔ جس میں اظہار و بیان کی زیادہ گنجائش ہے۔ عام طور پر شخصی مراثی کے لئے کوئی، مخصوص ہیئت نہیں ہے لیکن کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے مراثی کی روایت کے احترام میں اپنے شخصی مرثیوں کے لئے مسدس ہی کی ہیئت کا انتخاب کیا ہے جس سے اُن کے مرثیوں میں زور اور اثر بڑھ گیا ہے۔ ❊ ❊ ❊

صاحبزادہ شوکت علی خان

کنور مہندر سنگھ بیدی اور ٹونک

کچھ شخصیات علامتیں ہوا کرتی ہیں آثار و اقدار کی، کچھ شخصیات علامتیں ہوا کرتی ہیں خود اپنی ذات وصفات کی، اور کچھ شخصیات علامتیں ہوا کرتی ہیں اپنے ادوار کی، اپنے عہد کی، اپنے عصری رجحانات کی، اپنے زمان و مکان کی۔! لیکن بہت کم شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو خود اقدار کو جنم دیتی ہیں، ادوار میں اپنی شخصیات کے نقوش مرتسم کرتی ہیں اور پھر ان نقوش سے اپنے اپنے عہد کی تعمیر بھی کرتی ہیں۔

ایسی ہی عہد آفریں شخصیات میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی دلآویز، ہر دلعزیز جامع الحیثیات اور رنگارنگ شخصیت ہے۔ شخصیت ایک ہے رنگ گوناگوں ہیں، کردار ایک ہے پر تو کئی ہیں، فرد ایک ہے حیثیات کئی ہیں، عہد و عصر ایک ہے لیکن کارفرمائیاں اور جلوہ سامانیاں انیک ہیں۔ پھر مستزاد یہ کہ دلربائی اور دل آویزی ایسی کہ ہر حیثیت میں جادو اثر رنگ بھرتی نظر آتی ہے۔

کنور صاحب خود اپنی ذات سے تو ایک انجمن ہیں ہی، لیکن اپنی نسبتوں سے بھی انجمنوں کی جان اور دبستانوں کی روح رواں ہیں جو اتنے طویل و عریض دور کے لگاؤ سے اور گوناگوں تیز رفتار کار پردازیوں سے ایک تحریک بن گئے ہیں، اور رجب النسان

ایک تحریک بن جائے تو وہ زمان و مکان کی قید و بند سے بے نیاز ہو کر سارے عہد اور سارے دور کو محیط ہو جاتا ہے۔ یہی مقام کنور صاحب حاصل کر چکے ہیں۔ گو وہ اپنی حیات کی پچھتر منزلوں سے بھی آگے بڑھ چکے ہیں، لیکن چالیس سال سے زیادہ ادب و زبان کی خدمت کرتے ہوئے خود نصف صدی کی تاریخ بن چکے ہیں۔

کنور صاحب منتہائے سحر کی تلاش و جستجو میں شب و روز اور شام و سحر خدمتِ ملک و قوم اور خدمتِ زبان و ادب میں اپنا سرمایۂ حیات لٹا بیٹھے ہیں اور آج جب کہ ان کا جشنِ الماس منایا جا رہا ہے، وہ تاریخ بن چکے ہیں، اور تاریخ میں جلوہ گر ہو چکے ہیں —— ثقافتی عظمتوں کو وہ تاریخ بنا چکے ہیں۔ اور تاریخی عظمتوں کو ثقافتی روایتیں نذر کر چکے ہیں۔ تاریخ اور روایت دونوں کی نسبتیں ان میں ہیں اور وہ ان سے عیاں اور نہاں ہیں۔ نسبت کسی کی بھی ہو انسان کو عہد آفریں اور عصری شاہکار بنا دیتی ہے۔ نسبت کے سہارے جب کوئی آگے بڑھتا ہے تو وہ قائد بنتا ہے، مجاہد بنتا ہے، معمار بنتا ہے، ادیب بنتا ہے، شاعر بنتا ہے یا عصری روایت اور اپنے زمانے کی علامت بنتا ہے۔ جب علامت اور روایت کی بات چھڑتی ہے تو کنور مہندر سنگھ بیدی سحر بنتے ہیں —— جو روایت اور علامت کے علمبردار نظر آتے ہیں۔

کنور صاحب میں کچھ ایسے ہی دلآویز نقش و نگار اور دل پسند اقدار و آثار نظر آتے ہیں۔ وہ یقیناً اپنے اس طویل دور کے نگہبان اور ممتاز پاسدارانِ علم و ادب اور رہنوردانِ علم و فن کے شاہکار ہیں۔ وہ پنجاب کے ہوتے ہوئے بھی سارے ہندوستان کے آفاقی کردار اور ثقافتی وقار نظر آتے ہیں، جو اپنی ہمہ جہتی خدمات اور جامع الحیثیات شخصیت سب پر مرتسم کرتے، دوسروں کے پر تو اپنی شخصیت میں لیتے اور اپنے اثرات دوسروں پر چھوڑتے نظر آتے ہیں۔

۱۹۴۸ء کی بات ہے جب میں نے ٹونک میں کنور مہندر سنگھ بیدی کا ذکر سُنا تھا اور ذکر بھی سُنا تو ایک شہریار سے ایک شہریار کا۔

عالی جناب نواب اسماعیل علی خاں تاج مرحوم ٹونک کی گدّی کے وارث تھے

اور اس پر آشوب دور میں دعویدار کی حیثیت سے دلّی میں وارد ہوئے تھے۔

نواب زادہ کرنل ولی احمد خاں مرحوم نواب صاحب کے ہمرکاب تھے۔ ناگہانی مہاتما گاندھی آنجہانی ہو گئے۔ کسی بدبخت، ظالم اور سفاک کی تین گولیاں ملک و قوم کے سینہ کو چیر گئیں۔ اور دلّی کسی شہر آشوب اور طوفان خیز پیش خیمہ سے دوچار نظر آنے لگی۔ نواب اسماعیل علی خان صاحب نواب بن چکے تھے لیکن وہ ان حالات کی بنار پر دلّی سے روانہ نہیں ہو سکے تھے۔

میرے مربّی، سرپرست اور محسن نواب صاحب کو (جو میرے پھوپا خسر تھے، اور نانا حضور بھی اور آخر میں فن شاعری میں مجھے مرحوم سے فیضِ تلمذ بھی حاصل ہوا تھا۔) کنور صاحب ہی نے اپنا معزز مہمان بنا کر اپنے بنگلے میں رکھا تھا۔ اس وقت وہ دلّی میں مجسٹریٹ تھے۔ نواب صاحب کنور اور ولی عہد بن کر دلّی آئے تھے اور ایک کنور کے یہاں قیام پذیر ہوئے تھے لیکن جب کنور کے گھر سے واپس ہوئے تو نواب بن کر، اور ٹونک میں داخل ہوئے تو اپنے مہربان دوست کے گیت گاتے ہوئے۔ نواب صاحب کے استقبال کے لئے پورا شہر اُمنڈ آیا تھا۔ نواب اسماعیل علی خاں زندہ باد! پائندہ باد! کے نعرے لگ رہے تھے اور اسماعیل علی خاں کی زبان سے کنور مہندر سنگھ بیدی زندہ باد! واہ رے کنور صاحب! آفریں بیدی صاحب! کے کلماتِ خیر نکل رہے تھے۔ اسی دن سے مجھے کنور صاحب کو دیکھنے کی آرزو تھی کہ کیسے ہوتے ہیں کنور صاحب، بیدی صاحب! دیکھا تو ۱۹۶۸ء میں، اور ایسا دیکھا کہ ایسا کنور دوبارہ کیا اب تک نہیں دیکھ سکا۔ حالانکہ ابھی دیکھا ہی کیا ہے!

یادش بخیر! ۶؍جولائی ۱۹۶۸ء کو کنور صاحب یوم صولت میں شرکت کے لئے ٹونک تشریف لائے تھے۔ کنور صاحب مرشدی قبلہ صولت صاحب کے بڑے معتقد رہے ہیں۔ جب موصوف گوڑگاؤں میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ اس وقت قبلہ صولت صاحب مرحوم ان کو متاثر کر چکے تھے۔ ایڈیٹر شانِ ہند سرور تونسوی، قبلہ صولت صاحب کے دامن گرفتہ اور معتقد خاص تھے۔ جن کی وساطت سے صولت صاحب کنور صاحب سے

ملے تھے اور مشاعرے پڑھے تھے۔ صولت صاحب نوّرَ اللہُ مرقدہٗ کی نسبت سے سرور تونسوی مجھ کفش بردار اور خاکپائے حضرت صولتؒ کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور بڑا خیال کرتے ہیں۔

یومِ صولت میں کنور صاحب کو لانے کے لئے تین شخصیات ایسی ہیں جنھوں نے ان کو ٹونک کی اس تقریب میں شرکت کے لئے آمادہ کیا۔ وہ ہیں مرآد سعیدی ٹونکی جو جانشینِ بسمل سعیدی ٹونکی ہیں اور کنور صاحب کے دیدہ ودانستہ عاشق ہیں۔

دوسری شخصیت جناب سرور تونسوی ہیں جنھوں نے کنور صاحب کو یومِ صولت کے لئے راضی کیا تھا، تیسری ایک اور شخصیت ہے جو خود تاجدار ریاست اور شہریارِ علم و فن ہے۔ عزّت مآب اعلیٰ حضرت عزیز الدولہ امیر الملک نواب محمد اسماعیل علی خان مرحوم تاج جنھوں نے اپنے اے۔ ڈی۔ سی کیپٹن صاحبزادہ عبد الباعث خاں صاحب کو کنور صاحب کی پیشوائی کے لئے کیڈیلاک CADILAC کار کے ساتھ سانگانیر ہوائی اڈے پر روانہ کیا اور ٹونک میں اپنا ہی مہمانِ خصوصی بنایا۔ کنور صاحب کے اعزاز میں ایک شاندار روایتی انداز کی ایک شاہی دعوت کی گئی جس کا اہتمام مطلّٰی، مذہب اور میناکار، شہرۂ آفاق، بے عدیل و بے نظیر قصرِ زرنگار الموسوم سنہری کوٹھی میں کیا گیا تھا۔

۷ رجولائی ۱۹۶۸ء کی ایک رنگیں و سنہری شام میں بزمِ شعر و سخن، آراستہ و پیراستہ کی گئی، جس میں کنور صاحب، صاحب زادہ یٰسین علی خاں نشاطؔ سابق کلکٹر، صدر تاج اکیڈمی، بندہ ناچیز، استاذ السلطان افتخار الشعراء جناب خندآں حضرت تاج کے مشیرِ سخن، جناب الحاج مرزا رفیع اللہ بیگ صاحب سابق چیرمین، جناب لڈھا صاحب کلکٹر ٹونک، جناب حبیب الرحمان خانصاحب ایڈوکیٹ اور دوسرے اعلیٰ افسران کے علاوہ سرور تونسوی، عالم فتحپوری، عزیز وارثی اور خاص طور سے بسمل سعیدی، مولانا سیّد قاضی الاسلام، مخمور سعیدی اور مولانا سیّد منظور الحسن برکاتی شامل تھے۔

نواب صاحب مرحوم جوش و خروش اور سرور و کیف کے ساتھ اپنے مسحور کن خاص انداز شاہانہ میں غزلیں سنا رہے تھے، کنور صاحب آداب شاہی کا لحاظ کرتے ہوئے

اپنے مہربان دوست کو جھوم جھوم کر دادِ تحسین دے رہے تھے۔

کنور صاحب ہی کی شخصیت تھی جس کی بدولت جوؔش ملیح آبادی نواب صاحب سے قریب تر ہوئے تھے اور ان کی کریمانہ سخاوت اور اخلاق حمیدہ سے متاثر ہوئے تھے۔ جوؔش صاحب نے خود بھی اس کا ذکر کیا ہے اور وہ ایک دو بار ٹونک تشریف بھی لائے تھے، اکیلے بھی اور بیگم کے ساتھ بھی۔ جوش صاحب نے پاکستان سے ایک خط میرے مہربان دوست عمر سیفی، جانشین حضرت کیف ٹونکی، کو لکھا تھا۔ جس میں اس طرح ذکر کیا ہے کہ میرے محب اور مخلص دوست کنور صاحب اچانک نواب صاحب کو میرے غریب خانے پر لے آئے۔ میں ان سے بے حد متاثر ہوا اور پھر میری اور ان کی دوستی کی پینگیں بڑھتی گئیں۔

کنور صاحب ایک طرف جوش صاحب کے قریبی دوستوں میں سے تھے تو دوسری طرف نواب صاحب کے نیاز مندوں میں بھی اور نواب زادہ کرنل ولی احمد خاں صاحب کے احباب میں بھی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے عمِّ محترم جناب کیپٹن خلیل احمد خاں صاحب نے بتایا تھا کہ میں اپنے والد محترم نواب زادہ کرنل ولی احمد خاں صاحب مصنف محاوراتِ داغ کے ہمراہ کنور صاحب سے چند بار ملا تھا۔ اور کنور صاحب کی پہلو دار شخصیت کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوا تھا۔ ان کا دولت خانہ خود اپنی جگہ تہذیب رنگارنگ کا آئینہ دار تھا۔ ایک طرف محفلِ جام وسبو چل رہی ہے تو دوسری طرف بزمِ غزل سرائی اور نغمہ آرائی برپا ہے کہیں وہ امور انتظامیہ میں دخیل نظر آتے ہیں تو کہیں بٹیر اور تیتر کی نغمہ طرازیاں سنتے دیکھائی دیتے ہیں، کوئی غزل چھیڑ کر عمرِ رفتہ کو آواز دے رہا ہے تو کوئی سازِ دل سے پردہ ہائے زیر و بم کو چھیڑ رہا ہے۔

کنور صاحب میں سب ہی صفات موجود ہیں جہاں ان میں غزل کی آبرو جھلکتی ہے وہاں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے گنگا جمنی عناصر کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ ایک طرف وہ قومی یکجہتی کے علمبردار نظر آتے ہیں تو دوسری طرف دِلّی کی تہذیب وتمدّن کے آئینہ دار دکھائی دیتے ہیں۔ اگر ایک طرف ثقافتی اقدار کا نمونہ نظر آتے

ہیں تو دوسری طرف ہندوستان کے علمی و ادبی دبستان کے پیکر دکھائی دیتے ہیں۔

یومِ صولت تین روزہ مشاعرہ اور تین روزہ سمپوزیم پر مشتمل تھا۔ پہلی شب ایک بجے تک شاندار و جاندار محفل مشاعرہ گرم رہی۔ کنور صاحب مشاعرہ پڑھا رہے تھے، جہاں ٹونک کے عوام اور اجمیر جے پور اور قرب و جوار سے سامعین سمٹ آئے تھے، ایک تاریخی اجتماع تھا جو اسی طرح ٹھاٹیں مار رہا تھا جس طرح اس شب میں آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ کنور صاحب کے ہاتھ میں اس رات پڑھنے والے شعراء کی فہرست تھی جس میں ۷۲ شعراء تھے۔ عوام شعراء کے کلام سے زیادہ کنور صاحب کے گرم و نرم، تند و تیز اور حسین و رنگین پیرایۂ تخاطب سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ باران رحمت کا نزول شروع ہو گیا۔ کنور صاحب نے فرمایا، دیکھیں ٹونک والو! کتنے سخن شناس ہو اور کتنے مہمان نواز ہو، بارش آپ کو یہاں سے ہلا نہ سکے۔ اُن کی آواز کے ساتھ ہی چھتریاں تن گئیں لیکن مجمع منتشر نہیں ہوا۔ جب کنور صاحب ہی اٹھ کھڑے ہوئے تو مشاعرہ ختم ہو گیا۔ دوسرے دن اور تیسرے دن، صبح و شام نشستیں جمتی رہیں۔ کنور صاحب ٹونک سے اور ٹونک کنور صاحب سے وابستہ و پیوستہ ہو گئے اور ٹونک ان کے لئے دوسرا لکھنو یا دلی بن گیا۔

وہ ٹونک والوں، یہاں کے دانشوروں، علماء، فضلاء، ادبا اور شعراء سے بے حد متاثر ہوئے۔ وہ نقش اول آج تک کنور صاحب کے دل پر مرتسم ہے۔ اس لئے کہ یہ جوش ملیح آبادی کے پر دادا، سالار فقیر محمد خاں گویا کا مستقر رہ چکا ہے یہ حضرت صولت کی بستی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اختر شیرانی کے رُومان نے پرورش پائی تھی، یہی وہ جگہ ہے جہاں محمود شیرانی جیسے محقق اور مولانا محمود الحسن صاحب المعجم المصنفین جیسے مُتبحر فاضل پیدا ہوئے، اسی مقام دلربا میں بسمل صاحب جیسے شاعر رنگین نوا رہے، بسے، پلے، پڑھے اور جوان ہوئے۔ اور جوان غزلیں کہیں۔

وہ ٹونک سے بقول ان کے دو نگینے چن کر لے گئے تھے ایک عابد کیفی اور دوسرے شاد کیفی۔ ان دونوں کو کنور صاحب نے اتنے مشاعرے پڑھوائے کہ اس سرزمین سے

کسی دوسرے کو ایسی نمائندگی کرنے کا موقع نہیں ملا، اسی مشاعرے میں کنور صاحب نے میرے مخلص دوست جناب راہی شہابی کو بھی منتخب فرمایا اور آج وہی راہی راجستھان میں کنور صاحب کے بڑے نیاز مند اور عزیز دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔ کنور صاحب سے وہ اور ان سے کنور صاحب وابستہ تر اور قریب تر ہو گئے۔

دوسری بار مراد صاحب نے یومِ عتیق اللہ خاں[1] میں کنور صاحب کو دعوتِ شرکت دی۔ اور کنور صاحب نے شرکت کی۔ ایک دو بار اور آنے کے بعد جشن جمہوریہ ۱۹۷۳ء میں آخر بار پھر کنور صاحب ٹونک تشریف لائے اور شاید اس کے بعد وہ ٹونک نہ آسکے۔ یہ مشاعرہ نواب صاحب مرحوم کی معیت میں ان کا آخری مشاعرہ تھا۔ نواب صاحب نومبر ۱۹۷۴ء میں انتقال کر گئے اور میں سمجھتا ہوں، شاید کنور صاحب اسی غمِ مفارقت میں اب ادھر آنے کا ارادہ نہیں کرتے۔ ہر محفل، ہر مشاعرہ اور ہر سیمینار میں مجھے یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ "ارے میرے بھائی! ٹونک سے اور ٹونک والوں سے ملنے کے لئے بے تاب رہتا ہوں، وہاں کے احباب سے آداب کہیے اور محفلیں ذرا گرم کیجئے۔" لیکن کنور صاحب اب بلانے پر بھی نہیں آتے۔ ان کے مہربان اور مخلص دوست نواب صاحب ٹونک کے انتقال کے بعد شاید ان میں تب و تاب اور سکت نہیں کہ وہ پھر ٹونک آسکیں۔ یہ نواب صاحب سے اور ٹونک سے ان کا تعلقِ خاطر اور ربطِ خاص ہے۔

کنور صاحب حضرت صولت سے متاثر بھی ہیں ان کے معتقد بھی اور ان کی استادانہ صلاحیتوں، قادر الکلامی، سخن سنجی، سخن فہمی اور شاعرانہ کمالات کے قائل بھی۔ چنانچہ انہوں نے یوم صولت کے اختتامیہ میں صولت صاحب کے بچوں کے لئے دو ہزار روپے نذرانہ پیش کرنے کا اعلان بھی کیا تھا۔ ٹونک سے واپسی پر جب ان کی

---

[1] عتیق اللہ خاں اپنے زمانے کے دبیر کامل اور فنکار خطاط تھے۔ ٹونک کی دنیا میں انھیں حضرت بسمل سعیدی اور استاد صولت ٹونکی کے قریبی دوست ہونے کا فخر حاصل تھا۔

خدمت میں ہوائی جہاز کا کرایہ پیش کیا گیا تو لینے سے انکار کر دیا۔ اس سے ان کی جہاں ایک طرف سیر چشمی مترشح ہوتی ہے تو دوسری طرف اسلاف، بزرگان دین اور اکابر اصفیاء سے اعتقاد کا بھی پتہ چلتا ہے۔

حضرت صولت نہ صرف ایک کامل الفن استاد شاعر تھے بلکہ اپنے دور کے صوفی صافی' باطنی فیوض و برکات کے حامل اور سیف اللہ، ولی اللہ اور حضور سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلۃ الذہب کی اکیسویں عروۃ الوثقیٰ تھے۔ ان کا سینہ علمِ باطنی کا دفینہ تھا، قلب فیوض و برکات کا خزینہ تھا اور آنکھیں بصیرت و معرفت کی آئینہ تھیں۔ جن میں جہاں و جہانیاں کی کیفیات و حسیات، واردات و مشاہدات اس طرح نظر آتے تھے جس طرح آئینہ خانہ میں ازدحام وکثرتِ صُوَر کی جلوہ نمانیاں نظر آتی ہیں وہ اپنی ذات سے خود شعر و سخن کے ایک شہر یار اور علمی جاپناہ تھے فقیر و درویش تھے لیکن سلطانی کرتے تھے۔ جہاں وہ روحانی تجلّیات و باطنی فیوض و برکات کے سرچشمہ تھے وہاں علمی روایات اور شعری صلاحیتوں کے امین و پاسبان بھی تھے ایک طرف اگر فیضانِ شعری سے متصف تھے تو دوسری طرف عرفانِ حقیقی سے بہرہ ور بھی۔ ایک طرف رئیس گر تھے تو دوسری طرف شاعر گر اور شاعر نواز بھی۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک حرف سیف اللہ کی زبان ثابت ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابدال واوتار، اضیار واقطاب، احرار وابرار، نظامِ باطنی کے ارباب حل وعقد کے ارکان واعیان کے معاملات ومقدمات میں وہ بصیرت ومدخل تام رکھتے تھے۔

کنور صاحب، حضرت صولت جیسے ولی و درویش سے عقیدت اور ارادت رکھتے ہیں جن کی دعاؤں سے آج بھی وہ اپنے زمانے کے نادرِ وقت اور عمدۃ روزگار شخصیت بنے ہوئے ہیں۔ چونکہ کنور صاحب سخنورانِ باکمال اور اصفیاء و اتقیاء کے پرستار ہیں، اس لئے وہ حضرت صولت کی دونوں نسبتوں کی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یوم صولت میں اپنے تمام مشاغل چھوڑ کر تین دن تک ٹونک میں مہمان خصوصی رہے۔ قبلہ صولت صاحب کے علاوہ حضرت بسمل سعیدی ٹونکی (جو صولت صاحب کے

رفیقِ دیرینہ اور ٹونک کے سر بر آوردہ شعراء اور ادباء میں ممتاز درجہ رکھتے تھے) بھی کنور صاحب کے قریبی دوست ہم مشرب، اور جلیس و حبیبِ لبیب تھے۔ منشی عتیق اللہ خاں ٹونکی، بسمل سعیدی اور حضرت صولتؒ کی رفاقت اتحادِ ثلثہ کی حیثیت سے یاد کی جاتی ہے۔

بسمل صاحب کے دلّی میں سکونت اختیار کرنے کے بعد جب قبلہ صولت صاحب پہلی بار دلّی تشریف لے گئے تو وہاں کافی عرصہ قیام کیا۔ بسمل صاحب نے اپنے حلقۂ احباب اور اربابِ علم و بصیرت سے صولتؒ صاحب کا بڑی تعظیم و تفخیم کے ساتھ تعارف کرایا۔

بسمل صاحب میں ایک خاص ملکہ تھا کہ وہ متعارِف اور متعارَف دونوں کی شخصیت کو اس حد تک بڑھا کر تعارف کراتے تھے کہ وہ دونوں شخصیات ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ قبلہ صولت صاحب کی شان میں تو بسمل صاحب نے ایک پرشکوہ قصیدہ پڑھا ہی، لیکن جن دِلّی والوں کا قبلہ صولت صاحب سے تعارف کرایا ان کے قصیدے میں بھی کوئی کمی نہیں کی۔ آپ سے ملئے، " عالی جاہ کنور صاحب، محسن شعر و ادب، دلّی کا وقار، ہندوستان کی آبرو۔ آپ سے ملئے علامہ جوشؔ ملیح آبادی، نظم کی آبرو، بلکہ اردو ادب کی آخری بہار، نکتہ رس، غائر نظر علوم و فنون کے شناور اور اربابِ حل و عقد پر اپنی مہتم بالشان شخصیت کے ساتھ چھپائے ہوئے "۔ "میاں" (حضرت صولت صاحب) متعارف ہو رہے ہیں اور جی ہاں اور بہت اچھا کے الفاظ زبان پر ہیں۔ لیکن "میاں" اب ایسے قصیدے سنتے سنتے اکتا چکے تھے اور بسمل صاحب کے اس اندازِ تعارف سے بکھر چکے تھے۔ پھر ان کا مذاق مزاج بھی ان قصائد کا متحمل نہیں ہو رہا تھا۔ ادھر تو میاں کی یہ حالت اُدھر بسمل صاحب فرماتے ہیں ارے میاں! " دلّی کے ہر گوشے میں ہر فن کے آفتاب و ماہتاب، ماہرِ فن استاد رہا کرتے ہیں۔ ان سے ملئے یہ تحقیق و تنقید کے استاذ الاساتذہ ڈاکٹر رشید حسن خاں، بس یوں کہیے ایسا متبحّر فاضل اور عدیم المثال محقق اب کہیں نہیں ملے گا "۔ یہ تو کہنا تھا کہ "میاں" حالت جذب میں آگئے۔ فرمانے لگے

بڑے سادہ انداز میں "عیسیٰ" (بے تکلفی، قرابت اور دیرینہ تعلقات کی بنا پر "میاں" اکثر بسمل صاحب کو عیسیٰ یا عیسیٰ میاں کے نام سے بھی پکارتے تھے۔) "اب تو یار کسی جاہل سے ملا دے۔ تنگ آ گیا ہوں، جس کو دیکھو آفتاب و ماہتاب اور حکیم و عالم و شناور" بس ایک سکوت سا چھا گیا اور خاموشی طاری ہو گئی۔

بسمل صاحب ٹونک کو خیر باد کہہ کر دلّی کو اپنا وطن ثانی بنا چکے تھے۔ اور اپنی جادو بیانی اور پُر بہار شخصیت کی معجز بیانی سے نہ صرف ارباب علم و فن کے دلوں پر اپنا سکّہ بٹھا چکے تھے بلکہ اعلیٰ عہدیداران اور حکومت کے اعیان و ارکان کے حلقوں میں بھی بڑی حد تک متعارف ہو چکے تھے۔ اس ضمن میں وہ حضرت جوؔش اور کنور مہندر سنگھ بیدی کے خاص طور قریب آ چکے تھے۔

اورنگ زیب عالم گیر نے اپنے فرزندان کام گار و کامران کو فرزند عالی جاہ کہہ کر پکارا ہے، لیکن کنور صاحب ہندوستان کے ایسے فرزند عالی جاہ ہیں جو اب بھی عوام و خواص دونوں میں عالی جاہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ بسمل صاحب نے کنور صاحب کو عالی جاہ بنایا ہے۔ اور وہ ہم سب کے عالی بن گئے۔ بسمل صاحب بہر حال دِلّی اور ٹونک دونوں کی ایسی خوش آئندہ یادگار ہیں جن پر دلی بھی اسی درجہ نازاں ہے جس درجہ ٹونک ان پر فخر کرتا ہے۔ بسمل صاحب دونوں کی ایک ایسی مسعود و مبارک یادگار تھے جس نے دلّی اور ٹونک کو ایک رشتہ میں پیوستِ رگِ جان کر دیا تھا۔

بسمل صاحب خود بھی اپنی ذات و صفات سے ایک محفل اور ایک انجمن تھے اور ان کے چاہنے والے کنور صاحب بھی ایک انجمن، ایک دبستان، ایک تہذیب اور ایک تحریک، اس لئے دونوں کی رفاقت نے ایک دوسرے کو بہت کچھ دیا ہے اور آپس میں دونوں کو قریب تر کیا ہے۔ کنور صاحب اگر ٹونک سے بسمل صاحب کی وجہ سے قریب ہوئے ہیں تو خود بسمل صاحب نے بھی ٹونک سے دور رہتے ہوئے دلّی میں ٹونک بسایا ہے۔ وہ ٹونک جس کی گلی کوچوں میں کنور صاحب بارہا گزرے ہی نہیں بلکہ اس کی بستی کو آباد بھی کیا ہے اور بہت کچھ دیا بھی ہے۔

کنور صاحب کی ایک شخصیت ہے اور مختلف جہتیں مختلف خدمات ہیں کہیں شاعر
رنگیں کی حیثیت سے شعر و ادب میں نئی سمتیں متعین کرتے اور نئے اسلوب و تراکیب وضع
کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں ادیب کی حیثیت سے اپنی فکر انگیز تقاریر اور تعمیری تقاریب
سے ادب اور ثقافت کی شان کو دوبالا کرتے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی پاسبان و نگہبانِ
ادب کی حیثیت سے تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی بوقلمونیوں سے ادب اور سماج دونوں کو
چمن لالہ زار اور گلِ گلزار بناتے نظر آتے ہیں وہ کس کس میدان میں کیا کچھ نہیں ہیں۔
اور کن کن حیثیات کے مالک ہیں اس کو ان کی زندگی کی گوناگوں خدمات کا مطالعہ کر کے
الگ الگ کرنا ازبس مشکل ہے۔

خاندان کے اعتبار سے رئیس، مزاج و مذاق کے اعتبار سے شاعر و ادیب، افتادِ
طبع کے اعتبار سے منتظم، رفتار و اطوار، گفتار و کردار کے اعتبار سے قومی یکجہتی کے علمبردار
انسانیت کے آئینہ دار اور انسان دوستی کے بادہ خوار۔ جس دائرہ کار میں نظر آتے ہیں
ساری صفات اسی دائرہ اختیار میں سمٹ آتی ہیں لیکن جب وہ شاعر ہوتے ہیں تو صرف
شاعر ہی نظر آتے ہیں، جہاں مضامینِ رنگارنگ ان پر کچھ اس طرح اُترتے محسوس ہوتے
ہیں جس طرح وہ اسرارِ معانی و مطالب کو اشعار کے پردوں میں کھولتے نظر آتے ہیں۔
وہ شعر کی خاطر شعر نہیں کہتے بلکہ کسی جذبہ، کسی فکر، کسی نصب العین اور کسی مقصدیت
کے پیش نظر اس انداز سے شعر کہتے ہیں جیسے حسین شاخوں سے شوخ غنچے چٹک پھبن
لٹاتے ہیں۔ جب خوشبو پھیلتی ہے تو مقصدیت خوشبو کی طرح دل و دماغ میں اترتی
چلی جاتی ہے۔ ان کی غزلیں دیکھئے، قطعات و رباعیات دیکھئے سب میں ایک ہی جذبہ،
ایک ہی مقصدیت کار فرما ہے۔ غزل کہیں گے تو واردات و مشاہدات کے بل بوتے
پر، لیکن تغزل کے رنگ و آہنگ اور مزاج و مذاق کی سلامت روی کے ساتھ
تنگ دامنی کے باوجود اُن کا دامان غزل، دامانِ باغبان و کفِ گل فروش
بار وکشِ بہار سحر فروز نظر آتا ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی سحر کاریاں ایک نو گرفتارِ محبت کو گرفتارِ رخ و

گیسو کرتی ہیں یا محبوب کج کلاہ کے چہرے پر انوار زر د زرد اور لب نازک پر طوفان شرر برپا کرتی ہیں ۔ جہاں عاشق کے دل کو سوز و گداز کی کیفیات گرم گرم آنسو، اور سرد سرد آنسو، اور سرد سرد آہیں بخشتی نظر آتی ہیں وہاں مشاہدات وواردات اپنی مقصدیت کے پیش نظر اسالیب و تراکیب کے حسین امتزاج سے شعر میں ایک طرف اگر سحر کی سحر کاریاں پیدا کرتی ہیں تو دوسری طرف تغزل و ترنم کے رنگ و آہنگ میں سرور و کیف و سرمستی ، خودی و بے خودی کی جلوہ سامانیاں طرب انگیزیاں ، جو پنہائی غزل کو جہاں گیرائی بخشتی ہیں وہاں عمر رفتہ کو سازِ غزل سے آواز بھی دیتی نظر آتی ھیں ، کنور صاحب نے حقیقت نگاری کا دامن تھام کر واقعی شعر میں واقعیت پیدا کر دی ہے ۔ واقعیت میں رقّت اور رقّت میں تڑپ پیدا کر دی ہے جو بساط تغزل کی دولت اور سوز و سازِ ترنم کا سرمایہ بھی ہے اور سامانِ عیش و نشاط کی وابستگی بھی ؛ اور نیرنگیٔ عشق کی دلبستگی بھی ، جہاں عندلیبِ نغمہ سنج کی طرب انگیزیاں بھی ہیں اور مطرب نوا سنج کی سرمستیاں اور نوحہ گریاں بھی ، وہیں غزل کی آبرو بھی سمٹ آئی ہے اور تفکّر و اسلوب کی چابکدستی اور گرفت بھی ۔

آج کنور صاحب کا جشن الماس دلّی میں منایا جا رہا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ٹونک میں بھی اس کی بازگشت سُنائی دے رہی ہو ۔ کبھی نذر باغ کے محلات خاص سے ، کبھی سُنہری کوٹھی کے زرنگار محراب ، شاہ نشین اور شاہ برجوں سے کبھی بہیر کی گلیوں سے تو کبھی رجبین کے کوچوں اور کبھی ناتمام کوٹھی کے وسیع و عریض میدان سے ، یہ کنور صاحب کی دوستی ہی کا سبب ہے کہ میں بھی اس جشن الماس کمیٹی کا ایک حقیر رکن ہوں ۔ اسی وابستگی کے بدولت مکرمی شریف الحسن صاحب نقوی نے مجھے " کنور صاحب اور ٹونک " ہی مقالہ کا عنوان دیا ہے ۔

نقوی صاحب خود بھی اپنے آپ کو ٹونک والوں سے قریب ہی سمجھتے

ہیں۔ وہ چونکہ خود بھی قدیم دلی کی تہذیب کے پروردہ ہیں اس لئے ٹونک کی تہذیبی بُو باس اور ادبی بوقلمونیوں سے واقف ہی نہیں ان کے آئینہ دار بھی ہیں اور امین بھی۔

میں نقوی صاحب کو اس جشنِ الماس کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں جو ان کی تگ و دو، خلوص نیت اور سعئ پیہم کا عملی ثبوت اور یادگار کارنامہ ہے۔

جمیلہ بانو

شاعر اپنی بیوی کی نظر میں

میرے عزیز دوست جناب نارنگ ساقی صاحب کی جانب سے جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب کی کتاب "یادوں کا جشن" کے سلسلے میں مجھے یہ حکم ہوا کہ میں جناب سحر صاحب کی بیگم صاحبہ سے کچھ اُن کی رائے کنور صاحب کے بارے میں معلوم کروں۔ پہلے تو مجھے یہ خیال آیا کہ کسی بھی ہندوستانی بیوی سے اس کے شوہر کے بارے میں کچھ پوچھا جائے تو جواب ہمیشہ شوہر کی خوشنودی میں ہی آنا ہے کیونکہ آخر باقی زندگی بھی رہنا تو اسی کے ساتھ ہے! خیر چونکہ میں بھابھی جی یعنی میسز سکھوندر کور بیدی کو تقریباً ۲۲ سال سے جانتی ہوں۔ اس لئے میں نے سوچا چلو آج ٹیلی فون پر وقت لیا جائے دیکھو کیا کہتی ہیں ٹیلی فون پر دوسرے دن صبح ناشتہ پر ہی بلا لیا گیا اور تقریباً ۲ گھنٹے کی ملاقات رہی۔ خوب خاطر ہوئی اور ساتھ ہی گفتگو بھی ہوتی رہی۔

میں ۔ بھابھی جی! آپ کی شادی کو کتنے دن ہو گئے؟

مسز بیدی۔ ۵۲ سال ہو گئے ۱۹۳۴ء میں شادی ہوئی تھی۔

میں ۔ آپ نے ماشاء اللہ ۵۲ سال کنور صاحب کے ساتھ گذارے ہیں کیا آپ نے ان کو ایک محبت کرنے والا شوہر اور ایک ذمّے دار انسان پایا۔؟

مسز بیدی۔ کنور صاحب دل کے بہت ہی اچھے انسان ہیں اور اگر محبت نہ کرتے تو
اتنے سال کیسے گذر سکتے تھے۔

میں۔ کیا کنور صاحب امور خانہ داری میں آپ کی مدد کرتے رہے ہیں؟

مسز بیدی۔ بس یہ نہ پوچھو کنور صاحب کو یہ مطلق خبر نہیں ہے کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے
اپنی نجی کمائی بھی ہمیشہ میرے حوالے کرتے رہے اور خود اپنی شاعری کی دنیا میں
مست رہے ہیں۔ کبھی یہ پلٹ کر نہیں پوچھا کہ تم پیسہ کس طرح خرچ کرتی ہو
کس کو دیا کیا ہوا کچھ بچا۔ ایک بہت دلچسپ بات ہے جو کنور صاحب
کی دریا دلی کے بارے میں آپ کو بتاتی ہوں جب یہ اپنے والدین کے ساتھ رہتے تھے اس وقت
کی بات ہے کہ جب کبھی کنور صاحب گائے بھینسوں کے طبیلے میں جاتے تھے تو
ان کی والدہ یہ کہتی تھیں کہ آج ضرور کوئی گائے یا بھینس کم ہو گئی ہو گی کیونکہ اگر
کسی گاؤں والے نے آکر یہ کہہ دیا کہ بچّوں کو دودھ نہیں ملتا تو وہ چپ چاپ
جانور کھول کر دے دیں گے۔ کسی کا دکھ درد وہ بالکل نہیں دیکھ سکتے۔ اگر
کبھی کسی نے آکر سوال کیا کہ وہ پریشانی میں ہے تو اس کی ساری
پریشانی کنور صاحب اپنے دل پر لے لیتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح اس کی
مدد ضرور کرتے ہیں۔

میں۔ بھابھی جی یہ جو آپ نے کنور صاحب کی دریا دلی کی بات بتائی اس سے
ان کے بیحد حساس ہونے کا پتہ چلتا ہے اور ظاہر ہے کہ شاعر اگر حساس
نہ ہو تو وہ اچھا شعر کیسے کہہ سکتا ہے۔
جب کہ ماشاءاللہ کنور صاحب نے تو سارے زمانے بھر پر اپنی شاعری کا سکّہ
جما رکھا ہے۔

میں۔ اچھا بھابھی جی آپ کے ماشاءاللہ تین بچے ہیں اور سب بہت اچھے پڑھے
لکھے بہت لائق بچے ہیں اب یہ بتائیے کہ ان کی تعلیم اور تربیت میں کنور
صاحب نے آپ کا کتنا ہاتھ بٹایا اور ایک اچھے اور ذمے دار باپ

کا فرض کہاں تک انجام دیا ؟

تم کو تو معلوم ہے کہ کنور صاحب کسی غیر کے لئے تڑپ جاتے ہیں تو ان کے اپنے بچّوں کے لئے تو ان کا کیا ہی حال رہا ہو گا ۔ اگر کوئی بچّہ ذرا دیر تک گھر سے باہر ٹھہر جاتا تو کنور صاحب کا حال دیکھنے والا ہوتا تھا۔

میں ۔ بھابھی جی آپ کو کنور صاحب کے ساتھ ماشاء اللہ کافی لمبا عرصہ رہتے ہوئے ہو گیا ہے کچھ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ پیدا ہوا ۔

ارے بھئی یہ کیا سوال کر دیا اب تم بھی ہنسو گی اگر میں تم کو ایک قصہ سناؤں گی یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ کنور صاحب کی پوسٹنگ آبُو میں ہو گئی تھی اور آبُو کی ادبی سرگرمیوں میں بھی کنور صاحب سب افسروں کے لیڈر تھے ۔ ایک دن میں کچھ افسروں کی بیویوں کے ساتھ بیٹھی ٹھیٹھ پنجابی میں باتیں کر رہی تھی تو کنور صاحب نے مجھے الگ بلا کر بڑی رازداری کے ساتھ یہ بات کہی کہ۔ دیکھو تم شاعر کی بیوی ہو ان لوگوں سے اردو میں بات کرو اس پر میں نے جواب دیا کہ کنور صاحب بھلا میری گلابی اُردو سے کیا امپریشن پڑے گا۔

مسز بیدی کا یہ گلابی اُردو والا جملہ مجھے بہت پسند آیا اور میں نے یہ سوچا کہ اس بات پر ہی گفتگو ختم کر دی جائے۔

پھر بھابھی جی مجھ کو کنور صاحب کا کمرہ شکایتی انداز میں دکھا کر کہتی ہیں دیکھو ہر طرف کتابوں کا انبار لگا ہے کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے یعنی بس دن رات انہیں کتابوں کی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ ایک بیوی کی شکایت بھی بجا ہے لیکن کنور صاحب کی کامیابی اور شہرت کا راز یہی کتابیں ہیں اور شاید اب اُن کی زندگی کا حصّہ بن چکی ہیں۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے رخصت لی۔

انیس دہلوی

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں

کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب کا نام پہلی بار ۱۹۴۷ء کے فسادزدہ زمانے میں سننے میں آیا، وہ ان دنوں دہلی کے سٹی مجسٹریٹ مقرر ہوئے تھے۔ یہ ایک عدالتی عہدہ تھا۔ لیکن اس میں بہت سی انتظامی ذمہ داریاں بھی شامل تھیں۔ جن کا تعلق شہر میں امن وامان کی بحالی اور استحکام سے تھا۔ کنور صاحب نے اپنے منصبی فرائض بہت خوش اسلوبی سے انجام دیئے اور حکام بالا کے ساتھ ساتھ عوام میں بھی انہیں قدر منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔
کنور صاحب کی عملی زندگی کا آغاز سرکاری ملازمت سے ہوا۔ لیکن انھوں نے شروع ہی سے اپنی منصبی مصروفیتوں کا رشتہ ثقافتی سرگرمیوں سے بھی جوڑ لیا تھا۔ انہیں اپنے اس فطری میلان کی تسکین وتکمیل کا سنہری موقع اس وقت ملا جب وہ انگریزی دورِ حکومت میں نیشنل وار فرنٹ کے محکمے کے سربراہ بنائے گئے۔

کنور صاحب قومی احساسات رکھتے تھے لیکن انھوں نے اس محکمے کی سربراہی یہ سوچ کر قبول کی کہ انگریز اگر اس جنگ میں فتحیاب ہو تے ہیں تو جلد یا بدیر وہ ہندوستان کو آزادی دے دیں گے۔ لیکن اگر ان کی ہار ہوتی ہے اور ہٹلر کی جیت تو ہندوستان کی آزادی کا خواب شاید صدیوں تک پورا نہ ہو۔ اس محکمے کا کام جنگ کے حق میں رائے عامہ

ہموار کرنا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینا تھا۔ تاکہ پوری قوم یکسو ہو کر ایک مقصد کے حصول کے لیے آمادۂ عمل ہو جائے۔ کنور صاحب نے فہم کے اسی پہلو پر زیادہ زور دیا۔ اس سلسلے میں ادیبوں، شاعروں، اور صحافیوں کے وسیع حلقے سے ان کے مراسم قائم ہوئے۔

کنور صاحب کو سرکار کی طرف سے ایک فنڈ دیا گیا تھا۔ اس فنڈ سے خفیہ طور پر وہ مختلف صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کو وقتاً فوقتاً کچھ دیتے رہتے تھے اور اس کے صلے میں یہ چاہتے تھے کہ وہ ایسے اداریئے، مضامین اور نظمیں وغیرہ لکھیں جو ہندو مسلم اتحاد کے جذبات کو ابھاریں اور ملک میں قومی یکجہتی کی فضا قائم ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کنور صاحب نے مختلف النوع ثقافتی تقریبوں کا بھی اہتمام کیا۔ جن میں مشاعرے، قوالیاں اور دوسری ایسی ہی محفلیں شامل تھیں۔

یہ تجربہ آزادی کے بعد بھی کنور صاحب کے کام آیا اور انھوں نے تقسیم ملک کے فوراً بعد کے پُر آشوب دور کی افراتفری، تشدد پسندی اور فرقہ واریت پر قابو پانے کے لئے شعر و ادب اور دوسری ثقافتی سرگرمیوں کو ایک وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنی آپ بیتی 'یادوں کا جشن' میں بہت تفصیل سے کیا ہے۔ جو بصیرت آموز بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

کنور صاحب اپنے زمانۂ ملازمت میں جہاں جہاں بھی رہے، ادبی اور ثقافتی محفلیں سجانے کا اہتمام کرتے رہے۔ اور ادیبوں و شاعروں کا ایک بڑا حلقہ ان کے آس پاس رہا۔ جوشؔ ملیح آبادی کا ایک شعر ہے۔

ہم شاعروں کی وضعِ جنوں کے اٹھائیے ناز
نامرد قوم میں یہ شرافت کہاں ہے جوشؔ

لیکن کنور صاحب شاعروں کی وضعِ جنوں کے ناز اٹھانا بھی جانتے ہیں اور انھوں نے بعض شاعروں کی ایسی ایسی حرکتیں انگیز کی ہیں جو کوئی دوسرا برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے دوست مخمور سعیدی راوی ہیں کہ ایک بار سنگرور ضلع کے کسی مقام پر کوئی مشاعرہ

اُنہی کے اہتمام میں ہو رہا تھا۔ نریش کمار شاؔد بھی جواب اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ مشاعرے میں شریک تھے، مشاعرے کی کارروائی کنور صاحب چلا رہے تھے، وہ شاد کی بلانوشی سے واقف تھے اس لیے انھوں نے شاؔد پر نظر رکھی کہ وہ زیادہ نہ پی جائیں۔ لیکن وہ نظر بچا کر مشاعرے سے کھسک گئے اور کہیں سے اتنی پی آئے کہ نہ ہوش وحواس بجا رہے نہ ہاتھ پیر قابو میں... کنور صاحب نے ان کی یہ حالت دیکھ لی۔ مگر اسٹیج پر کیا کہتے۔ وہ مشاعرے کی کارروائی چلاتے رہے، کہ اچانک شاؔد اپنی جگہ سے اٹھے، پتلون کے بٹن کھولے اور سامعین کی طرف رُخ کر کے پیشاب کرنے لگے۔ سامعین کی صفوں میں سینکڑوں خواتین بھی تھیں۔ ایک ہنگامہ مچ گیا اور لوگ اسٹیج کی طرف نفرت اور غصّے کا طوفان لئے اس طرح لپکے کہ شاؔد ان کے ہاتھ لگ جاتے تو خیر نہیں تھی۔ مگر آناً فاناً ہی کنور صاحب نے شاؔد کو اسٹیج سے اٹھوا کر کسی محفوظ مقام تک پہنچا دیا لوگ بپھرے ہوئے تھے اور بضد تھے کہ شاد کو ان کے حوالے کیا جائے۔ کنور صاحب نے کہا " وہ آپ کا نہیں، میرا مجرم ہے اور منہ چھپا کر کہیں بھاگ گیا ہے۔ مگر میری گرفت سے بچ نہیں سکے گا ۔ اور جو سزا آپ اسے دینا چاہتے ہیں اس سے کہیں کڑی سزا میں اسے دوں گا۔" ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ "یہاں میری موجودگی میں قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا مجاز کوئی نہیں ہے۔" غرض کسی نہ کسی طرح اس نازک موقع کو ٹالا اور راتوں رات شاد کو وہاں سے دِلّی کے لئے روانہ کرا دیا۔ ایسے بیسویں واقعات ہیں جو سننے میں آئے ہیں اور ان میں سے کچھ کا ذکر کنور صاحب نے اپنی آپ بیتی میں بھی کیا ہے۔

کنور صاحب کی ثقافتی مصروفیتیں صرف شعر و ادب یا رقص و نغمہ کی محفلوں تک محدود نہیں ہیں۔ ان محفلوں سے الگ، بٹیروں، تیتروں، یا مرغوں کی پالیاں ہوں، مینڈھے لڑائے جا رہے ہوں، یا پہلوانوں کی کشتیاں ہو رہی ہوں یا کبڈی کا میدان ہو، کنور صاحب بالنفسِ نفیس نظر آئیں گے، اسی طرح فٹ بال کے میچ ہوں، پتنگ بازی ہو، شطرنج ہو یا کیرم کے ٹورنامنٹ کنور صاحب ان میں انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوں گے اور شریک ہونے والوں میں اُن کی حیثیت ہمیشہ ممتاز نظر آئے گی۔ بالعموم وہ ریفری یا

جج کے فرائض انجام دیتے ہوئے ملیں گے یا فتح یاب کھلاڑیوں یا ٹیموں کو انعامات تقسیم کرتے ہوئے۔ کنور صاحب کو شکار کا بھی بے حد شوق ہے۔ اور یہ شوق انہیں اپنے خاندان سے ورثے میں ملا ہے۔

مومن خان مومن کا یہ مصرعہ ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

یہ مصرع کنور صاحب پر حرف بحرف صادق آتا ہے۔

فلمسازی ایک ایسا شعبہ ہے جس کے تصور ہی سے اچھے اچھوں کے حوصلے پست پڑ جاتے ہیں۔ لیکن کنور صاحب نے یہ میدان بھی سر کر دکھایا۔ انھوں نے پنجابی میں بھی فلمیں بنائیں اور ہندی میں بھی! جو بامقصد بھی ہوتی تھیں اور کاروباری لحاظ سے کامیاب بھی۔

فلمی شخصیتوں میں کئی بڑے فنکاروں سے کنور صاحب کے ذاتی مراسم ہیں۔ جن میں دلیپ کمار، سنیل دت، نرگس دت، مینا کماری، گلوکار محمد رفیع اور اوم پرکاش کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

محمد رفیع کے انتقال کے بعد جب میں نے فلمی ستارے میگزین، کا محمد رفیع نمبر، نکالنے کا فیصلہ کیا تو میں رفیع مرحوم کے خاندان سے ملنے بمبئی میں ان کے مکان ،رفیع ولا، واقع باندرہ پہنچا، میں رفیع مرحوم کی البم سے اپنے خصوصی نمبر کے لئے فوٹوؤں کا انتخاب کر رہا تھا کہ کنور صاحب بھی وہاں تشریف لائے۔ اور انھوں نے مرحوم کے خاندان سے اس طرح تعزیت کی جیسے کوئی اپنے قریبی عزیزوں سے کرتا ہے۔

کنور صاحب کی رنگا رنگ شخصیت نے انہیں ہندوستان میں ہی نہیں ہندوستان سے باہر بھی مقبول اور محترم بنا دیا ہے پاکستان میں ان کی راہوں میں اس طرح لوگ آنکھیں بچھاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ سربراہِ مملکت کا استقبال کر رہے ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں، شعر و ادب اور تہذیب و ثقافت کی مملکت کے

کے سربراہوں میں تو ہیں ہی۔

کنور صاحب نے ہمیشہ محبت اور دوستی کی سوغات بانٹی ہے۔ نجی دوستوں میں بھی اور مختلف فرقوں اور قوموں میں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے اپنی ایک نشری تقریر میں یہ کہا "کہ جب تک ہندوستان میں بیدی صاحب جیسے لوگ موجود ہیں ہمیں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستانہ مراسم کی اُمید سے کنارہ کش ہونے کی ضرورت نہیں۔"

کنور صاحب اب کسی سرکاری عہدے پر نہیں ہیں لیکن خواص میں اثر و رسوخ اور عوام میں ان کی مقبولیت اب پہلے سے بھی زیادہ ہے اور اس کی وجہ ہے ان کی شخصی وجاہت اور ان کا وہ خاندانی پسِ منظر ہے جو بجائے خود اعزاز و اکرام کا سرچشمہ ہے۔ دلّی کی ثقافتی اور ادبی زندگی کی چہل پہل آج بھی کنور صاحب کی مرہونِ منت ہے اور دلّی سے باہر بھی جو بڑے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں، کنور صاحب کی شرکت ان کی رونق دوبالا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کنور صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ ایسی انجمن جہاں ادب، ثقافت، تہذیب، شرافت اور انسانیت ایک ہی مسند پر جلوہ گر ہیں۔ اور کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت دونوں کا منظر پیش کر رہی ہیں۔

نفیس بانو شمع

کوزے میں سمندر۔ کنور مہندر سنگھ بیدی

اُردو کے مصروف ترین شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے جب میں پہلی بار ملی تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا جو لوگوں سے میں اب تک سنتی آئی تھی ۔ اس لمحہ میرے ہونٹوں پہ میرا ہی یہ شعر بے ساختہ مچل اُٹھا ؎

شاعر کا تخیل ہو کہ پھولوں کا جگر ہو
وہ کون سا فنکار ہے تم جس کا ہُنر ہو

سفید کرتے پاجامے میں ملبوس موصوف نے جس وقت قدرے جھک کر آداب کہا تو ایسا لگا کہ سازِ حسن کے خاموش تاروں پر کسی نے چپکے سے اپنی انگلی رکھ دی ہو ۔ نہایت مہذّب، انتہائی خوش اخلاق، سادہ گو، سادہ بیان، مزاج میں لطافت، آداب میں مٹھاس، چہرے پر سمندر سا سکوت، آپ سے گفتگو کے دوران محسوس ہوتا ہے جیسے موسیقی کا سماں بندھ گیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ کنور صاحب کی شخصیت میں ایک سحر ہے جو مخاطب کو پہلی ہی ملاقات میں اُن کا گرویدہ بنا لیتا ہے ۔چند لمحوں بعد جب کنور صاحب ہمارے ڈرائنگ رُوم سے اُٹھ کر تشریف لے جانے لگے تو میں نے دیکھا کہ اُن کا قد پہلے سے کئی گُنا زیادہ بڑھ گیا تھا۔

اِس وقت میرے ہاتھوں میں ان کی کتاب "یادوں کا جشن" ہے جس پر مجھے کچھ لکھنا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ سمندر کو کوزے میں کیسے سمیٹوں! فن اور زندگی کی حقیقتوں کو لئے ہوئے اُن کی یہ کتاب بے حد دلچسپ اور اہم ہے۔ اسلوبِ بیان سادہ اور سلیس ہے، آپ کی تحریر مذہبی تعصّبات سے مبرّا ہے۔ کردار نگاری، منظر نگاری اور واقعہ بندی کو دیکھا جائے تو یہ کتاب ادبی حیثیت سے اور بھی بلند ہو جاتی ہے۔

اُن کا خاندان، اُن کی تعلیم، ان کی ملازمت اور اس کی تفصیلات، بچپن سے لے کر جوانی تک کے دلچسپ واقعات جوش و صداقت، اور رنگینیٔ جذبات کو موصوف نے جس دیانت داری سے حوالۂ قلم کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ اُن کے ہر واقعہ کے پسِ پردہ انسانی محبّت اُبلی پڑتی ہے۔ اس میں کنور صاحب اور ان کے والد و خاندان کے دیگر افراد کے شکاری کارنامے حیرت انگیز ہی نہیں قابلِ فخر بھی ہیں جس پر جتنی داد دی جائے کم ہے۔
—— اس میں کنور صاحب کی غیر معمولی صلاحیتوں کا ثبوت جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ بہ حیثیت شاعر بھی کنور صاحب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کے کلام میں شیرینی، متانت، ملاحت، اور شگفتگی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شہرت کا راز اُن کی سحر بیانی ہے۔ جب بھی میں نے ان کو کسی مشاعرے میں سُنا ہے کسی کے اس شعر کی تفسیر بن گئی ہوں کہ ؎

جلے ہیں زخم دلوں کے روش روش اب کے
دیارِ گُل کی ہوا بے قرار لگتی ہے

سرور تونسوی

مرّبیارو مربہ نخورہ

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ملک کے بعد جب دِلّی کو اپنا مسکن بنا لیا تو "شانِ ہند" کی حیاتِ ثانیہ کی فکر دامن گیر ہوئی چنانچہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دفتر سے معلومات حاصل کیں کہ دلّی میں کسی اخبار یا رسالہ کا ڈیکلریشن داخل کرنے کا کیا طریقہ ہے۔

دفتر کے ہیڈ کلرک جو کافی تجربہ کار اور خالص دِلّی والے تھے، فرمانے لگے صاحب آپ رفیوجی صاحبان کے لئے جہاں حکومت نے کئی سہولتیں دے رکھی ہیں وہاں اخبار کے اجراء کے سلسلے میں ڈیکلریشن داخل کرنے کے سلسلے میں کوئی رعایت نہیں ہے۔ بے شک آپ کا اخبار ملتان (پاکستان) سے تقسیمِ ملک کے وقت شائع ہوتا تھا (اُس وقت شانِ ہند ہفت روزہ تھا) مگر اب آپ ایک دوسرے ملک میں ہیں اور یہاں آپ کو سب کاروائی نئے سرے سے کرنی ہوگی۔ اور جب آپ کو اشاعت کی باقاعدہ اجازت مل جائے جب ہی آپ یہاں سے اخبار کی اشاعت شروع کر سکتے ہیں

ہیڈ کلرک نے کافی تیز رفتاری سے وہ طریقے بتائے، جن کی تکمیل کے بعد ہی مطلب براری ہو سکتی تھی۔ پھر گذارش کی کہ سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹ کیسے ہو سکے گی۔ کیونکہ مجھے بہ حیثیت رفیوجی آس پاس کا کوئی مقامی یا غیر مقامی شخص جانتا ہی نہیں تو

وہ میری بابت کسی سے کیا پوچھ سکیں گے اور میری بابت کیا تصدیق کر سکیں گے ــــ ہیڈ کلرک زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہنے لگے بھائی اس کے دو طریقے ہیں، پولیس کو نذرانہ پیش کیجئے اور یا پھر "مربّی بیار و مربہ بخور"، اس کے ساتھ ہی کہنے لگے شاید تمہیں فارسی نہ آتی ہو تو اس کا مطلب بتا دوں کہ اگر مُربہ کھانا ہے تو کسی مربّی کو لاؤ۔ ہیڈ کلرک نے "مربّی بیار و مربہ بخور"، کچھ اس ادائے کافرانہ سے کہا کہ میری زبان کو بہ یک وقت کئی قسم کے مربہ جات کی خوشبو بھری مٹھاس کا احساس ہونے لگا۔ اور فوری طور پر دماغ میں یہ خیال آیا کہ مُلتان میں دلی کے سٹی مجسٹریٹ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی بہت تعریف سُنی تھی کہ وہ ہر کسی کی مدد کرتے ہیں۔ لہٰذا ان تک رسائی کا کوئی وسیلہ تلاش کیا جائے اور اگر وہ درخواست پر تصدیق فرما دیں تو پھر سی۔ آئی۔ ڈی کے جھنجھٹ سے نجات مل جائے گی۔ چنانچہ ہیڈ کلرک سے احتیاطاً دریافت کیا کہ اگر دلی کے سٹی مجسٹریٹ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر درخواست پر تصدیق فرما دیں تو کیا سی۔ آئی۔ ڈی کی تحقیقات کی پھر بھی ضرورت رہے گی ؟ ہیڈ کلرک نے یقین دلاتے ہوئے کہا کہ اگر کنور صاحب آپ کی تصدیق فرما دیں گے۔ تو پھر ایک ہفتہ میں آپ کو اخبار جاری کرنے کی اجازت مل جائے گی۔

میں ذاتی طور پر کسی طرح بھی کنور صاحب سے واقفیت نہ رکھتا تھا۔ چاندنی چوک سے کوئی ہندو وکیل ایک ماہنامہ شائع کرتے تھے۔ اس ماہنامہ میں سحر صاحب کی غزل اور تصویر ضرور نظر سے گزری تھی۔

چنانچہ دوسرے دن درخواست جیب میں رکھ پوچھتے پاچھتے بلے وارڈ پر واقع کنور صاحب کی سرکاری رہائش گاہ تلاش کی تو وہاں جم غفیر تھا زیادہ تر تعداد ان مسلمانوں کی تھی جو ہمایوں کے مقبرے میں مقیم تھے اور یا وہ جو پاکستان جانا چاہتے تھے۔ کنور صاحب کی کوٹھی پر موجود کئی حضرات آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ حالیہ افراتفری اور غارت گری میں کنور صاحب نے مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے اگر اللہ میاں کے ہاں اس کا کوئی حساب کتاب ہے تو پھر اس معاملہ میں شاید ہی کوئی ان کا ہم پلّہ ہو سکے گا۔ اور ایسی حالت میں جب کہ تقسیمِ ملک کے ہڑبونگ میں پاکستانی مسلمانوں نے وہاں کے سکھوں

کو اور ہندوستانی پنجاب کے سکھوں نے مسلمانوں کو اپنا اپنا شکار سمجھا۔ اور مذہبی جنون
کا پورا پورا حیوانی ثبوت دیا۔ مگر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے باباگورو نانک دیوجی مہاراج
کی اولاد ہونے کا ثبوت دیا کہ جو بھی مسلمان ان کی پناہ میں آیا یا جس نے جو بھی مدد طلب
کی کنور صاحب نے ایک صحیح گورو کا سکھ ہونے کے ناطے اپنے فرض کو خوب خوب
نبھایا۔ اور یہی وجہ ہے کہ کنور صاحب کی ان خدمات نیز ان کا مذہبی تعصب سے لاکھوں
کوس دور ہونے کے باعث ہندوستان اور پاکستان کا ہر مسلمان انہیں اپنا مربی سمجھتا ہے۔
یہاں تک کہ ڈھاکہ فال کے موقع پر پاکستانی فوج کے نوے ہزار افراد جب جنگی قیدی
بنا کے مختلف یول کیمپوں میں رکھے گئے تو ہماری حکومت نے کچھ مقررین کو ان یول کیمپوں
میں تقاریر کے لئے بھجوایا تو ان پاکستانی مسلمان جنگی قیدیوں نے ہماری حکومت کے
افسران سے کہا کہ ہمارے ہاں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو تقریر کے لئے بھجوائیے
کیونکہ ہم سب ان کو اپنا مربی سمجھتے ہیں چنانچہ ان یول کیمپوں میں کنور صاحب متعدد بار
تشریف لے گئے اور ان جنگی یول کیمپوں کے مقیم پاکستانی مسلمان کنور صاحب کا خیر مقدم
ایسے ڈھنگ سے کرتے تھے کہ جیسے ان کا واقعی کوئی ہم وطن مربی ان کی مزاج پرسی کو آیا ہو۔
اس افراتفری کے زمانے میں بھی کنور صاحب کی کوٹھی پر کبوتر بازوں مُرغ بازوں
اور تیتر لڑانے والوں کی موجودگی اس امر کی مظہر تھی کہ جہاں کنور صاحب موصوف ادب
اور شاعری کا ذوق جنوں کی حد تک رکھتے تھے وہاں اس شئے لطیف کے ساتھ ساتھ
ان رئیسانہ روایات کو بھی جاری وساری رکھے ہوئے ہیں۔

ایک صاحب غرض سے پوچھا کہ کنور صاحب سے ملاقات کیسے ہو فرمانے لگے
وہ دیکھئے سامنے کرسی پر بیٹھے مرغوں کی لڑائی دیکھ رہے ہیں۔ کیسی اشنان کے باعث
کنور صاحب سر کے بالوں کو بکھرائے ہوئے تھے اور فسانۂ آزاد کے ان روائتی کرداروں
کا مظاہرہ بھی ملاحظہ فرما رہے تھے۔

دو گھنٹے تک میں اسی جم غفیر میں کھڑا کنور صاحب کی مصروفیات کا جائزہ لیتا رہا
اور جونہی موقع غنیمت سمجھا کنور صاحب کو آداب کہتے اور اپنا مدعا ظاہر کرتے ہوئے

درخواست ان کے سامنے کر دی - درخواست کو پڑھے بغیر آواز لگائی ارے کوئی ہے
حالانکہ وہاں کوئی تو کیا بہت سے تھے ایک منحنی سے صاحب دوڑے ہوئے آئے اور
کنور صاحب نے انہیں حکم دیا کہ اندر سے قلم لے آؤ- قلم آتے ہی فرمانے لگے اس پر
کیا لکھ دوں - عرض کیا کہ ایسا لکھ دیجئے کہ ڈیکلریشن بغیر سی- آئی-ڈی کی تحقیقات کے
مل جائے - چنانچہ کنور صاحب نے انگریزی میں چار پانچ سطریں درخواست پر لکھ کر
فرمایا کہ کل صبح میری کچہری میں آکر پیش کار سے میری عدالت کی مُہر لگوا لیجئے اور درخواست
ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں دے دیجئے اگر کوئی وقت پیش آئے تو میری کچہری میں آجائیے گا-

دوسرے دن درخواست کی ہر طرح سے تکمیل کے بعد انہی ہیڈ کلرک صاحب کو
پیش کی گئی تو کنور صاحب کی تحریر پڑھ کر کہنے لگے اسے کہتے ہیں " مربی بیار و مربہ بخور "
اب آپ جائیے اور جمعہ کے روز آجائیے گا- اور ڈیکلریشن داخل کر جائیے گا-

میرے بہنوئی شری لوک ناتھ معہ اہل وعیال کشمیری گیٹ اور اجمیری گیٹ کی درمیانی
فصیل کی ایک محراب میں خیمہ زن تھے - فصیل کی محرابوں میں خیمہ زن رفیوجیوں کو جب
کوارٹرز الاٹ کئے گئے تو میرے بہنوئی کو مالویہ نگر میں کوارٹر الاٹ کیا گیا- الاٹ کردہ
کوارٹروں میں پناہ گزینوں کو لے جانے کے لئے سرکاری ٹرکوں کا انتظام تھا تاکہ ان
پناہ گزینوں سے فصیل خالی کرائی جائے - میرے بہنوئی نے سرکاری کارندوں سے کہا
کہ اِنہیں اسی علاقہ میں ایک فرم میں کام مل گیا ہے - لہذا مالویہ نگر سے یہاں آنا ناممکن
ہو جائے گا کیونکہ اُن دنوں مالویہ نگر سے کوئی بس بھی دہلی نہیں آتی تھی- لہذا مجھے کسی
نزدیک جگہ پر کوارٹر دیا جائے تو کارندوں نے کہا کہ ایک ہزار روپیہ دو ہیڈ کلرک ابھی
تمہارا یہ کام کرا دیں گے - میرے بہنوئی نے ہزار روپیہ دینے سے معذوری ظاہر کی تو
سرکاری کارندوں نے انہیں مع اہل وعیال اور معمولی سامان کے ٹرک میں پھینکا اور
مالویہ نگر لے جا کر ایک ایسے کوارٹر میں چھوڑ آئے جس میں نہ تو پانی کا انتظام تھا اور
نہ ہی روشنی کا-

دوسرے دن میرے بہنوئی میرے ہاں سوئی والان میں آئے اور سارا ماجرہ سنایا-

ڈپٹی کمشنر کے ہیڈ کلرک کسی حد تک شناسا بن چکے تھے۔ میں بہنوئی صاحب کو ہمراہ لے کر کشمیری گیٹ کی کچہری میں گیا اور مذکورہ ہیڈ کلرک سے ملا اور سارا واقعہ انہیں سنایا تو وہ مسکرا کر فرمانے لگے۔ بھائی الاٹ مینٹ والوں کو رشوت نہیں دے سکتے تو پھر وہی نسخہ استعمال کیجئے "مرنی بیار ومربہ بخور" اس کے ساتھ ہی مسکراتے ہوئے فرمانے لگے میاں تمہارے وہی سٹی مجسٹریٹ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر آج کل محکمہ الاٹ مینٹ کے افسرِ اعلیٰ ہیں اُن سے یہ سارا ماجرا کہئے ہاتھ کے ہاتھ کام ہو جائے گا۔

ہم دونوں ریلوے اسٹیشن کے سامنے دفتر الاٹ مینٹ (اب یہ بلڈنگ ـــــ دلی پبلک لائبریری ہے) پہنچے تو یہاں بھی اتنی بھیڑ تھی کہ کھوے سے کھوا اچھلتا تھا۔ ہر شرنارتھی کنور صاحب تک پہنچنا چاہتا تھا۔ چپڑاسی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ لائن لگائیے ایک ایک آدمی اندر جائیے۔ اس دھکم پیل میں نریش کمار شاد نظر پڑے۔ وہ ایک کمرہ میں داخل ہوا ہی چاہتے تھے کہ میں نے انہیں آواز دے کر متوجہ کیا۔ فرمانے لگے آپ یہاں کیسے؟ مدعا بیان کیا تو فرمانے لگے آئیے میرے ساتھ میں آپ کو کنور صاحب کے پاس لے چلتا ہوں۔ چپڑاسی نے نریش کمار شاد کو نہیں روکا اور میں بھی ان کے ساتھ کنور صاحب کے کمرہ میں گیا تو وہاں بھی تیس چالیس شرنارتھی شور مچا رہے تھے کنور صاحب نے حکم دیا کہ آپ لوگ سب باہر چلے جائیں اور ایک ایک کر کے میرے پاس آؤ تو میں آپ کی بات سن سکوں گا وگرنہ نہیں۔ چنانچہ چپڑاسی نے بڑی مشکل سے غرض مندوں کو باہر نکالا۔ شاد صاحب نے میرا تعارف کرایا تو کنور صاحب فرمانے لگے انہیں کہیں دیکھا ہے اس پر میں نے ان کے احسان کا تذکرہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ کی کوٹھی پر ڈیکلریشن کی درخواست پر تصدیق کرانے حاضر ہوا تھا۔ شاد صاحب نے کنور صاحب سے سارا معاملہ بیان کیا تو کنور صاحب نے میز پر رکھی گھنٹی بجائی اور چپڑاسی کو حکم دیا کہ فلاں صاحب کو بلا لائے۔ یہ صاحب آئے تو کنور صاحب نے پوری افسرانہ شان میں حکم دیا کہ انہیں ساتھ لے جائیے اور یہ جہاں بھی کواٹر چاہتے ہیں وہیں کا الاٹ مینٹ کر دیا جائے اور مالویہ نگر والا کواٹر کینسل کر کے ان کا سامان وغیرہ سرکاری ٹرک میں منگا کر نئی الاٹ مینٹ کا قبضہ دلائیے۔ کنور صاحب کا شکریہ ادا

کرتے ہوئے میں ان صاحب کے ساتھ باہر آیا تو پانچ منٹ میں انھوں نے ہماری مرضی
کے مطابق کشمیری گیٹ اور اجمیری گیٹ کی فصیل والی سڑک پر حسن بلڈنگ کے پاس جو
کوارٹر بنے تھے ان میں سے ایک کوارٹر الاٹ کرکے ضروری کاغذات ہمیں دے دیئے ۔
تو ڈپٹی کمشنر کے ہیڈ کلرک کا فرمان یاد آگیا "مربی بیار و مربہ بخور"۔ فرداً فرداً اگر اس
مربی اعظم کے احسانات کا ذکر کیا جائے تو کم وبیش ایک صد سے زائد ایسے واقعات ہیں جن
میں محض کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی مربیانہ کرم فرمائیوں کے دخل کے باعث ہی مطلب براری
ہوئی ۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی یہ شانِ مربیانہ ہر کسی کے لئے بلاتخصیص مذہب وملت
ہر وقت رواں دواں رہتی ہے ۔ آپ ڈھونڈے سے بھی کسی ایسے ایک شخص کو بھی تلاش
نہیں کر سکتے جو کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے یہاں کسی غرض سے گیا اور وہ بے نیل ومرام
آیا ہو۔ اکثر اوقات کنور صاحب نے اپنی اس شان مربیانہ کو بروئے کار لاکر کمال کر دیا
حالانکہ وہ معاملہ ان کے اپنے احاطۂ اختیار میں نہیں ہوتا تھا۔

خدا اس مربی اعظم کو مدتوں ہم سب پر سایہ فگن رکھے اور ان کے اس شانِ مربیانہ
میں اضافہ فرمائے۔ تاکہ ان کے ذریعہ کئی ایسے غرض مند بھی فیض یاب ہو سکیں۔ جن کی اس
نفسا نفسی کے زمانے میں کوئی سننے والا نہیں ؎

نام اور نمود سے جو بالا ہے
کس قیامت کے نقش والا ہے

ڈاکٹر راہی

سلامِ عقیدت

میری کمزوری ہے اور شاید یہ کمزوری کم یا زیادہ نفسیاتی ہی نہیں اخلاقی بھی ہو کہ آسانی سے میں کسی شخصیت سے متاثر نہیں ہوتا ہوں اور ہوتا بھی ہوں تو عموماً زیادہ متاثر نہیں ہوتا ہوں لیکن جہاں تک کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہے اُسی دن سے جب پہلی بار میں اُن سے متعارف ہوا یہ کمزوری کم اثر انداز ہوئی ہے نیز جتنا میں ان کے قریب تر ہوتا گیا ہوں اتنا ہی ان کی بے لاگ دوستی اور خلوص کا میں قائل ہوتا گیا ہوں۔

جب میں نے اردو شاعری کے میدان میں قدم رکھا میں کنور صاحب کے لئے بالکل اجنبی تھا میرے چند اشعار نے مجھے کنور صاحب سے متعارف کرایا اور پھر اجنبیت ختم ہو گئی ان کی سادہ مزاجی ہر شاعر اور ادیب کے لئے خیرسگالی اور دوستی سے پُرخلوص جذبے اور اردو ادب سے بے لاگ اور بے غرض محبت نے مجھے خرید لیا میں اکثر سوچتا ہوں کہ آج غالب ہوتے اور کنور صاحب سے اچھی طرح متعارف ہوتے تو شاید یہ فرماتے ؎

آدمی کو بھی میسر تو ہے انسان ہونا

اردو کے مشہور و معروف شاعر جناب دلاور فگار نے کہا ہے ؎

شرافت میں مروّت کو ملایا	سیاست کو پھر اُس میں سے نکالا
محبّت سے پھر اس کو ضرب دیدی	جواب آیا "مہندر سنگھ بیدی"

یہ قطعہ حقیقت پر مبنی ہے واقعی کنور صاحب اخلاص، ادب نوازی اور قومی یکجہتی کے ایک روشن مینارہ ہیں۔ برصغیر کے مایہ ناز شاعر اور اردو کے عظیم مجاہد تو آپ ہیں ہی سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ آپ حقیقی معنوں میں انسان ہیں بلکہ ایک عظیم انسان ہیں۔

حیات لکھنوی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ ایک ہمہ گیر شخصیت

محترم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا خیال آتے ہی نہ معلوم کتنی بھولی بکھری یادیں سمٹ کر سامنے آجاتی ہیں اور مزاج میں شگفتگی آنکھوں چمک اور دل کو تقویت سی محسوس ہونے لگتی ہے، یہ کنور صاحب کی باغ و بہار شخصیت کا پہلا مجموعی تاثر کتنا شاداب، کتنا خوش نصیب ہے۔

کنور صاحب سے میری پہلی ملاقات فروری ۱۹۵۰ء میں جوش ملیح آبادی کے دفتر آج کل میں ہوئی تھی، جوش صاحب جب کسی سے مجھے متعارف کراتے تو کہتے یہ میرے استادزادہ حیات لکھنوی ہیں یعنی لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی کے فرزند خود بھی گجل کہتے ہیں، غزل کو کبھی کبھی جوش صاحب از راہ مزاح گجل فرمایا کرتے تھے، کنور صاحب سے بھی انھوں نے یہی فرمایا، کنور صاحب اس وقت جوش صاحب کو حسب قرارداد سونی پت کے مشاعرے کے لیئے لینے آئے تھے وہاں بسمل سعیدی، عرش ملسیانی اور جگن ناتھ آزاد بھی موجود تھے جنھیں ساتھ جانا تھا، کنور صاحب نے مجھے بھی مشاعرے میں مدعو کر لیا اور سونی پت کے لئے سب روانہ ہو گئے اُس کے بعد میری ملاقاتوں کا سلسلہ کنور صاحب سے جاری ہو گیا۔

کنور صاحب نے مشاعروں کے انعقاد کے لیئے دُور دُور تک لوگوں کو ترغیب دی جس سے نہ صرف شاعروں کو مالی فائدہ پہنچا بلکہ اُردو کی خدمت بھی ہوتی رہی

کنور صاحب نے گمنامی کے غار سے جن شاعروں کو نکال کر دنیائے ادب سے روشناس کیا اُن کی تعداد بہت ہے، بعض تو اُن میں شہرت کی اُس منزل میں ہیں کہ اگر اُن کا نام لکھوں تو شاید اُنھیں بُرا لگے لیکن ایک نام مخمور دہلوی کا ایسا ہے جس کا اعتراف مرحوم خود بھی کرتے تھے اور میں نے دیکھا ڈیڑھ دو سال کی مدت میں مخمور دہلوی کی شہرت ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں اتنی ہو گئی تھی کہ اُن کے بغیر شاید ہی کوئی مشاعرہ ہوتا ہو اور یہ تلاش اور پیش کش صرف کنور صاحب کی تھی۔

میرے نزدیک آزادی کے بعد شعر و ادب کا یہ سنہرا دور تھا، دبستانِ دہلی اپنے جواہر پاروں سے جس محل پر جگمگا رہا تھا اس کے یہ چار سُتون تھے شنکر پرشاد صاحب چیف کمشنر دہلی، ودیا شنکر، جوشؔ ملیح آبادی اور کنور مہندر سنگھ بیدی، ان میں دوستانہ مراسم کے علاوہ حفظ مراتب کے ساتھ پر خلوص رویے کار فرما تھے، ذاتی مقاصد کا نام ونشان نہیں تھا، ان بزم آرائیوں کو سب سے بڑا نقصان پہنچا جوشؔ صاحب کے پاکستان منتقل ہونے سے، پھر ودیا شنکر چل بسے اور شنکر پرشاد صاحب نے گوشہ نشینی اختیار کر لی، اب کنور صاحب اس جم غفیر میں اپنی تنہائیوں کا شکار ہیں، میں جب انھیں دیکھتا ہوں مجھے خوشی ہوتی ہے اور دکھ اس لیے ہوتا ہے کہ بہت سے کھوئے ہوئے چہرے آنکھوں کے سامنے آنے لگتے ہیں، ادبی قدروں کی وابستگی اخلاقی رویوں کے ساتھ رہی ہے، میں نے کنور صاحب کو جن عظیم ہستیوں کے درمیان محترم پایا وہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر اور اپنی مثال آپ تھے۔

کنور صاحب جس محفل میں ہوں اس کی کامیابی یقینی بن جاتی ہے مشاعروں کی نظامت انھوں نے بے شمار فرمائی ہے لیکن بہت کم مشاعروں میں پہلے شاعر سے آخری شاعر تک رہے ہوں گے عموماً یہ ہوا کہ نظامت کے فرائض ادا کرتے ہی اپنے پسندیدہ شاعروں کو پڑھوا دیا اور کوئی واجبی معذرت فرما کر چل دیئے۔ دراصل کنور صاحب کو چیمسفورڈ کلب سے دلی لگاؤ رہا ہے، وہ اپنے دہلی کے قیام میں یہی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کی ہر شام وہاں گزرے۔ اس کلب کی رونق بڑھانے اور اسے تاریخی حیثیت دینے میں کنور صاحب

شاملِ حال رہے ہیں، یہاں ایسے مشاعرے ہوتے ہیں جس میں جواہر لال نہرو کے علاوہ اُردو کے مایۂ ناز شاعروں نے شرکت کی ہے۔

".... میں اپنے ایک دوست کی خاطر سو اُصول توڑنے کو تیار ہو جاتا ہوں"، یہ قول کنور صاحب کا ہے جو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور اصول کی بنا پر حکومت ہند کے ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے ہیں جن کے دوستوں کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔

کنور صاحب نے اپنی کتاب "یادوں کا جشن" میں اپنی عدالتی زندگی کے تذکرے میں عدالت اور شہادت پر تبصرہ کچھ یوں کیا ہے کہ بعض اوقات ایک مجرم کو بے شمار شہادتیں نہیں بچا سکتیں لیکن صرف ایک بیان اُسے مجرم بنا دیتا ہے اور اس کا دار ومدار منصف کے مطمئن ہونے پر ہوتا ہے اسی طرح تمام سجے سجائے سند یافتہ اصول ایک صداقتی عمل پر ڈھیر ہو سکتے ہیں صرف مطمئن ہونا ضروری ہے، یہ بات میرے علم میں بھی ہے کہ کنور صاحب نے خطرناک حد تک اپنے دوستوں کا ساتھ دیا اور اُن کی مشکلوں کو آسان کیا ہے، اس جذبۂ ایثار کی کوئی مثال نظر نہیں آتی، اُن کی اس عملی روشنی میں جو پرکھ اور جرأتِ عزم ہے وہ اُنھیں وراست میں اپنے جدِّ اعلیٰ سے ملی ہے، کنور صاحب براہ راست گورونانک جی کی سترہویں پشت ہیں یہ واجب التعظیم غیر معمولی تعلق و دیعتی ہے یہ دنیاوی اعزاز نہیں جو ذاتی یا شخصی تعلقات پر حاصل کیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اُن کی اقبال مندی ایک مسلّمہ رہی ہے اجداد کی خصوصیات کتنی مسخ ہو جائیں پھر بھی حوالے ضرور ملتے ہیں۔ اُن کی اقبال مندی سے متعلق ایک واقعہ یاد آگیا ملاحظہ کیجیے۔

۱۹۴۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ڈی۔ سی۔ ایم فٹبال ٹورنامنٹ نے اعلان کیا کہ محمڈن اسپورٹنگ کا کھیل فلاں تاریخ کو ہوگا امبیڈکر اسٹیڈیم جو اُس وقت دِلّی گیٹ اسٹیڈیم کے نام سے مشہور تھا اُس دن فٹبال کے شائقین سے کھچا کھچ بھر گیا ٹکٹ کی فروخت بند کر دی گئی تھی، کھیل کا وقت قریب آیا، لوگوں کو نہ معلوم کہاں سے معلوم ہو گیا محمڈن ٹیم نہیں آئی اور واقعی نہیں آئی تھی سب نے شور مچانا شروع کر دیا دنگا فساد ہونے کا خطرہ تھا ٹورنامنٹ کے کنوینر صاحب پریشان تھے تھوڑی دیر میں وہ کنور صاحب کو مہیا

کر کے لے آئے، کنور صاحب مائک پر آئے شور مچانے والے خاموش ہو گئے، کنور صاحب نے محمڈن ٹیم کے نہ آنے کی چند مجبوریاں بتائیں اور دو رباعیاں سنائیں، جدھر سے زیادہ شور ہو رہا تھا اُدھر سے بلند آواز میں فرمائش ہوئی "غزل سناؤ غزل" اور کنور صاحب نے غزل کے چند شعر سُنا دیئے، لوگوں نے تالیوں سے اُنھیں داد دی، معاملہ رفع دفع ہوا اور نہ اُس روز اسٹیڈیم میں کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور ہوتا دوسرے روز اخباروں نے کنور صاحب کی غزل سرائی کو معجزہ ٹھہرایا۔

کنور صاحب کی شخصیت اتنی ہمہ گیر ہے کہ چند اوراق میں اس کا احاطہ کرنا محال ہے جن حضرات کو اُن سے ملاقات کا شرف حاصل ہے وہ میری تائید کریں گے کہ کنور صاحب پہلوانوں، شکاریوں، تیتر بازوں، فٹبالروں، باکسروں یا شاعروں میں کسی کی صف میں ہوں اُن میں پوری دلچسپی کے ساتھ نظر آتے ہیں یہ موجودگی اعزاز کی حد تک نہیں بلکہ ان میں اُن کی معلومات سے لوگ مستفیض ہوتے ہیں وہ جب کسی کو کوئی مشورہ دیتے ہیں تو وہ اپنی نیازمندانہ توجہ کا اظہار کرتا ہے۔

ایک مرتبہ دہلی آٹو موبائل آصف علی روڈ کے دفتر میں جہاں کنور صاحب تشریف لایا کرتے تھے پہنچا تو دیکھا بسمل سعیدی صاحب بیٹھے ہیں اور اُن کے سامنے ایک اور صاحب ہیں جن کے ہاتھ پر باز ہے اور کنور صاحب باز کے اوصاف اور اس کے کارناموں پر روشنی ڈال رہے ہیں، مجھے بسمل صاحب نے اپنے پاس صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اُس وقت مجھے یہ محسوس ہوا کہ بسمل صاحب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ ابھی باز کی صفات ختم نہیں ہوئی تھیں کہ ہندوستان کے مشہور پہلوان مہردین کمرے میں داخل ہوئے کنور صاحب نے اُن کو گلے لگایا پیٹھ ٹھونکی، مہردین کے ساتھ ایک پہلوان اور تھا کنور صاحب نے مہردین کا سب سے تعارف کراتے ہوئے ہم لوگوں سے ملوایا کنور صاحب نے بسمل صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مہردین سے کہا "ان سے ملو جس طرح تم ہندوستان کے مشہور پہلوان ہو اسی طرح یہ مشہور استاد شاعر بسمل سعیدی ہیں" اب ہاتھ ملانے کی رسم قابل دید تھی، مہردین نے اپنا ہاتھ بسمل صاحب کی طرف بڑھا دیا لیکن بسمل صاحب کا ہاتھ

کس طرح اور کتنے وقفے میں مہر دین کے ہاتھ سے ملا یہ عجیب منظر تھا، نہیں معلوم کیوں اُس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے کچھ خائف ہوں، خیر خدا کا شکر ہے کہ ہاتھ ملے۔

کنور صاحب نے اتنے میں مہر دین کے ساتھی سے فرمایا "کہو میاں ریاض و یاضں ہو رہے ہیں اس نے نفی میں گردن ہلائی اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کنور صاحب نے کہا سینہ دکھاؤ؟ اس نے کرتہ اتارا اور حسبِ ارشاد سینے کو پھلایا اور کنور صاحب نے اپنے دستِ مبارک سے اُس کے سینے کے بعض پٹھوں کو دبا دباکر دیکھنا شروع کر دیا، بالکل اسی طرح جیسے بکروں اور مرغوں کو دیکھا جاتا ہے، کنور صاحب دیکھ بھی رہے تھے اور ہدایات بھی جاری کر رہے تھے پھر یکایک کنور صاحب نے اپنا کرتہ اتار دیا اور دائیں ہاتھ کو زور سے دباکر بائیں طرف لائے اور اس عمل سے جو سینہ کا ایک حصّہ نمودار ہوا اسے دکھاکر کہنے لگے دیکھو میں بوڑھا ہوگیا ہوں لیکن میرے اس حصے کو دیکھو، وہاں بیٹھے ہوئے سب ہی واہ واہ کر رہے تھے صرف بسمل صاحب خاموش بیٹھے ہوئے تھے میں نے ان کو دیکھا تو وہ اس قدر سمٹ کر گُم صُم ہوگئے تھے کہ وجود مشتبہ ہوگیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کنور صاحب کی ساری توجہ اگر ایک طرف ہوتی تو وہ اپنی مثال آپ ہوتے ؎

؎ ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے (غالب)

کوئی فن ہو سوتی رقابت برداشت نہیں کرتا بلکہ ریاضت کا سفر روحانیت تک لازمی ہے ؎

؎ غرق ہو کر رول لو موتی خود اپنے واسطے
ڈوب کر اُبھرو تو اوروں کے لیئے ساحل بنو (عزیز لکھنوی)

اس ضمن میں جگر مرادآبادی سے متعلق ایک بات سنئے، جگر صاحب سے کسی نے پوچھا آپ کا شغل کیا ہے، جگر صاحب نے فرمایا شاعری وہ حضرت یہ سمجھے کہ جگر صاحب

سوال کا مفہوم نہیں سمجھے انھوں نے دوبارہ پوچھا میرا مطلب ہے شاعری کے علاوہ آپ کا شغلِ معاش کیا ہے جگر صاحب نے پھر جواب دیا شاعری اور اسی کے ساتھ فرمایا "جناب شاعری کوئی ایسا معمولی شغل ہے کہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا شغل بھی کیا جاسکتا ہے"۔

دراصل کنور صاحب کا مزاج (Sportsman Spirit) کا مرقع ہے وہ فراخ دلی کے ساتھ تمام مشاغل اپناتے رہے ہیں شعر و شاعری سے انھیں فطری لگاؤ ہے وہ اُردو کے اُن باکمال اساتذہ کی صحبتوں میں رہے ہیں جو مجتہد کی حیثیت رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ شاعری میں کنور صاحب کے تلامذہ کی تعداد خاصی ہے اُن کے شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں اُنھوں نے نثریں بھی لکھی ہیں

"یادوں کا جشن"، اُن کی خود نوشت تقریباً ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل کتاب اردو ادب میں قبولیت کا درجہ رکھتی ہے جو ۲ سال پہلے شائع ہوئی تھی اور اب دوبارہ اشاعت کی منزلوں میں ہے۔

کرتے ہیں آج خاتمۂ گفتگوئے شوق
بس ایک بات ہے جو کہیں گے اُنھیں سے ہم (عزیز لکھنوی)

اور وہ بات یہ ہے کہ کنور صاحب نے اپنی کتاب "یادوں کا جشن" میں جہاں اکابرین و مشاہیر کا ذکر کیا ہے وہاں مشاہدہ نکہت کا تذکرہ اُن الفاظ میں کیا ہے جس سے اُن کی عظمت میں چار چاند لگتے ہیں

آخر میں کنور صاحب کے متعلق جوش صاحب کے تاثرات کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"۔۔۔ میں بڑی دیانت کے ساتھ کہتا ہوں کہ جب دنیا کے دو پاؤں پر چلنے والے اربوں درندوں کے درمیان جن کو دھوکے سے آدمی سمجھا جاتا ہے بیدی صاحب کے سے انسان دیکھتا ہوں تو سوچنے لگتا ہوں کہ اس ہولناک ماحول میں بیدی کا سا انسان پیدا کیوں کر ہوگیا، ہو نہ ہو یہ روزگار کا ایک عظیم اعجاز ہے ان کا کاسۂ سر اس قدر موزوں ہے کہ تاجِ انسانیت اس پر ٹھیک منطبق ہو جاتا ہے نہ ڈھیلا ہوتا ہے نہ تنگ۔۔۔" (جوش)

کے۔ایل۔نارنگ ساقی،صاحب سنگھ،جمیلہ بانو،کنور مہندر سنگھ بیدی،ریاض کھوکر منسٹر پاکستان ایمبیسی
محمد حسن عسکری منسٹر پاکستان ایمبیسی،حاجی انیس دہلوی اور ایم۔ایل گپتا کے ساتھ

کے ایل۔نارنگ ساقی،قتیل شفائی،پروفیسر گوپی چند نارنگ اور موہن شرما کے ساتھ۔

کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی، قتیل شفائی، کملیشور اور رعنا سحری کے ہمراہ

کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی، قتیل شفائی اور فکر تونسوی کے ہمراہ

رعنا سحری

اِندردھنُش

قبلہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب کا میں شاگرد بھی ہُوں اور مُنہ بولا بیٹا بھی۔ اِس لئے مجھے ان سے عقیدت بھی ہے، محبّت بھی۔ شاعری اور زِندگی کا جو تھوڑا بہُت شعُور مجھ میں ہے وہ اُنہیں کا دِیا ہُوا عطیہ ہے۔ ابھی میں طفلِ مکتب ہُوں اور سحر صاحب پر کوئی خوبصورت مضمُون لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ یوں سمجھ لیجیئے اس ٹُوٹی پھُوٹی تحرِیر میں بس اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہُوں۔

کسی شخصیت کے دو۔ ایک پہلو ایسے ہوتے ہیں جن پر وضاحت کے ساتھ لکھا۔ یا کہا جا سکتا ہے۔ اور اُنہیں کی روشنی میں اُس کا کردار اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ مگر سحر صاحب کی ذات اتنے اوصاف کا مرکب ہے کہ کِسی ایک نظریہ پر ان کی پہچان قائم کر لینا تقرِیباً ناممکن ہے۔ جس طرح اِندر دھنش میں ڈھیر سارے رنگ ہوتے ہیں اور سبھی کو یکجا کرنے پر اِندردھنُش بنتا ہے۔ اُسی طرح سحر صاحب میں جتنی صفتیں ہیں وُہ جُدا جُدا تو بہُت سے لوگوں میں پائی جا سکتی ہیں۔ لیکن سبھی کا ایک ہی شخصیت میں سما جانا ایک معجزہ ہی ہو گا۔ اور سحر صاحب وہ معجزہ ہیں۔!

سحر صاحب ۹ مارچ ۱۹۰۹ء میں ضلع ساہی وال (جو اب پاکستان میں ہے) میں پیدا

ہوئے۔ آپ کے والدِ محترم حضرت بابا ہردت سنگھ بیدی وہاں کے بہُت بڑے زمیندار تھے۔ جن کی آراضیات ہزاروں ایکڑ کے رقبہ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ آپ کے دادا حضرت بابا سُرکھیم سنگھ جی بیدی صُوفی تھے۔ جن کے معتقدین کی تعداد لاکھوں میں تھی اور سب سے بڑا اعزاز تو یہ ہے کہ سحرؔ صاحب سولھویں پشت میں براہِ راست حضرت بابا گورو نانک دیوجی کے پوتے ہوتے ہیں۔ یعنی صوفیانہ فقیری اور امیری دونوں اُن کے خوُن میں ہیں۔

سحرؔ صاحب کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے ہی ایک اسکوُل میں ہوئی۔ اپنی سوانحِ عمری "یادوں کا جشن،، میں انھوں نے اُس زمانہ کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔ جماعت کے سبھی بچّے فرش پر بچھی ہوئی ایک دری پر بیٹھا کرتے تھے اور ان کے سامنے ماسٹر جی ایک کرسی پر۔ لیکن ماسٹر جی سحرؔ صاحب کو دیگر طُلبار کے ساتھ دریوں پر نہیں بٹھاتے تھے بلکہ اپنے برابر میں کرسی رکھ کر اُس پر بٹھاتے تھے۔ بعد میں جب اُن کے والدِ محترم کو اس بات کا عِلم ہُوا تو انھوں نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

اِس چھوٹے سے واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی نشو و نما کس ماحول میں ہوئی۔ لیکن کنور (شہزادہ) ہونے کے باوجُود حضرت بابا گوُرو نانک دیوجی سے ورثے میں جو صُوفیانہ فِطرت اور فقیری ملی وہ مزاج سے کبھی نہ گئی۔ آج بھی زندگی کی تمام تر آسائشیں اور اعلیٰ رُتبہ میسر ہونے پر بھی ان کا دِل ایک ایسا مُفلس ملنگ ہے جسے مادی دنیا سے کوئی لگاؤ نہیں۔

لاہور کے چیفس کالج اور گورنمنٹ کالج سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد سحرؔ صاحب ۱۹۳۳ء میں شوقیہ طور پر سرکاری ملازمت میں آگئے۔ بعد میں آئی۔ اے۔ ایس۔ کیا اور ۱۹۴۷ء تک دہلی اور پنجاب کے مُختلف اِضلاع میں ڈِپٹی کمشنر، سٹی مجسٹریٹ اور دیگر بڑے بڑے عُہدوں پر فائز رہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جہاں جہاں بھی تعیناتی ہُوئی وہاں نظم و نسق کی ایسی مضبُوط بنیاد ڈال کر آئے کہ لوگ آج تک یاد کرتے ہیں۔ جب کہ شاعر بدنام ہی اس بات پر ہیں کہ ان کی زندگی کا نظام درہم۔ برہم ہوتا ہے۔

تقسیمِ وطن کے وقت آپ کے خاندان کو اپنی جاگیریں اور آراضیات چھوڑ کر ترکِ وطن کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے کبھی کروڑوں روپے کے نقصان کا افسوس نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ اس

بات کا دُکھ مناتے رہے ہیں کہ مصلحت پرستی اور جنون خیزی میں کتنے دوست بچھڑ گئے۔ کتنے خاندان لُٹ گئے۔ کتنے دِل تقسیم ہو گئے۔ کتنی زندگیاں تباہ و برباد ہو گئیں

سحرؔ صاحب کہا کرتے ہیں کہ "دنیا کے تمام مذاہب اچھے ہیں۔ لیکن سب سے اچھا مذہب ہے انسان پرستی" یوں تو کہنے کو کتنے ہی لوگ ہوں گے جنہیں یہ زعم ہو گا کہ وہ انسان دوست ہیں۔ ممکن ہے اُنہیں ہر انسان سے محبت ہو۔ کسی سے رنجش نہ رکھتے ہوں۔ ہر مذہب کا احترام کرتے ہوں۔ لیکن پھر بھی ایک حدِ فاصل ایسی آ ہی جاتی ہے جسے عبور کرنے میں اُنہیں جھجھک محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ حد خواہ قومیت کی ہو، عقیدے کی ہو، یا فرقہ خاص کی۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے سماج میں ایسے کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آدرشوں کی خاطر تعصب اور بوسیدہ روایت کی ہر دیوار گرا دی ہو؟ دُکھ درد میں ڈوبے ہوئے انسانوں سے ہمدردی برتنا ایک بات ہے اور ان کے دکھ درد میں خود بھی سما جانا دُوسری۔ سحرؔ صاحب اس دور کی اُن چند ناقابلِ فراموش شخصیتوں میں سے ہیں جنہوں نے دُکھی اور سُکھی اور خاص طور سے دُکھی انسانوں سے عشق کیا ہے۔ اور اسی کو زندگی کا مقصد سمجھ لیا ہے۔

یہ باتیں پڑھ کر ممکن ہے آپ سمجھ بیٹھیں کہ سحرؔ صاحب مُلحد ہیں! بالکل نہیں۔ اگرچہ ان سے مِل کر ایسا لگتا ہے کہ وہ نہ سِکھ ہیں، نہ ہندو ہیں، نہ مسلمان ہیں، نہ عیسائی ہیں! لیکن وہ مُلحد قطعی نہیں ہیں! خُدائے واحد میں پُختہ یقین رکھتے ہیں۔ روز صبح شام گورُو گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتے ہیں۔ باقاعدگی سے گورُودوارہ میں حاضری دینے اور ماتھا ٹیکنے جاتے ہیں۔ حضرت باباگورُو نانک دیوجی کی تعلیمات سے عقیدت رکھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدمی اگر مذہب کو اُس آئینہ میں دیکھے جس پر تنگ نظری کی دھول نہ جمی ہو تو وہ مذہب کے جتنا قریب آئے گا دنیا میں بسنے والے ہر انسان سے قریب تر ہوتا جائے گا۔

پہلی بار سحرؔ صاحب کو میں نے لال قلعہ کے مشاعرہ میں دیکھا اور سُنا۔ پہلی ملاقات اُن کے آفس دہلی آٹو موبائلز میں ہوئی۔ جب میں ان کا شاگرد بننے کی غرض سے اُن کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ یہ واقعہ ۱۹۷۳ء کا ہے۔ میں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسے اور سوال کیا۔

"کتنی تعلیم حاصل کی ہے؟" میں نے جواب دِیا "نویں جماعت تک"

بولے "اُردو جانتے ہو؟" میں نے کہا "نہیں۔ مگر سیکھ لُوں گا"

وہ پھر مُسکرائے۔ اِس مرتبہ کمرہ میں موجود دِیگر حضرات بھی ہنس پڑے۔

"بیٹے تم زیادہ پڑھے لکھے بھی نہیں ہو۔ اُردو نہیں جانتے، عمر بھی تیرہ چودہ برس سے زیادہ نہیں! بتاؤ شاعری کیا کرو گے؟" ان کا سوال تھا۔

میں بے حد نروس ہو گیا۔ میں نے ہمت سمیٹ کر کہا "جناب میں شعر تو کہہ لیتا ہوں اور دیوناگری میں لکھتا ہوں۔ آپ کی سرپرستی ہو گی تو اُردو بھی سیکھ لُوں گا۔"

میرا جواب سُن کر وہ کچھ مطمئن سے نظر آئے۔ بولے "بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد تمہارے شعر سُنتے ہیں۔" میں وہیں بیٹھ گیا۔

اب ذرا ہوش آیا اور گھبراہٹ کو قابو میں کیا تو دیکھا کہ کمرہ طرح طرح کے لوگوں سے بھرا ہُوا ہے۔ کچھ تو حلیہ سے شاعر لگ رہے تھے۔ ایک دو بھاری بھر کم پہلوان تھے اور گھڑی گھڑی کُشتی کے داؤ۔پیچ کا ذکر کئے جا رہے تھے۔ پہلوانوں کے برابر میں جو صاحب بیٹھے تھے اُن کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ اُن میں سے ایک تیتر بازوں کی کُل ہند انجمن کا جنرل سیکریٹری ہے دوسرا بٹیر بازوں کی کُل ہند انجمن کا نائب صدر ہے۔ تیسرا مرغ بازوں کی انجمن کا کارکن ہے۔ چوتھا پتنگ بازوں کی کُل ہند انجمن کا خازن ہے۔ پانچواں کسی شطرنج کی سوسائٹی کا صدر ہے۔ چھٹا کبوتر بازوں کی انجمن کا سیکریٹری ہے۔ اسی طرح بھائی چارہ کمیٹی، قومی ایکتا کمیٹی، کھیل کود کمیٹی، مشاعرہ کمیٹی، محلہ سدھار کمیٹی وغیرہ وغیرہ کے اراکین اپنی اپنی روداد سمیت اس لئے موجود تھے کہ سحر صاحب تمام انجمنوں میں کسی کے صدر، کسی کے سرپرست کسی کے مشیرِ اعلیٰ ہیں۔ دو۔ ایک نوجوان ایسے بھی تھے جن کے ہاتھوں میں اسناد کی موٹی۔ موٹی فائلیں تھیں اور کہیں نوکری کے لئے سحر صاحب کے پاس سفارشی خط لینے آئے تھے۔ ایک۔ دو حضرات ایسے بھی تھے جو محض مالی امداد کی غرض سے آئے تھے اور خاموش بیٹھے تھے (خاموش شاید اس لئے کہ ان کی بات سب سے پہلے سُن لی گئی تھی اور حسبِ طلب امداد کے بعد چائے پینے کے لئے روکا گیا تھا)

مجھے یہ ماحول بڑا عجیب سا لگا۔ ہر شخص ان سے اس طرح بات کر رہا تھا گو یا وہ دفتر میں صرف اُسی کے واسطے آئے ہوں۔ بہر حال میری باری آئی میں نے چند شعر سُنائے۔ مجھے احساس ہوا کہ انہیں یہ یقین نہیں آیا کہ یہ شعر میں نے کہے ہوں گے۔ اسی وقت مجھے ایک مصرعۂ طرح دیا اور کہا کہ اس پر شعر کہو۔ میں کمرہ سے باہر چلا گیا اور آدھ گھنٹے کے بعد واپس آکر تازہ غزل سُنا دی۔ سحر صاحب غزل سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ملتے رہا کرو۔

استاد شاگرد کا رشتہ یوں تو باپ بیٹے کا ہی رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن انھوں نے سچ مچ مجھے باپ کی شفقت عطا کی ہے جس سے میں محروم تھا۔ نویں جماعت تک ادھوری تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر کے ایم۔ اے۔ کیا اور اپنی پسند کی ملازمت تک پہونچ گیا اُنہیں کی بدولت!

میں تیرہ برس دہلی میں ان کے ساتھ رہا۔ ہر صبح لوگ اپنے اپنے کام لے کر ان کی کوٹھی پر آنا شروع ہو جاتے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی حریصانہ فطرت کی وجہ سے سحر صاحب کی مقبولیت برداشت نہیں کر پاتے اور پیٹھ پیچھے چہ مہ گوئیاں کرتے ہیں۔ لیکن وقتِ ضرورت انہیں کے پاس دوڑے چلے آتے ہیں۔ سحر صاحب سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان سے محبت سے پیش آتے ہیں۔ ان کی بات دھیان سے سنتے ہیں۔ اور اپنی موٹر کار میں بٹھا کر ان کی سفارش کے لئے چل پڑتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں میرا کام ہے لوگوں کی خدمت کرنا۔ وہ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ پریشانی میں ہوتے ہیں۔ اس لئے میرے پاس چلے آتے ہیں۔ یہ تو خدا کا کرم ہے کہ لوگ مجھ پر اتنا بھروسہ کرتے ہیں۔ شاید اللہ میاں نے مجھے ایک ذریعہ بنا کر انہیں میرے پاس بھیجا ہے ورنہ میری حیثیت ہی کیا ہے جو کسی کے کام آسکوں!

بطور قلم کار سحر صاحب برصغیر ہند و پاک کے ممتاز شاعر ہیں۔ ان کے متعلق میں کچھ لکھنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں اس قابل نہیں۔ پھر بھی ان کے ادبی سفر کا ایک پہلو ایسا ہے جو ان کی شاعری اور خود ان کے متعلق سوچنے پر ہر کسی کو مجبور

کرتا ہے۔ وہ ہے ان کا تنہا چلنا اور مقبولیت کی صفِ اوّل میں اعلیٰ مقبولیت پر آ کھڑے ہونا۔
میں اس جملے کی وضاحت بھی کرنا چاہوں گا۔ آج کل ہوتا یہ ہے کہ فلاں شاعر بڑا شاعر ہے
کیونکہ ایک مخصوص نظریہ رکھنے والا گروہ یا جریدہ یا نقّاد اسے بڑا شاعر کہتا ہے۔ وہ خود
بھی عمر بھر گروپ بازی کی اسی جوڑ۔ توڑ میں لگا رہتا ہے کہ اُسے کسی طرح بڑا ادیب اور
شاعر تسلیم کر لیا جائے۔

سحرؔ صاحب نے کسی "اِزم" کی شاعری نہیں کی۔ کسی گروہ کی حمایت حاصل نہیں
کی۔ پھر بھی وہ اردو زبان و ادب کا ایک مضبوط ستون ہیں۔ عوام و خواص میں انہیں جو
مقبولیت حاصل ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا
ہوں کہ وہ خود کبھی شہرت کے خواہش مند نہیں رہے۔ انھوں نے خود نمائی سے جس قدر
دامن بچایا ان کی قدر و منزلت میں اتنا ہی اضافہ ہوا ہے۔ اور وہ ممتاز سے ممتاز تر ہوتے
گئے۔ کامیابی کی سچّی منزل دراصل یہی ہے۔ اور یہ کسی کسی کے حصّہ میں آتی ہے۔

کے۔ایل۔نارنگ ساقی

کنور مہندر سنگھ بیدی کی شاعری اور محاورات

مجھے یہ اعتراف کرنے میں قطعی تامل نہیں ہے کہ نہ تو میں شاعر ہوں اور نہ ہی نثر نگار۔ اس لئے کاروباری خطوط کے علاوہ کبھی کچھ لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ لیکن کچھ دوستوں نے اصرار کیا کہ جشنِ کنور مہندر سنگھ بیدی کمیٹی کے آرگنائزنگ سیکرٹری ہونے کے ناطے مجھے کچھ ضرور لکھنا چاہیئے۔ کافی غور خوض کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ایک موضوع ایسا ہے جسے ابھی تک کسی نے نہیں چھوا۔ اور وہ ہے بیدی صاحب کی شاعری میں محاوروں کا استعمال۔

استاد داغ مرحوم نے اپنے شاگردوں کو درست مشورہ دیا تھا کہ بے ضرورت محاورہ کو کبھی شعر میں مت باندھو۔ محاوروں کو پکڑ پکڑ کر مت لاؤ۔ ہاں محاورے شعر میں بے ساختہ آجائیں تو بات بنتی ہے

دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ شاعر نے کس قدر محاورات کو ہضم کیا ہے۔ یہ روگ اہلِ زبان وفن کے ہی بس کا ہے ہر ایرے غیرے کا نہیں۔ جو غلط طریقہ سے محاورات کی دہلیز پر چڑھا وہ سر کے بل ایسا گرا کہ کبھی نہ اُٹھا۔ قدما میں زبان پر مکمل عبور حاصل کرنے کا ایک یہ بھی امتحان ہوتا تھا کہ وہ اشعار میں محاورات کو آورد میں استعمال کرتے ہے یا آمد میں۔

انشاؔ، ذوقؔ، داغؔ، جوشؔ ملسیانی، بیخودؔ، انیسؔ، صفیؔ، عالمؔ لکھنوی، عزیزؔ لکھنوی اور بہت سے ایسے حضرات ہیں جنھوں نے محاورات سے اردو شاعری کی انگوٹھی میں نگینے کا کام لیا ہے۔ مثلاً

؎ رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو (ذوقؔ)

؎ خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا (داغؔ)

؎ سوالِ وصل پہ اتنا بگڑنا واہ کیا کہنا
ذرا سی بات میں یوں دفعتاً تیور بدل جانا (عالمؔ لکھنوی)

؎ اے مستِ رعونت یہ جوانی نہ رہے گی
جس حسن پہ نازاں ہے وہ پر تول رہا ہے (جوشؔ ملسیانی)

؎ انتظارِ مرگ میں پیری کفن بردوش ہے
کوئی دم میں اب چراغِ زندگی خاموش ہے (صفیؔ لکھنوی)

؎ کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں (انشاؔ)

فی زمانہ بہت کم شاعر ایسے ہیں جو صاحبِ فن ہونے کے ساتھ اہلِ زبان بھی ہیں اور زبان و بیان پر قدرت رکھتے ہیں۔ اس معاملے میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کا نامِ گرامی باعثِ فخر ہے۔ کنور صاحب کے کلام میں جہاں سلاست، سادگی اور زبان و بیان کی دیگر خوبیاں پائی جاتی ہیں وہاں محاوروں کا برمحل استعمال قاری کو متاثر اور متوجہ کرتا ہے۔ چند محاورات کو بیدی صاحب کے اشعار کے روپ میں دیکھئے اور دو آتشہ کا لطف اٹھائیے۔

؎ بے وفا مجھ کو سوچ کر کہنا   منہ سے نکلی تو پھر پرائی ہے

ملاحظہ ہو ایک حقیقت کو کس خوبی سے محاورے میں نبھایا ہے!

؎ ناامیدوں کے دل میں آس کہاں؟ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

واقعہ یہ ہے کہ جس انسان نے امید کا دامن چھوڑ دیا ہو اس کے سینے میں آس جنم نہیں لے سکتی۔

اب ملاحظہ فرمائیں چند اشعار۔

؎ ہم کو دیکھ کے واعظ کو یہی کہتے ہیں
ساون کا جو اندھا ہو ہرا دیکھتا ہے

؎ حسن پھر محوِ خود نمائی ہے ٹل نہیں سکتی جس کی آئی ہے

؎ چکائے جائیں گے محشر میں بدلے سب جفاؤں کے
حساب دوستاں در دل میری جاں اس کو کہتے ہیں

کیا خوب تاکید کی ہے۔

؎ ابھی ہے گوش بر آواز دنیا ابھی بتیس دانتوں میں زباں رکھ

؎ چکائے جائیں گے محشر میں بدلے سحر دل میں حساب دوستاں رکھ

؎ کہہ چکے ہیں یہ قول اہلِ خرد آج کے کام کو توکل پہ نہ چھوڑ

؎ دیکھے ہیں سب شیخ و برہمن نام بڑا اور درشن چھوٹے

؎ عقل نے اکثر دل کو کوسا ناچ نہ جانے ٹیڑھا آنگن

؎ تن کے اجلے من کے میلے یہ ہیں واعظ جی کے لچھن

ع پھر ناصح سمجھانے آئے　　پھر چھیڑا بے وقت کا راگ

ع تن من تم پر وار دئے ہیں　　اس کا سب کچھ جس کا تن من

اس حقیقت سے کون انکار کرے گا کہ یہ خود غرض دنیا کس کی ہوتی ہے ؟

ع اس دنیا میں جس کو دیکھو　　اپنی ڈفلی اپنا راگ

ایک سچا عاشق اپنے محبوب پر بغیر سوچے سمجھے سب کچھ نچھاور کر دیتا ہے۔ اس مفہوم کو اس شعر میں ملاحظہ فرمائیے۔

ع تن من تم پر وار دیئے ہیں ہم نے دیکھا آؤ نہ تاؤ

ع ان آنسوؤں کو گلہ نہ سمجھو　　یہ دل سے تنگ آکر گر رہے ہیں
اسی نے رسوا کیا ہے ہر سُو　　اسی نے مٹی خراب کی ہے

ع ذرا ذرا سی بات میں وہ جانِ جاں بدل گیا
کبھی تو بات کاٹ دی، کبھی زبان بدل گیا

سحرؔ صاحب کے ان محاورات کے استعمال کی روشنی میں یہ باآسانی کہا جاسکتا ہے کہ وہ زبان اردو پر قدرت ہی نہیں رکھتے بلکہ نگاہ عاشق کی طرح دیکھتے ہیں۔ بھوکوں کی طرح کھاتے ہیں اور پیاسوں کی طرح پیتے ہیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

نظمیں

جوشؔ ملیح آبادی
۱۸-۱۰-۴۸

دعوتِ نظر

میں اک مدت سے ہوں نظارگیٔ ظاہر و باطن
جدھر کہتا ہوں میں اُس سمت اے اہلِ نظر دیکھو
نہ صحنِ بوستاں میں لالہ و گل پر نظر ڈالو
نہ قصرِ بحر میں تابانیٔ لعل و گہر دیکھو
نہ اَوجِ کوہ و موجِ آب کا نظارہ فرماؤ
نہ روئے خشک و تر دیکھو نہ سوئے بحر و بر دیکھو
نہ گیتی پر ہوائے دامنِ سرِ رواں ڈھونڈو
نہ گردوں پر ادائے خندۂ نجمِ سحر دیکھو
نہ ہیجانِ نظارہ میں ستاروں کی طرف لپکو
نہ ابرِ پارہ پارہ میں تب و تابِ قمر دیکھو
اگر نظارۂ خیرِ مجسم کی تمنا ہے
مہندر سنگھ[1] کو اے ناظرانِ دیدہ ور دیکھو

---

[1] کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

گوپی ناتھ امن (مرحوم) (غیر مطبوعہ)

کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب المتخلص بہ سحر بہ القابہ

در صفت توشیح

ک	کنور صاحب مہندر سنگھ بیدی	رموز عارفانہ کے ہیں بھیدی
ں	نہیں ہے اُن کے دل میں بغض و کینہ	مثالِ آئینہ ہے اُن کا سینہ
و	وہ اک تصویر ہیں صدق و صفا کی	نہیں ہے جن میں آلائش ریا کی
ر	رموز عارفانہ کے ہیں ماہر	کہ ہیں اوصافِ مرشدان سے ظاہر
م	مجھے حاصل رہی ہے اُن سے قربت	وہ قربت ہو گئی وجہ عقیدت
ہ	ہر اک خورد و کلاں مداح اُن کا	ہر اک پیر و جواں مداح ان کا
ن	نسیم روح افزا اُن کو کہئے	ہوائے نکہت آرا ان کو کہئے
د	در اُن کا باز ہے بہر سوالی	نہ آیا کوئی اُن کے در سے خالی
ر	رفیق اہل حاجت ان کو کہئے	پرستارِ محبّت اُن کو کہئے
س	سراپا حلم ہیں یہ ہے حقیقت	شبیہ اُنس و تصویر محبّت
ن	نظر کو اُن کی حاصل ہے بلندی	ہے ان کا جزو فطرت دردمندی
گ	گورو نانک کی نسل پاک سے ہیں	ہزاروں لاکھوں اُن کو پوجتے ہیں
ہ	ہر اک وصف مثالی ان کو حاصل	سراسر باکمالی اُن کو حاصل
ب	برائے نام بھی نفرت نہیں ہے	کہ دل میں جز بہ الفت کچھ نہیں ہے
ے	یہ اُن سے ملنے والے جانتے ہیں	ہر اک کی قدر وہ پہچانتے ہیں
د	دیارِ ہند میں ہے نام ان کا	کہ مفلس پروری ہے کام ان کا
ی	یم جود و کرم بہتا ہے دائم	خیال احباب کا رہتا ہے دائم
س	سحر کی تازگی ہے ان میں موجود	کثافت دور اُن سے بلکہ مفقود
ح	حسین ہیں اب بھی چہرہ ہے چمکتا	ہے پیشانی پہ نورِ حق دمکتا
ر	رہیں یارب صد و سی سال زندہ	فزوں ہو رتبہ و اقبال ان کا

قتیل شفائی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

ہجومِ رنگ و بو کے حُسنِ معتبر کا نام ہے
کنور مہندر سنگھ اک نئی سحر کا نام ہے

یہ نام وہ ہے جس کے ساتھ چل رہی ہے روشنی
یہ نام آفتاب کا ہے یہ قمر کا نام ہے

ہر اک شریف آدمی کے دل پہ ہے لکھا ہوا
یہ ہر حسین آدمی کے ہم سفر کا نام ہے

لطافتوں کا ہاتھ جس کے سر پہ آج تک رہا
یہ اُس ادب کا نام ہے یہ اُس ہنر کا نام ہے

کبھی کبھی تو یوُں لگے ہم اُس کا نام جب سُنیں
یہ دوستی کی منزلوں کے راہبر کا نام ہے

اب اُس کا نام بھی ہے سربلند اُس زمین پر
جہاں ہے نام جوشؔ کا جہاں جگرؔ کا نام ہے

قتیلؔ اُس کا نام لیں تو راہرو پکار اُٹھیں
کہ یہ تو ایک چھاؤں بانٹتے شجر کا نام ہے

عزیز وارثی

نظم

جشن کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

میں آج مست ہوں یارو مرے قریب آؤ
صراحی جام و سبو شیشہ سب اٹھا لاؤ
سرور و کیف کے عالم میں رقص فرماؤ
جو پڑھ رہا ہوں یہی شعر تم بھی دہراؤ

یہ جشن نانک و چشتی کے گلعذار کا ہے
یہ جشن اصل میں تہذیبِ پائیدار کا ہے

جو رام و کرشن کا شیدا یہ جشن اس کا ہے
جسے رسول کا سودا یہ جشن اس کا ہے
جسے علی پہ بھروسا یہ جشن اس کا ہے
جو نام لیوا ہے سب کا یہ جشن اس کا ہے

جسے چمن کے ہر اک پھول سے محبّت ہے
یہ جشن اُس کا ہے جو صاحبِ بصیرت ہے

جو اہلِ فن کا پرستار یہ اُسی کا ہے جشن
جو فہم و فکر کا مختار یہ اُسی کا ہے جشن
جو نکتہ سنج و قلمکار یہ اُسی کا ہے جشن
جو ہر ادا سے طرحدار یہ اُسی کا ہے جشن

جسے کلام پہ قدرت جسے سخن پہ عبور
جسے ادب سے محبّت جسے غزل کا شعور

ادب نواز ادب دوست اور ادب پرور
جو شاد اہلِ خرد ہیں تو خوش ہیں اہلِ نظر
منا رہے ہیں جو دِلّی میں آج جشنِ سحرؔ
اُنھیں پسند ہے گویا نوائے جوشؔ و جگرؔ

اگر کنور کا زمانے میں نام زندہ ہے
تو اردو زندہ ہے اردو کلام زندہ ہے

مخمور سعیدی

کنور صاحب کی پروازِ خیال کے ساتھ

خزاں کی تیز تر آندھی، ہزار بار چلے
بگولے رقص کریں، موجۂ غبار چلے
کہ سیلِ رنگ، فضائے چمن نکھار چلے

"چلے سموم، کہ اب بادِ نو بہار چلے
گزارنے تھے جو دو دن وہ ہم گزار چلے"

اُٹھا ہم ابسوں سے، ضبطِ جنوں کا بار کہاں
خطر پسند طبیعت پہ اختیار کہاں
سفر میں سمتِ مسافت کا اعتبار کہاں

"ہم اہلِ دل ہیں، ہمیں تابِ انتظار کہاں
جو کوئے یار نہ پایا تو سوئے دار چلے"

نہ غم سے دور، نہ بیگانۂ خوشی ہم ہیں
رہینِ کشمکشِ مرگ و زندگی ہم ہیں
شرابِ ترک و طلب یعنی آج بھی ہم ہیں
"وہی ہے راہ، وہی راہبر، وہی ہم ہیں
ہزار بار رُکے ہیں، ہزار بار چلے"

نہ لب پہ قتلِ تمنّا کا حرفِ ماتم ہے
نہ آنکھ، دل کی تباہی پہ اپنی پرنم ہے
ہیں کشتگانِ محبّت میں ہم، یہ کیا کم ہے
"گئی جو جان سحرؔ عشق میں تو کیا غم ہے
ہزار شکر کہ ہم عاقبت سنوار چلے"

عزیز وارثی

قطعہ

ہر اک قدم جس کا والہانہ ہر اک ادا جس کی شاعرانہ
جو ہے نظر اُس کی عاشقانہ تو ہر نفس اس کا مشفقانہ
خدائے برتر نے ایسی بے مثل خوبیاں اُس کو بخش دی ہیں
جہاں بھی چاہا عزیزؔ اُس نے بنا دیا اک نگار خانہ

راہی شہابی

گلہائے عقیدت

جو دور گذر گیا جو تہذیب مٹ گئی جو روایتیں اور شرافتیں افسانۂ ماضی بن گئیں ان کی جیتی جاگتی تصویر کا نام ہے مہندر سنگھ بیدی، بقولِ جوشؔ ؎

اگر نظّارۂ خیر مجسّم کی تمنّا ہو
مہندر سنگھ کو اے ناظرانِ دیدہ ور دیکھو

ایک چوتھائی صدی قبل کسی مشاعرے میں پہلی بار کنور صاحب سے شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا، اس دن سے آج تک کنور صاحب کی شفقتِ بزرگانہ میں برابر اضافہ ہوتا رہا کبھی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

اپنا نذرانۂ عقیدت چند اشعار کی شکل میں پیش کر رہا ہوں

چشمۂ لطف و کرم پیکرِ ایثار سحرؔ
حاملِ عظمت و تابانیٔ کردار سحرؔ
نانکؔ و گوتمؔ و چشتیؔ کا پرستار سحرؔ
بندۂ بارگہِ احمدِؐ مختار سحرؔ
مثلِ خورشید درخشندہ و تابندہ ہے
عہدِ ماضی کی شرافت کا نمائندہ ہے

جانِ ہر محفل و عنوانِ ہر افسانہ سحرؔ
شمعِ علم و سخن و شعر کا پروانہ سحرؔ
مہر و اخلاص کا شیدائی و دیوانہ سحرؔ
پیرِ رندانِ ادب ساقیِ میخانہ سحرؔ

ظلمتِ شام میں تنویرِ سحرؔ بن کے رہے
تاجِ اردوئے معلّیٰ میں گُہر بن کے رہے

خدمتِ خلق میں مصروف ہے ہر شب ہر دن
اُس کی خدمت کا شرافت کا بدل ناممکن
اُس نے یہ بات تو ذاکرؔ سے کہی تھی لیکن
آج میں اس سے یہ کہتا ہوں کہ میرے محسن

سکھ نہ عیسائی نہ ہندو نہ مسلمان ہے تو!
تیرا کردار یہ کہتا ہے کہ انسان ہے تو!

راز لائل پوری

مبارک جشنِ الماسی کتاب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

چل رہی ہے جو آج پروائی
کس قدر دِل کُشا خبر لائی

جشنِ الماسیٔ سحر ہے آج
دیدہ ور، مرکزِ نظر ہے آج

فرشِ خاکی پہ عرشِ جاہ ہیں آپ
راندۂ دہر کی پناہ ہیں آپ

شہرہ آفاق آپ کی ہے سخا
آپ ہیں دست گیر عجزِ گدا

لاکھوں خوانِ کرم پہ پلتے ہیں
لاکھوں کے کاروبار چلتے ہیں

بے گماں ہیں یہ حاتم ثانی
یا کرن ویر سے ہیں اک دانی

شعر و شاعر نواز بھی ہیں آپ
نغمہ خواں، نغمہ ساز بھی ہیں آپ

واحد و بے نظیر و یکتا ہیں
فنِ شعر و سخن میں پختہ ہیں

ناز کرتی ہے شاعری ان پر
آج ان کا کوئی نہیں ہمسر

حق میں ان کے دُعائے خیر کرو
راز انہیں جشن کی مبارک دو

دلیپ بادلؔ

عالی جاہ، سحؔر اردو کے نام

بیدی ایک انسان
کہ جس کے قلب و نظر میں   پیار بھرا طوفان
بیدی ایک کتاب
کہ جس کا ہر اک پتّا   جیون کی رس کھان
بیدی اک فن کار
کہ جس کے ہر مصرعے میں   پیار بھری مُسکان
بیدی ایک گُلاب
"اسے"، قلی قطب شاہ کی ایک چہیتی   "اسے"، کہ جس کی ہر پتی میں
'پیاری'، جو بہت ہی خوب صورت تھی   سہاگ متی کی شان
بیدی اِک ایوان
کہ جس کے ہر گوشے میں   سچّا دین، ایمان۔
بیدی اک مینار
کہ جس کی کرنوں میں ہے   پیار و وفا کی شان
بیدی ایک گرنتھ
کہ جس کی بانی میں ہے   انسان کا سمّان

متین امروہوی

قلمی چہرا

گلستانِ گورونانک میں آج ایسی بہار آئی
نسیمِ صبح یہ کہتی ہوئی خود بیقرار آئی

خوشی سے عندلیبانِ چمن اب نغمہ زن ہوں گے
بہت مسرور یہ سُن کر خبر اہلِ وطن ہوں گے

ستارہ اور اک پنجاب کی قسمت کا چمکا ہے
مہندر سنگھ بیدی نام کا اک غنچہ چٹکا ہے

ہے اس کا نام "نازنخی" کتنا بی اس کا چہرا ہے
ہے اس کے سر پہ پگڑی رُخ پہ سرداری کا سہرا ہے

گھٹا گھر کے برستی ہے جب اس کے کیس کھُلتے ہیں
گلوں سے ریشمی رخسار اس کے ملتے جلتے ہیں

ابھی سے ہاتھ میں اس کے قلم اس کا کھلونا ہے
ادب ہی اوڑھنا اس کا ادب کا بچھونا ہے

تبسم سے لبوں پہ پھول اس کے کھلتے رہتے ہیں
صنم اس سے گلے ہر ہر قدم پہ ملتے رہتے ہیں

عمل یہ قومی یکجہتی پہ بھی کر کے دکھائے گا!
جبینِ شوق یہ اپنی ہر اک در پہ جھکائے گا!

جہاں میں غیر معمولی رہے گی شخصیت اس کی
صحیح تعلیم ہوگی اور اعلیٰ تربیت اس کی

زمانہ اس کی فیاضی سے پورا فیض پائے گا
امیروں کے غریبوں کے یہ سب کے کام آئے گا

نظر آتا ہے اس کے آج، یہ کل کے فسانے میں
یہ اپنی ذات سے خود انجمن ہوگا زمانے میں

بڑے شاعر کی اک پہچان ہوگی شاعری اس کی
کہ ہر بزمِ سخن کی جان ہوگی شاعری اس کی

کرے گا فیصلے ہو کر یہ منصف جب دیانت سے
اسی سے عالی جاہ اس کو کہیں گے لوگ الفت سے

زمانہ تو اسے کیا آفتِ جاں سے ڈرائے گا
گردشِ دوراں کو بھی یہ تو آنکھیں دکھائے گا

رہے گا پیرِ میخانہ یہ اپنی ذات عالی سے
پئے گا جامِ جم سے یہ کبھی جامِ سفالی سے

دقیقہ اس کے پینے کا نہ رکھنا تو کوئی باقی
بقدرِ ظرف یہ پیتا رہے گا عمر بھر ساقی